آپ بیتی مرزا غالب

تحقیق و ترتیب

خالد ندیم

نشریات لاہور

ڈاکٹر تحسین فراقی

کے نام

ترتیب

حرفِ ناشر

یہ دنیانور و ظلمت کا آمیزہ ہے۔ کہیں علم و حکمت اور فلسفہ و شعر کی کرنیں اہلِ دنیا پر جلوہ فگن ہیں تو کہیں ظلم و بربریت اور جہالت و حماقت کی سیاہی حکمران ہے؛ گویا صبح، دوپہر، سہ پہر، شام اور پھر رات کا پہیا گھومتا رہتا ہے۔ اہلِ دنیا فطرت کی اس کاری گری کو ایک معمول سمجھتے ہیں، البتہ گاہے اس معمول میں ایسا فرق رونما ہو جاتا ہے کہ اہلِ زمین چونک جاتے ہیں اور نعرہ ہائے تحسین ان کے لبوں پر مچل اٹھتا ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی ہستی کا وُرُود بھی ایک ایسا ہی امر تھا، جس نے اپنی ندرتِ خیال سے دلوں کو مسخر اور ارواح کو بالیدگی عطا کر دی۔

مرزا غالب ایک طرف معلمِ تہذیب، آفاقی شاعر، بے باک نقاد اور فلسفی ہے تو دوسری جانب ایک زندہ دل شخصیت اور شگفتہ اسلوب کا مالک بھی۔ مادّی زندگی کی مجبوریاں اسے خوشامد پر اکساتی رہیں، چنانچہ اسے لال قلعے کے بادشاہ اور نام نہاد نوابین کے ساتھ ساتھ انگریز سامراج اور ان کے گماشتوں تک کی قصیدہ گوئی کرنا پڑی۔ بہر حال، مطالعۂ غالب سے ایک عمومی تاثر یہ اُبھرتا ہے کہ ایک باغی انسان دم توڑتی ہوئی سلطنت میں اپنا بانکپن قائم رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے، چنانچہ ڈاکٹر خالد ندیم کی تالیف **آپ بیتی مرزا غالب** ایک شاعر کی داستانِ حیات ہی نہیں، بلکہ آخری ہچکی لیتی ہوئی مسلم تہذیب اور سلطنت کا منظر نامہ بھی ہے۔

برصغیر میں شاعری کا فن ایک مثلث کے طور پر نظر آتا ہے، یعنی میر، غالب اور اقبال۔ میر اگر شاعری کی ابتدا ہے تو اقبال فکر و فن کی انتہا۔ غالب نہ شہر آشوب بیان کرتا ہے اور نہ ہی

ملی تہذیب کی تباہی کا نوحہ بلند کرتا ہے، بلکہ وہ فرد کی جذباتی اور نفسیاتی وارداتوں اور گرہوں کو کھولتا ہے، 'مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'۔ یہ عجیب قصہ ہے کہ غالب کے معاشقوں، بادہ نوشی اور قمار بازی سے نفرت محسوس نہیں ہوتی، بلکہ ایک طرح اس کی ذات سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ غالب کا فن اُس بلندی پر ہے کہ اس کی شخصی کمزوریوں سے صرفِ نظر کرنا پڑتا ہے اور ایسا غالب کے زمانے میں بھی تھا۔ غالب کے چاہنے والوں میں مولانا صہبائی اور مومن خاں مومن جیسے اصحاب بھی تھے اور یہ ایسے اصحاب تھے کہ 'دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں'۔

غالب کی شاعری کا جدید اسلوب جہاں اس کی مقبولیت کی بنیاد بنا، وہیں غالب کی مخالفت کا سبب بھی۔ غالب نے زبان وبیان کے مروّجہ پیمانوں کو چھوڑ کر اپنی طرز اور روِش اختیار کی، جسے اہلِ ہند نے بتدریج بادِ نسیم سمجھ کر وصول کیا۔

مرزا غالب کی وفات کے پانچ چھ دہائیوں کے بعد **بانگِ درا** کے دیباچے میں شیخ عبدالقادر نے اقبال کے بارے میں لکھا تھا:

> کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہو گا، جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادبِ اردو کے فروغ کا باعث ہوں گے۔

کوئی بھی قوم اپنی تاریخ، تہذیب اور ثقافت سے کنارہ کش ہو کر آگے نہیں بڑھ سکتی، لہٰذا نوجوانوں کو اپنے ورثے سے آگاہ کیا جانا ضروری ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا، جس نے ڈاکٹر خالد ندیم کو مہمیز دی اور انھوں نے برصغیر کے تہذیبی وفکری زعما کی آپ بیتیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلے میں وہ **شبلی کی آپ بیتی** اور **آپ بیتی علامہ اقبال** پیش کر چکے ہیں۔ یہ ان کی محبت کا اظہار ہے کہ زیرِ نظر تالیف کی اشاعت کے لیے بھی انھوں نے نشریات کو منتخب کیا۔

محمد رفیع الدین حجازی

یکم ستمبر 2018ء

مقدمہ

عظیم شخصیات کا یہ حق تو ہے کہ ان کی ایک ایک ساعت، ایک ایک ادا اور ایک ایک لفظ کو محفوظ کیا جائے اور یہ بھی ان کا حق ہے کہ ان سے متعلق تحقیقی و تنقیدی سرگرمیاں جاری رہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ایک المیہ بھی ہے کہ ہر نابغہ پر لکھنے میں کہ و مہ کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اس سلسلے میں زیادہ دُور بینی کی ضرورت نہیں، ہماری ادبی تاریخ میں اقبال پر لکھی جانے والی جملہ تصانیف و تالیفات و مرتبات ایک طرف قابلِ رشک ہیں اور دوسری جانب عبرت ناک۔ جہاں نہایت اعلیٰ میعار کی حامل کاوِشیں منصۂ شہود پر آئی ہیں، وہیں ایک بڑا تحریری ذخیرہ دریابُرد ہونے کے لائق ہے۔ اسی ذیل میں سرسید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی اور ابوالکلام آزاد پر لکھے گئے ادب کو دیکھا جا سکتا ہے۔

مرزا غالب کے ساتھ بھی یہی کچھ ہُوا ہے۔ ہماری ملّی تاریخ بالعموم اسی رویے سے عبارت رہی ہے، بالخصوص مسلمانانِ پاک و ہند میں اکابر پر لکھنے والے ہمیشہ دو متضاد راستوں پر گامزن رہے ہیں، یعنی اعتراف یا اعتراض۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے ہاں یہ دونوں الفاظ اپنے معانی کی انتہاؤں پر پہنچے ہوئے ہیں۔ معترف قصیدہ خواں بن جاتا ہے اور معترض تنقیص پر اُتر آتا ہے۔

ہم اپنی معلومات پر غیر اعلانیہ فخر کرتے ہیں، لیکن بالعموم ہماری معلومات حقائق کے بجاے مفروضوں پر استوار ہوتی ہے اور چشم کشائی تب ہوتی ہے، جب اس موضوع پر کام کا آغاز کیا جائے۔ غالب کی شاعرانہ عظمت اور ان کی دِل فریب اور متنوع شخصیت پر مطبوعات کا شمار مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی زندگی کے ہر ہر پہلو اور ان کے ہر ہر ادبی و علمی نکتے پر سیر

حاصل گفتگو ہو چکی ہے، لیکن سوانحِ غالب کا جائزہ لیا جاتا ہے تو مولانا حالی (**یادگارِ غالب** 1897ء)، مولانا غلام رسول مہر (**غالب** 1936ء)، شیخ محمد اکرام (**حیاتِ غالب** 1957ء) اور جنابِ مالک رام (**ذکرِ غالب** 1975ء) کے علاوہ کسی مستند سوانح نگار کا پتا نہیں چلتا۔ اگرچہ غالب کی مختصر سوانح عمریوں کی تعداد ڈیڑھ درجن سے زائد ہے، لیکن اپنی غیر سنجیدگی یا غیر استنادی حیثیت کے باعث وہ قابلِ اعتنا نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ حیاتِ غالب کے اہم ترین واقعات اور معرکوں پر مختلف کتابیں دستیاب ہیں، جن میں سے اکثر نہایت اعلیٰ تحقیقی معیار کی حامل ہیں، لیکن چونکہ وہ زندگی کے صرف ایک گوشے کو منور کرتی ہیں، اس لیے انھیں باقاعدہ سوانح عمری قرار نہیں دیا جا سکتا؛ چنانچہ سوانحِ غالب سے متعلق محض مذکورہ چار تصانیف پر ہی اکتفا کی جا سکتی ہے۔

معلوم نہیں، ہمارے ہاں شخصیات کی مکمل تصویر کشی کیوں نہیں کی جاتی۔ ہم ہمیشہ شخصیت کے صرف ایک ہی پہلو پر زور دیتے ہیں اور اگر کوئی دوسرے پہلو پر توجہ دِلائے بھی تو ہم اسے قبول نہیں کر پاتے۔ اس میں ہمارے تعصبات کو دخل ہے یا ہماری فطرت اور مزاج کو، لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم کسی شخصیت کو انسانی سطح پر دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ایک ہی شخصیت پر لکھنے والوں کے ہاں اس قدر تضاد بیانی ہماری تہذیبی بدقسمتی یا علمی زوال کی علامت ہے۔ شخصیت کا تعلق مذہب سے ہو یا سماج سے، علم و ادب سے ہو یا سیاست سے، تہذیب سے ہو یا معاشیات سے؛ ہم ہر ایک کو اپنے پسندیدہ زاویے سے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے دیگر افعال کو دانستہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ غالب کے ساتھ بھی یہی ہُوا ہے۔ ہر سوانح نگار نے حیاتِ غالب کے چند پہلوؤں یا چند واقعات سے ان کی تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔

جہاں تک غالب کی آپ بیتی کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ غالب نے **دستنبو** کے علاوہ اپنے یا اپنے عہد کے حالات کبھی قلم سنبھال کر نہیں لکھے۔ ہاں، خطوط میں اگر کہیں کوئی بات سوانحی یا سیاسی و سماجی حالات سے متعلق ضروری معلوم ہوئی، معرضِ تحریر میں آ گئی ہے۔ غالب کی خود نوشت سوانح عمری کی طرف پہلا قدم نظامی بدایونی نے اٹھایا، جنھوں نے **نکاتِ غالب** کے

نام سے ایک کتاب مرتب کی، جو نظامی پریس بدایوں سے 1920ء میں شائع ہوئی۔ مؤلف کے بقول، اس میں 'مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کی خود نوشتہ سوانح عمری، نکتے، جو وقتاً فوقتاً انھوں نے اپنے خطوط میں لکھے اور لطائف شامل ہیں'۔ یہ خود نوشت سوانح عمری کی ابتدائی شکل تھی، چنانچہ کتاب میں آپ بیتی کا حصہ صفحہ 5 سے 19 تک، گویا کُل پندرہ صفحات پر مشتمل ہے، جس کے بعد نکات و لطائفِ غالب شامل ہیں۔ دوسری اہم کاوش ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی طرف سے سامنے آئی۔ فاروقی صاحب نے مختصر، لیکن دلچسپ پیرایے میں **غالب کی آپ بیتی** مرتب کر دی۔ اندرونی سرورق پر یہ اطلاع دی گئی ہے کہ 'مرزا غالب کے خطوط سے انھیں کے لفظوں میں ترتیب دی ہوئی مکمل سوانح حیات، جس کا ہر لفظ مستند ہے'۔ بلاشبہ اس آپ بیتی کا ہر لفظ مستند ہے، لیکن 67 صفحات پر مشتمل اس تالیف کے محض سینتالیس صفحات (17-63) باقاعدہ آپ بیتی کہے جاسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آپ بیتی کو 'مکمل سوانح حیات' کہنا کسی طور مناسب نہیں۔ اسی طرح حفیظ عباسی نے **کہانی میری، زبانی میری** کے نام سے غالب کی آپ بیتی مرتب کی، لیکن یہ بھی نہایت مختصر رہی اور اس کے صفحہ 9 سے 64 تک محض چھپن صفحات آپ بیتی سے متعلق ہے۔ اس کے باوجود، ان آپ بیتیوں کے بعد اس سمت مزید کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا، گویا یہ فرض کر لیا گیا کہ مرتبہ آپ بیتی کے جملہ امکانات بروے کار آگئے، چنانچہ اہلِ قلم نے خاموشی اختیار کر لی۔ اِدھر صورتِ حال یہ تھی کہ **شبلی کی آپ بیتی** (2014ء) اور **آپ بیتی علامہ اقبال** (2015ء) کے بعد طبیعت مطالعۂ غالب پر مائل ہوگئی۔ غالب کی مرتبہ آپ بیتیوں میں غالب کی تحریروں کو بہت ہی کم استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ غالب نے اپنے متعلق اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی تاریکی میں نہیں رہا، چنانچہ ناچیز نے ہمت کر کے یہ بیڑا اُٹھالیا۔

واضح رہے کہ غالب کی فارسی تحریروں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ان تحریروں سے استفادہ کے لیے اردو ترجمے پر انحصار ناگزیر تھا، لیکن چونکہ یہ تراجم ایک سے زائد مترجمین کی طرف سے ہوئے ہیں، اس لیے ان میں اسلوب کی مختلف و متضاد صورتیں دِکھائی دیتی ہیں۔

ایسے میں غالب کی اردو تحریروں اور مختلف مترجمین کے اسالیب کی وجہ سے اس تالیف میں اسلوب کی یک رنگی، ہم آہنگی یا ہمواری کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن مرتب کی جانب سے اتنا وعدہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر اس کتاب کی آئندہ اشاعت کا موقع آیا تو ترجمے پر نظرِ ثانی کر کے تمام تراجم کو اسلوبِ غالب سے ہم رنگ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

زیرِ نظر آپ بیتی کی تیاری میں حسبِ ذیل نِکات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے:

- آپ بیتی کی ترتیب کے لیے سب سے بڑا ماخذ غالب کے خطوط ہیں۔ ان خطوں کا تعلق اردو اور فارسی زبان سے ہے۔ اردو خطوط کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، لیکن ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتبہ **غالب کے خطوط** کے بعد کسی اَور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی، چنانچہ زیرِ نظر تالیف میں اردو مکاتیب کے لیے مرحوم کے اس تنقیدی متن پر انحصار کیا گیا ہے۔
- فارسی مکاتیب کے بھی متعدد مجموعے منصہ شہود پر آ چکے ہیں، لیکن چونکہ زیرِ نظر تالیف کا تعلق اردو زبان سے ہے، اس لیے فارسی خطوں سے استفادہ محض ترجمے کی صورت میں ہو سکتا تھا۔ فارسی مکاتیب کے اردو تراجم کا بھی ایک سلسلہ چلا آتا ہے؛ لیکن جناب پرتو روہیلہ کی طرف سے **کلیاتِ مکاتیبِ فارسیِ غالب** کے بعد راقم کی نظر میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے مترجمہ **پنج آہنگ** کے علاوہ کوئی اَور ترجمہ قابلِ اعتنا نہیں رہا؛ چنانچہ اس تالیف میں انھی دو تراجم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا دلچسپی کا باعث ہو گا کہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے ترجمے میں غالب کے لب و لہجہ کا خیال رکھا گیا ہے، جب کہ جنابِ پرتو روہیلہ نے قاری کے نقطہ نظر سے ترجمہ کیا ہے، چنانچہ آپ بیتی کو غالب کے اسلوب کے قریب تر رکھنے کے لیے **پنج آہنگ** کے مکاتیب سے استفادے کے وقت بالعموم ڈاکٹر علوی کا ترجمہ پیشِ نظر رہا ہے۔

- ہندوستان کی جنگِ آزادی کے آغاز سے جولائی 1858ء تک غالب نے گوشہ نشینی کے دِنوں میں دستنبو کے عنوان سے اپنا روزنامچہ تحریر کیا۔ یہ تحریر بھی فارسی زبان میں ہے، جس سے مستفید ہونے کے لیے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا ترجمہ اس آپ بیتی کے کام آیا۔
- حیاتِ غالب کی مختلف کڑیوں میں ربط قائم رکھنے اور بعض ابہامات سے بچنے کے لیے غالب پر سوانحی ادب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ مولانا الطاف حسین حالی، مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، جنابِ مالک رام، ڈاکٹر خلیق انجم، باری علیگ، قاسم علی، کاظم علی خاں، کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر گوہر نوشاہی جیسے اکابر کی تحقیقات کو چراغِ راہ قرار دیا گیا۔
- بعض اوقات ایک ہی واقعے یا کیفیت نے مختلف مکاتیب میں جگہ پائی ہے یا اس کیفیت کے مختلف پہلو ایک سے زائد خطوط میں نقل ہوئے ہیں تو ان تمام کو حسنِ ترتیب سے دِکھانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ وہ واقعہ یا کیفیت یا جذبہ اپنی پوری توانائی اور تمام تر جزئیات کے ساتھ اپنا تاثر قائم کر سکے۔
- حیاتِ غالب کے چند مقامات سے متعلق بعض ناگزیر معلومات بقلم غالب معرضِ تحریر میں نہیں آ سکیں، وہاں دیگر ذرائع سے حاصل شدہ معلومات چوکور بریکٹ میں درج کر کے حوالہ دے دیا گیا ہے، تاکہ قاری کو تشنگی کا احساس نہ رہے؛ البتہ ایسے مقامات پر محض ربطِ تحریر کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔
- غالب کا بیان کردہ کوئی واقعہ اگرچہ اہم نہ ہو، لیکن اس سے غالب کی کسی عادت یا حسن و قبح کی خبر ملتی ہے تو اسے حسبِ ضرورت شامل کیا گیا ہے۔
- غالب کے حلقۂ احباب میں سے بعض کی بابت غالب کے بیان کردہ کچھ ایسے واقعات یا معلومات بھی پیش کی گئی ہیں، جن سے خود غالب کی کسی عادت، رویے، نفسیات یا فطرت پر رَوشنی پڑتی ہو۔
- سوانحی حالات کی پیش کش میں کلامِ غالب بھی ایک بڑا ذریعہ ہے، لیکن یہ خیال رکھا گیا کہ اشعارِ غالب آپ بیتی کی روانی میں مخل نہ ہوں؛ لیکن جہاں ضروری اور مناسب محسوس

ہُوا، پوری غزل یا قصیدہ دینا بھی گوارا کیا۔ یہ اَمر پیشِ نظر رہا کہ غالب کی حقیقی اور مکمل قلمی تصویر دِکھائی دینے لگے۔

- املاے غالب کو حتی الامکان اپنایا گیا ہے، البتہ بعض ناگزیر مقامات پر جدید املا اختیار کیا گیا ہے۔
- تالیف کی ابواب بندی زمانی ترتیب سے کی گئی ہے تو دوسری جانب اسے غالب کے کسی مصرع یا جزوِ مصرع سے مزّین کیا گیا ہے۔
- حوالوں کا اندراج پاورقی، اختتامِ باب پر یا پھر جملہ ابواب کے بعد کیا جا سکتا ہے۔ اس تالیف میں کاتب کی سہولت کو نظر انداز اور قاری کے استفادے کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاوَرقی طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے۔
- رجالِ غالب سے متعلق مؤقر غالب شناسوں کی طرف سے متعدد تحقیقات منصہٗ شہود پر آچکی ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں اُن تصانیف و تالیفات سے رجوع کیا جائے۔
- رجالِ غالب کے سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے، چنانچہ تمام شخصیات کے سوانحی کوائف جمع کیے گئے، بالخصوص تالیف کے ابتدائی مسودے میں قوسین کے اندر تاریخِ پیدائش و وفات اور مختلف مناصب پر ان کے زمانۂ تعیناتی کا اندراج کیا گیا، تاکہ آپ بیتی میں زمانی ترتیب درست رہے؛ البتہ مسودے کو حتمی شکل دیتے ہوئے ان تمام قوسین کو حذف کر دیا گیا، تاکہ یہ تالیف آپ بیتی رہے، مبادا تاریخی یا تحقیقی کتاب کی شکل اختیار کر لے اور قاری کے ذوقِ لطیف پر گراں گزرے۔
- عہدِ غالب سے عہدِ حاضر تک اردو زبان نے متعدد منزلیں طے کر لی ہیں اور عربی و فارسی الفاظ کی نسبت مقامی و بین الاقوامی زبانوں کے الفاظ و تراکیب کا استعمال بڑھ گیا ہے، جس نے اردو زبان کے شکل و صورت ہی بدل کر رکھ دی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ غالب کی فارسی تحریروں کے تراجم میں بھی متعدد نامانوس الفاظ و تراکیب ناگزیر تھے؛ چنانچہ زیرِ نظر تالیف کو زیادہ مفید بنانے کے لیے قاری کے نقطۂ نظر سے ایک مختصر فرہنگ تیار کر دی گئی ہے۔

- کتابیات کے تحت آپ بیتی کے تمام ماخذات کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

جن دِنوں مَیں اس منصوبے پر غور و فکر کر رہا تھا، عین اُنھی ایام میں ڈاکٹر عظمیٰ سلیم نے **کلیاتِ مکاتیبِ فارسیِ غالب** بطور ارمغان مجھے ارسال کر دی۔ چونکہ مَیں نے انھیں اس سلسلے میں اُس وقت تک مطلع نہیں کِیا تھا، اس لیے مجھے نہایت خوشگوار حیرت ہوئی؛ چنانچہ آج جب یہ تالیف پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے، مَیں ان کا بے حد ممنون بھی ہُوں اور ان کے گھرانے کے لیے دعاگو بھی۔

ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر شاہد نواز اور ڈاکٹر محمد یار گوندل کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں، جن کے مفید مشوروں اور تجاویز کی رَوشنی میں یہ تالیف اس قابل ہوئی کہ نذرِ قارئین کی جا سکے۔

یہ منصوبہ محض ایک خیال ہی رہتا، اگر محبِ گرامی محمد رفیع الدین حجازی اس کی اشاعت کا بیڑہ نہ اٹھاتے۔ قبل ازیں **شبلی کی آپ بیتی** اور **آپ بیتی علامہ اقبال** بھی انھی کی سرپرستی میں نشریات لاہور سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی بے لوث محبت میرے لیے وجہِ افتخار ہی نہیں، سرمایۂ حیات بھی ہے۔

مرزا اسد اللّٰہ خاں غالب 15 فروری 1869ء کو جہانِ فانی سے رخصت ہوئے، چنانچہ 15 فروری 2019ء کو اردو کے اس عظیم شاعر کی ایک سو پچاسویں برسی کی مناسبت سے ناچیز کی طرف سے یہ ایک حقیر ہدیہ ہے، جسے نہایت عجز اور انکسار کے ساتھ شائقینِ غالب کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

خالد ندیم

27/ دسمبر 2018ء

dr.khalidnadeem@gmail.com

غالب کون؟

اردو ادب میں مرزا غالب ایسا فن کار ہے، جس کے فن کی تعبیریں آج بھی ہو رہی ہیں۔ غالب نہ صرف ایک شاعر اور نثر نگار ہے، بلکہ ایک طرزِ زیست کا نام بھی ہے۔ اُس کے فن اور سوانح پر تحریروں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کلامِ غالب کی شروح کی تعداد ایک سو سے بھی تجاوز کر چکی ہے، اسی طرح اُن کے حالاتِ زندگی پر بھی کم و بیش چالیس سوانحی کتب لکھی جا چکی ہیں۔ اُن کے حالاتِ زندگی کا تذکرہ تو تذکروں میں اُس وقت شروع ہو گیا تھا، جب وہ پندرہ سولہ برس کے تھے۔ آج اردو دنیا میں غالبیات باقاعدہ ایک شاخِ علم (discipline) ہے اور آئے روز اُس کے فن اور شخصیت کے نئے دَر وا ہوتے جا رہے ہیں۔

غالب نے کہا تھا:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کیونکہ اُس کی اَنا کو یہ ہر گز گوارا نہ تھا کہ وہ اپنی زبان سے اپنا تعارُف کرائے، لیکن اپنے خطوط میں خود ہی بہت کچھ بتا دیا کہ غالب کون ہے؟ غالب اپنے خطوں میں جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ کسی بھی شخص کے حالاتِ زندگی قلم بند کرنے کے لیے خطوں سے بڑھ کر اَور کوئی مستند مآخذ نہیں۔ اردو کے عظیم انشاپرداز مولانا محمد حسین آزاد نے **آبِ حیات** میں جو سوانح غالب کی تصویر کشی کی ہے، وہ خطوطِ غالب کے سہارے سے ہی ہے، یہ الگ بات ہے کہ مرزا غالب

کے اپنے بیانات (خطوط) میں بھی تضاد (contradict) پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ بھی اُن کی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔

اردو کی باقاعدہ سوانح نگاری کا سلسلہ حالی کی **یادگارِ غالب** سے شروع ہوا، جو ہنوز جاری ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی خطوط کی مدد سے **غالب** تصنیف کی۔ غالب پر سوانح عمریوں کے ساتھ ساتھ آپ بیتیوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس ضمن میں نثار احمد فاروقی کی **غالب کی آپ بیتی**، حفیظ عباسی کی **کہانی میری زبانی میری**، مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی کی **نکاتِ غالب**، مرزا محمد بشیر ایم اے، بی ٹی کی **سرگزشتِ غالب** (جو صرف **اردوے معلّیٰ** کے خطوط تک محدود ہے) اور ناصر عابدی کی **سرگزشتِ غالب** (جو نظامی بدایونی کی **نکاتِ غالب** کی نقل ہے) شامل ہیں۔ اب اکیسویں صدی میں غالب کی آپ بیتی مرتب کرنے کا سہرا ڈاکٹر خالد ندیم کے سر ہے۔ اس سے پہلے وہ **شبلی کی آپ بیتی** اور **آپ بیتی علامہ اقبال** ترتیب دے چکے ہیں۔

ڈاکٹر خالد ندیم کی مرتبہ **آپ بیتی مرزا غالب** گذشتہ آپ بیتیوں سے اس لیے منفرد ہے کہ اس میں انھوں نے ممکنہ حد تک غالب کے تا حال دستیاب اردو فارسی خطوط، اردو فارسی منثورات، اردو فارسی منظومات اور غالب سے متعلق سرکاری انگریزی دستاویزات کی مدد سے ترتیب دیا ہے۔

ڈاکٹر خالد ندیم نے زیرِ نظر آپ بیتی کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے، یوں کہ ہر حصہ غالب کی زندگی کے کسی ایک رُخ، کیفیت اور صورتِ حال کو پیش کرتا ہے اور لطف یہ کہ ہر باب کا عنوان غالب کے کسی حسبِ حال مصرعے پر قائم کیا گیا ہے، مثلاً 1828-1829 کے دَور کا نام 'کلکتے کا جو ذکر کیا' رکھا ہے، اسی طرح 1850-1857 کا دَور، جس میں مرزا قلعہ معلّیٰ سے منسلک ہوئے، اس کا عنوان 'غالب وظیفہ خوار' ہے اور آخری باب، جو 1865-1869 تک کا ہے، اس کا عنوان 'دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے' تجویز کیا ہے۔

آپ بیتی مرزا غالب کے مطالعہ سے نہ صرف حالاتِ غالب کا علم ہوتا ہے، بلکہ غالب کی بعض درُونِ خانہ قلبی کیفیات بھی قاری تک پہنچ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر خالد ندیم نے اس تالیف

میں توقیت کا خاص خیال رکھا ہے اور حالاتِ غالب کی تدوین میں ترتیبِ زمانی و مکانی کو ملحوظ رکھا ہے، یوں اس آپ بیتی میں سوانحی تسلسل برقرار رہا ہے۔

یہ بات بِلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح مرزا غالب پر سوانح عمریوں میں مالک رام کی **ذکرِ غالب** اوّلیت کا درجہ حاصل کر چکی ہے، اسی طرح لمحہ موجود تک غالب پر آپ بیتیوں میں ڈاکٹر خالد ندیم کی **آپ بیتی مرزا غالب** اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس تالیف میں واقعتاً آپ بیتی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ غالب کی ایک سو پچاسویں برسی کے موقع پر ڈاکٹر خالد ندیم کی یہ کاوِش غالب کے طلب گاروں کے لیے کسی ارمغان سے کم نہیں۔

ڈاکٹر محمد یار گوندل
سرگودھا یونیورسٹی سرگودھا
13/ اگست 2018ء

شبلی سے آنکھ بچا کر

میرزا غالب نے ایک زمانے میں، زمانے کی ناشناسی کا شکوہ ان الفاظ میں کیا تھا: پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟ مَیں جب کبھی اس شعر پہ غور کرتا ہوں، اس کے اندر سے بے نیازی، رعونت، بے توقیری کا گلہ، غالب شناسی کی دعوت اور جانے کیا کیا کچھ بر آمد ہوتا چلا جاتا ہے۔ میرزا کے اِس شعری مطالبے، فرمائش یا فہمائش کے بعد ادبی دنیا میں بہت سے 'کوئی' آئے؛ انھوں نے 'غالب کون؟' کا راگ بھی الاپا؛ غالب شناسی کی لَے بھی چھیڑی؛ میرزا کی ذاتی، جذباتی اور ادبیاتی زندگی کی تصویریں کشید کی گئیں؛ کلامِ غالب کی رنگا رنگ تفسیریں اور تعبیریں احاطۂ تحریر میں آئیں۔ کسی نے خطوطِ غالب سے تاریخِ جنگِ آزادی بر آمد کی؛ کہیں بے شمار سیاسی، سماجی رویے ڈھونڈ نکالے گئے؛ بعض 'کوئیوں' نے ذخیرۂ غالب سے تصوف، فلسفہ، طب، نجوم کے نئے سے نئے گوشے بر آمد کرنے کے بلند بانگ دعوے بھی کیے؛ ادبی ناقدین اُن کے خطوط سے ناول، ڈراما، افسانہ، آپ بیتی، طنز و مزاح اور رمز و ایما کی خبریں بھی لائے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پانی پت کے مولوی حالی کے علاوہ، ہر جگہ سے بالعموم یہی صدا بلند ہوئی: حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

مجھے یاد ہے کہ آج سے ڈیڑھ دہائی قبل حُبِ غالب کی آڑ میں ایک شرارت مَیں نے بھی کی کہ بیٹھے بٹھائے، پلّے سے ایک لفظ ڈالے بغیر خطوطِ غالب سے، 'آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے' کے عنوان سے میرزا کا ایک 'خود نوشت' خاکہ کشید کر ڈالا۔ مَیں چونکہ خاکے کا آدمی ہوں، اس لیے مجھے تو اتنی ہی توفیق تھی، لیکن خالد ندیم تو سیدھے سیدھے 'آپ بیتی' بلکہ 'چھاپ بیتی' کے قائل ہیں۔ گویا پروین شاکر کے الفاظ میں وہی معاملہ ہو گیا: مَیں نے تو ایک بات کی، اُس نے کمال کر دیا۔

ڈاکٹر خالد ندیم ویسے بھی مزاج، رواج اور خراج کے اعتبار سے تفصیل، تعمیل اور تکمیل کے آدمی ہیں۔ زمانے کے سانحات کو سہتے سہتے انھوں نے سوانح کی رمز کو پالیا ہے۔ عطیہ فیضی کے جملہ عشاق کی سوانحاتِ جمیلہ، اُن کی فن کاری اور تجربہ کاری کی شاہد ہیں اور اِس آپ بیتی میں تو اپنے میرزا اسد اللہ خاں غالب مکمل آب و تاب اور پورے طُمطراق سے سامنے آ گئے ہیں۔

ایک زمانے میں سرحد پار، میرزا غالب کی زندگی پہ ایک فلم بنی، جس میں بھارت بھوشن نامی اداکار نے غالب کا نہایت بھونڈا کردار ادا کیا تو اس پر ایک شوخ ناقد نے لکھا کہ 'غالب اپنی زندگی میں اللہ میاں سے بہت گستاخیاں کرتا تھا، کبھی اسے فردوس کو دوزخ میں ملانے کے مشورے دیتا اور کہیں جنت کی حوروں کی عمر پہ معترض ہوتا، کہیں فرشتوں کے لکھے کو 'ناحق' قرار دیتا تو کہیں اُس کی قہاری و جبّاری کے منھ بھر بھر کے شکوے کرتا۔ اللہ نے بھی اُس کی سرزنش کا خصوصی انصرام کیا کہ برِصغیر ہی کی سرزمین پہ بھارت بھوشن کو پیدا کیا، تاکہ وہ بڑا ہو کر غالب کا ایسا رول ادا کرے کہ دیکھے اُسے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو'۔ موجودہ دَور تک آتے آتے لگتا ہے قادرِ مطلق کو، قادرالکلام شاعر پہ رحم آ گیا اور اُس نے تلافیِ مافات کے لیے شیخوپورہ کی سرزمین پہ خالد ندیم کو پیدا کیا، جسے انیسویں صدی کے سب سے اہم اور منفرد شاعر کے متفرق فن پاروں میں پڑی لخت لخت زندگی کو نہایت قرینے سے مجتمع کرنے کا اِذن بخشا، لہٰذا آج ہم ڈاکٹر خالد ندیم کی اِسی شبلی، اقبال اور غالب نوازی کی بنا پر، نیز اُن کے مجموعی کام اور مزاج کے پیشِ نظر، شبلی سے آنکھ بچا کے انھیں نہایت آسانی سے موجودہ دور کا 'حالی' قرار دے سکتے ہیں۔ ویسے بھی دوستو! حالی تو وہی ہوتا ہے، جو حال کو ماضی کے طلسم سے وقیع اور مستقبل کے تصور سے وسیع کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ ڈاکٹر خالد ندیم کی ہنر کاری بتاتی ہے کہ وہ ان جملہ صفات سے پوری طرح مُتصف ہیں۔

ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک

17/ اکتوبر 2018ء

آرزوؤں اور حسرتوں کی داستان

شبلی اور اقبال کی آپ بیتیوں کے بعد **آپ بیتی مرزا غالب** خالد ندیم کی تیسری ایسی کتاب ہے، جس میں انھوں نے کسی تخلیقی شخصیت کی ذات (Persona) کو اس کے متون کے درُون سے نکال کر اس طرح باہر لا کھڑا کیا ہے کہ مابین حروف و صوت کوئی حائل نہیں رہا۔ غالب کی شخصیت اور ان کی نظم و نثر کے درمیان تعلق ویسے بھی خاصا پیچیدہ ہے۔ غالب کا نثری سرمایہ، جہاں ان کے حالات کی ایک مکمل تصویر کا سکیچ کھینچتا جاتا ہے، وہاں ان کی شاعری کا ایک ایک لفظ ان کی تمناؤں، آرزوؤں اور حسرتوں کی داستان سناتا ہے۔

ان کی شاعری اور بالخصوص نثر اُس وقت تخلیق ہوئی، جب مغل سلطنت اپنے آخری دَموں پر تھی۔ غالب، جو اس سلطنت کے ماضی میں شان دار تجمل اور درخشاں تہذیبی روایات کو قلم بند کرنے پر مامور کیے گئے تھے، کیسے ممکن تھا کہ خود اپنی اعلیٰ نسبی اور خاندانی وجاہت کو نظر انداز کر جاتے۔ غمِ عزت، غمِ ناموس، غمِ روزگار اور غمِ عشق ہی تو غالب کا مسئلہ رہے۔ (وہ غالب ہوں، جس کا دل زمانے کے غموں سے شکستہ اور جس کا جگر محبوبوں کی تیر باری سے چھلنی ہے۔)

ان کی ذاتی ناآسودگیوں کا سبب یہی روگ تھے، جو آخری سانس تک ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ خالد ندیم نے **آپ بیتی مرزا غالب** مرتب کرتے ہوئے زمانی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے غالب جیسے شاعر کے اندرونے میں موجود ایک تخلیقی شخص کے ساتھ ساتھ دنیادار غالب کی زندگی کو معنوی تسلسل دیا ہے، جو ایک شدید اَناپرست (Egocentric) ہوتے ہوئے بھی

بے پناہ انسان دوست تھا۔ (سبحان اللہ، کیا برکت ہے اس سو روپے میں کہ سو آدمی روٹی کھاتے ہیں اور فقیر کے بھی سو کام نکل جاتے ہیں۔ غالب بنام نواب کلب علی خاں، فروری 1868ء کی تنخواہ وصول ہونے پر)

خالد ندیم سے پہلے بھی غالب کے سوانح پر چند عمدہ کتب لکھی گئی ہیں، مگر **آپ بیتی مرزا غالب** اس لحاظ سے منفرد ہے کہ انھوں نے پوری کتاب، یہاں تک کہ اس کا دیباچہ بھی غالب کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے۔ (مَیں عدم سے وجود میں گہر سنجی و گوہر فروشی کے لیے آیا تھا۔ میری متاعِ گراں مایہ نے اس چار جہت میں رواج کا منہ نہیں دیکھا اور میری جنس بیش بہا نے اس بازار میں قیمت نہیں پائی۔ **مہر نیم روز**)

خالد ندیم کا مطلوب و مقصود بھی گلشنِ ناآفریدہ کے عندلیب کی گہر سنجی سے اخذِ معنی کر کے شخصیت کی مکمل تصویر بنانا تھا۔ (معلوم نہیں، ہمارے یہاں شخصیات کی مکمل تصویر کشی کیوں نہیں کی جاتی۔ ہم ہمیشہ شخصیت کے صرف ایک ہی پہلو پر زور دیتے ہیں۔ ہم کسی شخصیت کو انسانی سطح پر دیکھ ہی نہیں سکتے)۔ اس سے شاید ان کی مراد یہ ہے کہ ہماری سوانح عمریوں اور آپ بیتیوں میں عام طور پر انسانی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر خالد ندیم کو یہ سہولت رہی ہے کہ خود غالب نے اپنی غلطی یا خامی کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

خالد ندیم نے غالب کی یہ مکمل تصویر اردو فارسی مکاتیب، **مہر نیم روز** اور **دستنبو** کے تال میل سے کچھ اس طرح بنائی ہے کہ غالب کی زندگی کی کوئی کڑی گم نہیں ہوتی، کسی مقام پر دلچسپی معدوم نہیں ہوتی اور ان کی شخصیت کا طلسم نہیں ٹوٹتا۔

ڈاکٹر نجیب جمال

11/اکتوبر 2018ء

آپ بیتی

مرزا غالب

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیراہن ہر پیکرِ تصویر کا

ناداں چہ کار کرد

مَیں عدم سے وجود میں گہر سنجی و گوہر فروشی کے لیے آیا تھا۔ میری متاعِ گراں مایہ نے اس چار جہت میں رواج کا مُنھ نہیں دیکھا اور میری جنس بیش بہا نے اس بازار میں قیمت نہیں پائی۔ ناچار جو کچھ اپنے ساتھ لایا ہوں، کیونکر کہوں کہ اپنے ہی ساتھ لے جارہا ہوں۔ کسی قدر کتابوں میں اور کسی قدر سینوں میں چھوڑ کر دنیا سے جارہا ہوں۔ میرے بعد اگر اس گنجِ شایگاں کو ہَوا اُڑا دے، اُڑا دے؛ اگر خاک کھا جائے، کھا جائے (مَیں کیا کروں)۔ سینہ جواں مرگ آرزوؤں کا مدفن ہے تو نگاہِ گرم کو چراغِ گورِ غریباں ہونا چاہیے۔[1]

حاکم بسر کہ غرورِ آزادہ رَوی کے فریب میں آکر، بے سوچے سمجھے شعر گوئی شروع کر دی۔ قدرِ سخن کا اندازہ اور اپنے خاندان کی بلندیِ رُتبہ کو نہ پہچانا۔ میرا سینہ ایک نفس رکھتا تھا، اس نسیم کے مانند فرحت افزا، جو نسترن زار کی طرف سے آتی ہے۔ میری زیاں پسندی کو دیکھیے کہ مَیں نے اس کو سِوا غیر ضروری باتوں کے اَور کہیں صَرف نہ کیا۔ میری انگلیوں میں ایک قلم تھا، ایسے دجلہ بار ابر کی مثال، جو قبلہ کی طرف سے اُٹھے، (مگر) مَیں کس درجہ بے ہودہ کوش ہوں کہ مَیں نے اس کو زمینِ شور میں برسا دیا۔

با ایں فروغِ گوہر و رخشانیِ نہاد
زیں ساں سیاہ روز کرا کرد روزگار

[ایسا رَوشن نسب اور شاندان ذاتی صلاحیتوں کا حامل ہوتے ہوئے، زمانے نے ایسا سیاہ بخت اَور کس کو کیا ہے!]

---

(1) غالب 1969ء ب، ص 77

عقل و ہوش سے بیگانہ ہوں اور نام و ننگ کا دشمن۔ کمینوں کا ہم نشیں ہو اور اَوباشوں کے رنگ میں رنگا ہُوا۔

پاؤں بے راہ چلنے والا اور زباں بے مقصد بولنے والی، اپنی شکست میں آسمان کا معاون اور اپنی آزار رسانی میں دشمن کو تدبیر سکھانے والا۔ دل افکار و آلام سے معمور اور آنکھیں خون کے آنسو رونے والی، نہ خود نماؤں کی طرح آرائش اور نہ آزادوں کی طرح ساز و سامانِ راحت۔ ہر شخص کی سرگزشت وہی ہوتی ہے، جو ازل میں اس کے لیے مقدر ہو چکی ہے، (اس لیے) جو کچھ مجھ پر گزری، دوستوں کو مجھے سرزنش نہیں کرنی چاہیے اور نہ مجھے دشمنوں کے ساتھ پرخاش رکھنی چاہیے۔

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست چرخ

دانا خورد دریغ کہ ناداں چکار کرد

[لنگر آندھی نے توڑ دیا اور کشتی آسمان نے۔ دانا افسوس کرتا ہے کہ ہائے! نادان نے یہ کیا کیا۔][2]

[مرزا اسد اللہ خاں غالب]

---

(2) غالب 1969ء ب، ص 78-79

(1)

مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں

(1825ءتک)

مَیں قوم کا ترک سلجوقی[1]، اپنی اصل آفرینش میں اُس گروہ کی نسل سے ہوں، جس کی خوش بختی کا سورج، عرصہ ہُوا، ڈھل چکا ہے اور مَیں اُس جماعت کے حلقہ میں شامل ہوں، قسمت نے جس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اس پر بھی اَب قرن بیت رہے ہیں۔ مَیں ترک نژاد ہوں اور میرا نسب نامہ افراسیاب وپشنگ سے جا کر مل جاتا ہے اور میرے اجداد اِس وجہ سے کہ سلجوقیوں کے ساتھ ہم گوہری کا پیوند رکھتے تھے، اُن کے دَور میں انھوں نے سپہ گری و کشور کشائی کا پرچم بلند کیا۔ جب اس گروہ کی جاہ مندی و خوش نصیبی کا دَور دَورہ ختم ہُوا اور بے نوائی و ناپزیرائی کا زمانہ آ گیا تو ان میں سے ایک جماعت تو رہزنی و قزاقی کی طرف مائل ہو گئی اور ایک نے زراعت کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ میرے اجداد کی آرائش گاہ سرزمینِ توران کا شہر سمرقند بنا۔ ان لوگوں میں سے میرا دادا [میرزا قوقان بیگ خاں] اپنے باپ [ترسم خاں] سے ناخوش ہو کر [محمد شاہ کے عہد میں] عازمِ ہندوستان ہُوا اور لاہور میں [صوبیدار] نواب معین الملک کی ہمرہی اختیار کی، لیکن [1754ء میں[2]] معین الملک [انتقال کر گیا اور اس] کی بساطِ دولت بھی وقت نے اُلٹ دی تو میرے جدِ بزرگوار [قوقان بیگ خاں] نے دہلی کا رُخ کیا اور[3] [اپریل 1756ء کے بعد مغل حکومت کا شاہی ملازم ہو گیا[4]]۔

---

(1) خلیق انجم 1995ء، ص 1533 (2) باری علیگ 2001ء، ص 353 (3) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 133-134۔ فارسی متن: پرتورہیلہ 2015ء، ص 502 (4) بحوالہ کاظم علی خاں 1999ء، ص 11

[1763ء میں قوقان بیگ خاں کی شادی ہوگئی اور[5]]شاہجہاں آباد میں میرا باپ عبد اللہ بیگ خاں [قیاساً1765ء میں[6]]عالمِ وجود میں آیا۔[7]

[قوقان بیگ خاں بعد از مئی 1771ء میں مغل کمانڈر اِن چیف[8]] ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں بہادُر سے ملا[9][اوراس کی سرکار میں ملازم ہو گیا[10]]۔[مغلیہ]سلطنت ضعیف ہو گئی تھی،[چنانچہ]صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہُوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔[11]

بعد[نجف خاں کے]انتقال[26/ اپریل 1782ء[12]]کے، جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا، وہ علاقہ[میرے دادا کے قبضے میں]نہ رہا۔[13][30/ جولائی 1788ء سے قبل قوقان بیگ خاں وفات پا گیا۔[14]]

[قیاساً1793ء میں[15]عبد اللہ بیگ خاں کی شادی رئیسِ آگرہ خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی صاحب زادی عزت النسا بیگم سے ہوئی اور وہ خانہ داماد کی حیثیت سے وہیں رہنے لگا۔[16]]

[غالباً1795ھ میں میری بڑی بہن چھوٹی خانم پیدا ہوئی۔[17]]

OOO

باپ میرا عبد اللہ بیگ خاں بہادُر[21/ ستمبر 1797ء سے قبل[18]] لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا،[لیکن]بعد چند روز، حیدرآباد جا کر[نظام الملک]نواب نظام علی خاں کا نوکر ہُوا، تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا[اور]کئی برس وہاں رہا۔[19]

OOO

---

(5) بحوالہ کاظم علی خاں1999ء، ص11 **(6)** بحوالہ کاظم علی خاں1999ء، ص11 **(7)** تنویر احمد علوی2016ء، ص134۔ فارسی متن: پرتورہیلہ 2015ء، ص502-503 **(8)** بحوالہ کاظم علی خاں1999ء، ص11 **(9)** تنویر احمد علوی2016ء، ص134۔ فارسی متن: پرتورہیلہ 2015ء، ص502 **(10)** بحوالہ کاظم علی خاں1999ء، ص11 **(11)** خلیق انجم1995ء، ص1533 **(12)** بحوالہ غلام رسول مہر1946ء، ص36 **(13)** خلیق انجم1995ء، ص1533 **(14)** بحوالہ کاظم علی خاں1999ء، ص12 **(15)** بحوالہ کاظم علی خاں1999ء، ص12 **(16)** بحوالہ غلام رسول مہر1946ء، ص19 **(17)** بحوالہ کاظم علی خاں1999ء، ص12 **(18)** بحوالہ کاظم علی خاں1999ء، ص12 **(19)** خلیق انجم1995ء، ص1533

مَیں [8/ رجب] 1212ھ [27/ دسمبر 1797ء کو اکبر آباد میں] پیدا ہُوا۔[20] [حیدر آباد میں میرے والد کی] وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی [تو] والد نے [سواروں کا ایک دستہ لے کر[21]] الور [Alwar] کا قصد کیا [اور اس کے والی] راؤ راجا بختاور سنگھ کا نوکر ہُوا۔[22]

[1799ء کے آخر میں میرا چھوٹا بھائی یوسُف علی بیگ خاں پیدا ہُوا۔[23] ابھی] پانچ برس کی میری عمر تھی کہ [1803ء میں[24]] میرا باپ عبد اللہ بیگ خاں عرف مرزا دُلھا، مہاراؤ راجا بختاور سنگھ بہادُر کی رفاقت میں مارا گیا[25] [اور راج گڑھ میں دفن ہُوا۔[26] یوں] شفیق باپ کا سایۂ عاطفت میرے سر سے اُٹھ گیا۔[27] سرکار سے میرے باپ کی تنخواہ میرے نام پر جاری ہوئی اور ایک گاؤں 'تالڑا' مجھ کو برائے دوام ملا؛ [گویا] اِدھر دودھ پینا چھوڑا اور اُدھر راج کی روٹی کھائی۔[28]

نصر اللہ بیگ خاں بہادُر، میرا چچا حقیقی، مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبیدار تھا۔[29] [17/ اکتوبر 1803ء کو[30]] انگریزی فوج جب اس علاقے میں پہنچی تو نصر اللہ بیگ خاں نے اس کی اطاعت قبول کر لی، خود سرکارِ برطانیہ کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور جنرل لارڈ لیک صاحب بہادُر کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنھوں نے آگرہ صوبے کا انتظام ان کے حوالے کر دیا۔[31]

جب مسٹر ولیئرز آگرے کی قلعہ داری کے منصب پر فائز ہوئے تو صوبیداری کی حیثیت وہ نہ رہی، جو سابق کماندار کے زمانے میں ہُوا کرتی تھی، چنانچہ نصر اللہ بیگ خاں متھرا چلے گئے اور جنرل موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنھوں نے سترہ سو روپے ماہانہ تنخواہ پر چار سو سواروں کے ایک دستے کی رسالداری سونپ دی۔[32] میرے چچا [اس] جمعیت کے ساتھ صمصام الدولہ [جنرل لارڈ لیک] کے ہمرکاب سرکشوں سے جنگ میں مصروف [رہے]۔[33]

---

(20) خلیق انجم 2008ء، ص 413 **(21)** بحوالہ غلام رسول مہر 1946ء، ص 19 **(22)** خلیق انجم 1995ء، ص 1533 **(23)** بحوالہ کاظم علی خاں 1999ء، ص 15 **(24)** بحوالہ غلام رسول مہر 2015ء، ص 19 **(25)** خلیق انجم 1989ء، ص 807 **(26)** بحوالہ غلام رسول مہر 2015ء، ص 19 **(27)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 134۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 503 **(28)** خلیق انجم 1989ء، ص 807-808 **(29)** خلیق انجم 1995ء، ص 1533 **(30)** بحوالہ باری علیگ 2001ء، ص 256۔ باری علیگ نے لکھا ہے کہ 17 اکتوبر کو لیک آگرہ کے قلعے پر قابض ہو گیا۔ حوالۂ مذکور **(31)** بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 25۔ انگریزی متن: کتابِ مذکور انگریزی حصہ، ص 17 **(32)** بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 25۔ انگریزی متن: کتابِ مذکور، انگریزی حصہ، ص 17 **(33)** ⇦

[1805ء میں[34]] بھر تپور کے [راجاکے]ساتھ[انگریزوں کے]دوستانہ مراسم کے قیام اور جنرل موصوف[ولیز ز] کی ولایت کو واپسی طے ہونے کے بعد لارڈ صاحب بہادُر نے نصر اللہ بیگ خاں کی وفاداری اور خدمات کے صلے میں تاحینِ حیات صوبہ آگرہ کے دو پر گنے سونک[Sonk] اور سونسا[Sonsa] پندرہ ہزار آٹھ سو روپے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عنایت فرمائے، جن کا مالیہ ایک لاکھ روپے سے زیادہ تھا۔ اس عطیے میں، سواروں کے دستے کی رسالداری کے ساتھ، اگر ان کی پنشن کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کی طاقت اور مرتبے میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا۔ جنرل صاحب بہادُر کی مہر شدہ سند اور وظائف کی بابت نصر اللہ بیگ خاں کے نام جنرل موصوف کا پروانہ:[35]

> درآں حالیکہ سونک و سونسا پر گنے سے، جو آپ کی دائمی ملکیت ہے، آپ کے یومیہ پنشن داروں کے لیے مبلغ5600/روپے بطور ایک امدادی وظیفے کے مقرر کر دیا گیا ہے، جو انھیں ہمیشہ ملتا رہا ہے اور چونکہ یہ رقم سونک اور سونسا کے پر گنہ کے منافع میں سے ہے، لہٰذا یہ آپ کے مقررہ مالیہ کے علاوہ ہے۔ مطلوب ہے کہ ان میں سے ہر شخص کو مذکورہ وظیفہ ادا کرنے کے بعد، آپ ان سے رسید حاصل کریں گے اور اسے سرکاری دفتر میں جمع کرائیں گے۔ اس فیصلے پر ہمیشہ عمل کیا جائے گا اور یہ کہ آپ کسی سے بھی کسی نئی سند کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ اس فیصلے کو قطعی تصور کیا جائے گا۔(21/ستمبر 1805ء)[36]

[لارڈ لیک کے ایک حکم نامہ کی نقل]

صوبہ آگرہ کے پر گنے سونک سونسا کے چودھریوں، زمینداروں، قانون گوؤں اور اوَرسیئروں[overseers] کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ مذکورہ پورا پر گنہ مرزا نصر اللہ

⇦ تنویر احمد علوی2016ء، ص 134۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 503 (34) بحوالہ باری علیگ 2001ء، ص258۔ باری علیگ لکھتے ہیں کہ راجا[رنجیت سنگھ] تمام مملکت کو اپنے ہاتھ سے کھو چکا تھا، صرف بھر تپور اس کے قبضے میں تھا۔ [جنرل لیک]3 جنوری1805ء کو بھر تپور پہنچا۔ تین بار حملہ آور ہُوا، لیکن اسے ہر بار شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ [آخر کار] لیک نے راجا بھر تپور سے صلح کی درخواست کی، جسے راجا نے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ کیا۔ حوالہ ٔمذکور (35) بحوالہ گوہر نوشاہی1997ء، ص25۔ انگریزی متن: حوالہ ٔمذکور، انگریزی حصہ، ص17 (36) بحوالہ گوہر نوشاہی1997ء، ص35۔ انگریزی متن: حوالہ ٔمذکور، انگریزی حصہ، ص29

بیگ خاں کو اپنے تمام محاصل اور چونگی کے ساتھ، سوائے مالیہ کی جاگیروں، املاک، عطیات اور باغات وغیرہ، عطا کر دیا اور سالانہ 15800/روپے سکہ رائج الوقت ادا کیے جائیں گے اس شرط کے ساتھ کہ وہ عطیات وصول کرنے والوں سے متعلق احکامات پر برضا و رغبت اور سرگرمی سے عمل کرتے رہیں گے (جن کے نام ایک پروانہ جاری کر دیا گیا ہے) اور مقررہ لگان قسطوں میں باقاعدگی سے ادا کرتے رہیں گے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ پوری خوش دِلی کے ساتھ مرزا موصوف کے نائبین کی خدمت میں حاضر ہُوا کریں گے اور حکومت کے واجبات ادا کیا کریں گے اور ہر طرح سے اپنے کام میں خوشنودی کو ملحوظ رکھیں گے اور ان کی خوشی اور تنبیہ کو مقدم تصور کریں گے۔ وہ اپنے حسن سلوک سے ان لوگوں کو مطمئن اور خوش رکھنے کی کوشش کریں گے، تاکہ محاصل کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ عزت مآب (ہز ایکسی لینسی) کو پورا یقین ہے کہ ظلم و ستم کی کوئی شکایت ان کے کانوں تک نہیں پہنچے گی اور یہ کہ طے شدہ شرائط پر عمل کریں گے۔ اسے حتمی تصور کیا جائے۔ (26/ستمبر 1805ء)[37]

چچا نے جب چاہا کہ ناز و نعم کے ساتھ میری پرورش کرے تو اس کو اجل نے امان نہ دی[38] [اور] جاگیر پر ان کی تقرری کے دس یا گیارہ مہینے بعد [جب وہ] ہاتھی پر سوار جا رہے تھے، اتفاقاً نیچے گرے اور پیر کی ہڈی ٹوٹ جانے اور اندرونی چوٹوں کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا،[39] [گویا اپنے] بڑے بھائی کے مرنے کے بعد خود اس نے بھی اسی کے نقش قدم پر چل کر راہِ مرگ طے کی اور مجھے اس ویرانہ آباد میں تنہا چھوڑ دیا۔ یہ حادثہ کہ میرے لیے نشانِ جاں گدازی اور آسمان کے لیے کینہ سازی کا وقت تھا، 1806ء/1221ھ میں پیش آیا۔[40]

جس روز یہ واقعہ ہُوا، حکومت نے اُسی دِن ان کی جاگیر پر قبضہ کر لیا اور کچھ ہی عرصے بعد ان کے چار سو سواروں کے دستے کو بھی سبکدوش کر دیا۔ چونکہ نصر اللہ بیگ خاں لاولد تھے، اس لیے [درج ذیل] اشخاص کے سوا ان کا اَور کوئی وارث نہیں تھا:

(**37**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء ص 36۔ انگریزی متن: حوالہ مذکور، ص 30 (**38**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 134۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 503 (**39**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 25۔ انگریزی متن: حوالہ مذکور ص 18 (**40**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 134۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 503

1 مَیں خود کہ نصر اللّٰہ بیگ خاں کا بھتیجا

2 میرا بھائی [مرزا یوسُف علی بیگ خاں]، جو مجھ سے دو سال چھوٹا تھا

3 میری دادی، یعنی نصر اللّٰہ بیگ خاں کی والدہ

4 نصر اللّٰہ بیگ خاں کی تین بہنیں

اُس وقت میری عمر صرف نو سال تھی اور میرے بھائی کی عمر سات سال۔ میری دادی ستّر سال کی عمر کو پہنچ چکی تھیں اور بیٹے کی موت کے غم میں ان کی دُنیا اندھیر ہو چکی تھی، اسی طرح نصر اللّٰہ بیگ خاں کی بہنیں بھی اس ناگہانی آفت کی وجہ سے دِل گرفتہ اور مغلوبِ جذبات تھیں؛ چنانچہ ہم میں سے کوئی اس قابل نہیں تھا کہ نصر اللّٰہ بیگ خاں کی چھوڑی ہوئی املاک و جائداد کو سنبھال سکتا اور نہ ہی کوئی اس قابل تھا کہ جنرل موصوف کی خدمت میں حاضر ہو سکتا اور اپنا حال بیان کر سکتا۔[41]

بنا بریں سپہ سالارِ سرکارِ انگلشیہ نے آفتاب کے خوں بہا کے طور پر ہم فقیروں کے کلبۂ تاریک کے لیے چراغ اور ہم بے نواؤں کے لیے جاگیر کے عوض میں مشاہرہ مقرر کیا اور فکرِ معاش اور خارِ خارِ جستجو سے فراغ بخشا۔[42] [لیکن] ایک شخص خواجہ حاجی نے، [جو] نصر اللّٰہ بیگ خاں کے گھرانے کا ایک ملازم تھا، میدان کھلا پایا تو اس نے بے اصول حاشیہ نشینوں اور طفیلیوں کے ساتھ دوستانہ مراسم بڑھائے اور نصر اللّٰہ بیگ خاں کے سارے مال و متاع، فرنیچر، خیمہ، خرگاہ، اونٹوں اور پالکیوں وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور ستّر اسّی سواروں، ایک ہاتھی، مذکورہ بالا لاؤ لشکر اور سامانِ حرب کے ساتھ چل پڑا اور نواب احمد بخش خاں سے جا ملا۔ چونکہ [میرے چچا] نصر اللّٰہ بیگ خاں، نواب احمد بخش کے [بہنوئی] تھے اور ظاہر ہے کہ ہر شخص ان کے [خاندان] اور عزیز و اقارب سے واقف تھا، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ نواب احمد بخش خاں، خواجہ حاجی کو نصر اللّٰہ بیگ خاں کا وارث و جانشین اور رشتہ دار سمجھ بیٹھتے؛ خصوصاً اس لیے بھی کہ نصر اللّٰہ بیگ خاں کی اہلیہ، جو احمد بخش خاں کی [بہن] تھیں، اپنے شوہر [کے انتقال] سے پہلے ہی وفات پا چکی تھیں اور ان کی کوئی اَولاد نہیں

(**41**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 25-26۔ انگریزی متن: حوالۂ مذکور، انگریزی حصہ، ص 18 (**42**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 134-135۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 503

تھی، لیکن صرف یہ خیال کر کے کہ اپنے تمام سواروں، ہاتھیوں، لاو لشکر اور طاقت کے ساتھ حاجی ایک قیمتی اثاثہ ہے، نواب احمد بخش نے اسے اپنے دوستوں میں شامل کر لیا اور اسے اپنی جگہ چھوڑ کر وہ خود لارڈ لیک صاحب بہادُر سے ملاقات کے لیے کانپور چلے گئے۔ اُسی زمانے میں فیروزپور جھرکہ، پوناہانا، نگینہ سانکرس اور دوسرے اضلاع حکومت نے بیس یا تیس ہزار روپے سالانہ معاوضے پر احمد بخش خاں اور ان کے وارثوں کو دائمی قبضے پر دے دیے۔ احمد بخش خاں اور ان کے وارثوں پر لازم قرار دیا گیا کہ وہ یہ رقم [نصراللہ بیگ خاں مرحوم کے وارثوں کو] باقاعدگی سے ادا کرتے رہیں، تاہم [نواب احمد بخش خاں] نے جنرل موصوف سے درخواست کی کہ میرے [بہنوئی] نصراللہ بیگ خاں کا، جو سونک اور سونسا کے جاگیر دار تھے، انتقال ہو گیا ہے اور اپنے پیچھے بہت سے عزیز و اقارب اور پچاس سوار چھوڑ گئے ہیں، اگر حکومت اس رقم کی مجھے ادائیگی کرنے دے اور طے کر دے کہ یہ رقم نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کی گزراوقات کے لیے ہو گی تو وہ بے نصیب محتاج و مفلس لوگ مملکت کی خوش حالی اور فلاح و بہبود کے لیے ساری زندگی دست بدُعا رہیں گے اور پچاس سوار ہمیشہ میری سپردگی میں رہیں گے اور جب بھی حکومت انھیں بجا آوریِ خدمات کے لیے طلب کرے گی تو انھیں ہمہ وقت تیار پائے گی۔[43]

جنرل صاحب بہادُر نے اس درخواست کو منظور کر لیا اور اس کی ایک رپورٹ کلکتہ ارسال کر دی، جہاں گورنر جنرل صاحب بہادُر نے بھی اس کی منظوری دے دی؛ چنانچہ گورنر جنرل صاحب بہادُر نے [4/ مئی 1806ء[44] کو] احمد بخش خاں کے نام ایک پروانہ جاری کر دیا، جس میں نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کی پرورش و کفالت [کے لیے دس ہزار روپے[45]] اور [پندرہ ہزار روپے کے عوض[46]] مقررہ پچاس سواروں کی خدمات مہیا کرنے کی شرط کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ جنرل صاحب بہادُر کو احمد بخش خاں کی باتوں پر مکمل اعتماد تھا، اس لیے انھوں نے

---

(43) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 26-27۔ انگریزی متن: حوالۂ مذکور، انگریزی حصہ، ص 18-19 **(44)** بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 43۔ انگریزی متن: حوالۂ مذکورہ، انگریزی حصہ، ص 34 **(45)** بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 83۔ انگریزی متن: حوالۂ مذکور، انگریزی حصہ، ص 76 **(46)** بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 83۔ انگریزی متن: حوالۂ مذکور، انگریزی حصہ، ص 7619

نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے حقیقی احوال و حالات کے متعلق تفتیش نہیں کی، بلکہ ان کی درخواست پر خواجہ حاجی کے نام ایک پروانہ جاری کر دیا، جس میں بتایا گیا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کی گزر اوقات کے لیے جو وظیفہ اور پچاس سواروں کے لیے جو الاؤنس مقرر کیا گیا ہے، وہ احمد بخش خاں کو دی جانے والی جاگیر کے سمجھوتے کی شرائط میں شامل ہے اور یہ رقم ہمیشہ ان سے وصول کی جانی چاہیے۔ آخر کار جب احمد بخش خاں کانپور سے واپس میوات پہنچے، جہاں ان کی جاگیر تھی تو انھوں نے خواجہ حاجی کو ان کے ستّر اسّی سواروں کے دستے سمیت، جو نصر اللہ بیگ خاں چھوڑ گئے تھے، بر قرار رکھا اور دستے کو اپنی ملازمت میں لے لیا اور پھر اس کی مدد سے اپنے اضلاع کا بندوبست کیا۔ جب (نواب احمد بخش خاں) اپنی جائیداد کے بندوبست سے مطمئن ہو گئے اور جنرل صاحب بہادُر بھی یورپ واپس چلے گئے تو یہ دیکھتے ہوئے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے ہم دونوں بھتیجے ابھی ناسمجھ ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ [نصر اللہ بیگ خاں کی] ماں اور بہنیں گوشہ نشین اور بے علم ہیں، انھوں نے خواجہ حاجی کے ذریعے پہلے پچاس سواروں کے دستے کو برطرف کر دیا اور پھر اس وعدے اور اقرار کے ساتھ خواجہ حاجی سے جنرل صاحب بہادُر کے پروانے کا مطالبہ کیا کہ اگر وہ پروانہ حوالے کر دیں تو نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے گزر بسر کے لیے ملنے والے وظیفے میں وہ انھیں بھی ایک حصہ دار کی حیثیت سے شامل کر لیں گے۔ چونکہ وہ بدبخت اور بدقماش اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں اور نصر اللہ بیگ خاں کے ساتھ اس کی کوئی قرابت داری بھی نہیں، یہ سوچ کر نصر اللہ بیگ خاں کے خاندان کے ساتھ یہ تعلق اس کی خوش بختی کے لیے ایک نادر موقع ہے، اس نے [7/ جون 1806ء کو] پروانہ احمد بخش خاں کے حوالے کر دیا۔ احمد بخش خاں نے خواجہ حاجی کو چند روز اپنے ساتھ رکھا اور پھر برطرف کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ حکومت نے ان کی جاگیر سے پانچ ہزار روپے سالانہ کی جو رقم نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کی کفالت کے لیے مقرر کی تھی، اسے انھوں نے اپنی مرضی سے اس طرح تقسیم کیا ہے: مبلغ دو ہزار روپے سالانہ خواجہ حاجی کو، ایک ہزار پانچ سو سالانہ نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ کو اور ایک ہزار پانچ سو روپے سالانہ مجھے۔[47]

---

(47) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 27۔ انگریزی متن: حوالہ مذکور، انگریزی حصہ، ص 19-20

[1807ء میں] دس سال کی عمر میں موزونیِ طبع کے آثار مجھ میں ظاہر ہوئے، یہاں تک کہ شدہ شدہ 'دید و دانست' کا سرمایہ فراہم ہو گیا۔ زبان نے اندازِ گزارش اور قلم نے اسلوبِ نگارش کے آداب سیکھ لیے۔[48]

ایک دِن مثلِ پتنگِ کاغذی	لے کے دِل ، سر رشتۂ آزادگی
خودبخود کچھ ہم سے کنیانے لگا	اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
مَیں کہا ، 'اے دِل! ہَوائے دِلبراں	بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں
پیچ میں ان کے نہ آنا ، زینہار	یہ نہیں ہیں گے کسو کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر	کھینچ لیتے ہیں یہ ، ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ	لیکن آخر کو پڑے کی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہو گا سلجھانا تجھے	قہر ہے ، دِل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے	بھول مت ، اس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دِن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں	مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں'
دل نے سن کر ، کانپ کر ، کھا پیچ و تاب	غوطے میں جا کر ، دیا کٹ کر جواب
رشتۂ در گردنم افگندہ دوست	می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست[49]

بارہ برس کی عمر سے [مَیں] کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔[50]

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا، 'آتی نہیں کیوں اَب صدائے عندلیب'
بال و پر دو چار دِکھلا کر کہا صیاد نے
'یہ نشانی رہ گئی ہے اَب بجائے عندلیب'[51]

---

(48) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 320۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 735 **(49)** غالب 1996ء، ص 102 **(50)** خلیق انجم 1995ء، ص 1415 **(51)** غالب 1996ء، ص 104

[1810ء کے دَوران مَیں مولوی محمد معظم کے مکتب میں زیرِ تعلیم رہا۔[52] اسی دَوران میں، جب کہ ابھی میری عمر تیرہ برس تھی،]7/ رجب 1225ھ [9/ اگست 1810ء] کو [نصر اللہ بیگ خاں کے سسر نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی اور کہنہ مشق شاعر، الٰہی بخش خاں معروف کی گیارہ سالہ بیٹی امراو بیگم سے میرا نکاح کر کے] میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس صادر ہُوا۔ [یوں] ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زِنداں مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔[53]

ooo

مَیں نے ایامِ دبستاں نشینی میں **شرح مأتہ عامل** تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و طرب میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا، ناگاہ ایک شخص [عبد الصمد] کہ منطق و فلسفے میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موّحد و صوفی صافی تھا، [1226ھ بمطابق 1811ء میں] میرے شہر میں وارد ہُوا اور لطائف فارسی بحت اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی، اُس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا، ذہن معوج نہ تھا، حقیقت اس زبان کی دِل نشیں و خاطر نشاں ہو گئی،[54] [البتہ حقیقت یہ ہے کہ] فنِ شعر میں مجھے مبدأ فیاض کے سوا کسی سے شرفِ تلمذ حاصل نہیں۔ مَیں سوادِ معنی کو اپنے گوہرِ جاں کی رَوشنی سے فروغ بخشتا ہوں اور اس معاملہ میں میری گردن کسی کے بارِ منّت سے خم نہیں ہے اور نہ کسی کے احسان کا لبادہ میرے دوش پر ہے[55] اور عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھے لوگ بے استادا کہتے تھے، اُن کا مُنھ بند کرنے کو مَیں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے۔[56]

ooo

[دلّی نقل مکانی سے قبل اکبر آباد] مجھ ایسے مجنوں کی بازی گاہ رہا ہے اور ہنوز اس بقعۂ زمین کی ہر کفِ خاک میں میرے خونِ آرزو کا چشمہ بہہ رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اُس گُل زمیں میں

---

(52) بحوالہ کاظم علی خاں 1999ء، ص 18 (53) خلیق انجم 2008ء، ص 372 (54) خلیق انجم 1989ء، ص 743-744 (55) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 135۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 503 (56) بحوالہ حالی 1897ء، ص 14۔ اس میں شک نہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی، لیکن مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی، جب عبد الصمد اُن کے مکان پر وارِد ہُوا ہے اور کُل دو برس اُس نے وہاں قیام کیا؛ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اُس کی صحبت میسر رہی اور کس قدر ⇦

سواے 'مہر گیا' اَور کوئی سبزہ نہ اُگتا تھا اور شاخِ دِل کے سوا کوئی اَور شجر بارآور نہ ہوتا تھا۔ نسیم صبح گاہی اپنے خرامِ ناز اور روشِ مستانہ کے ساتھ اُس گُل زمین میں چلتی تھی تو والہانہ کیف و سرشاری کا دِلوں پر وہ عالم ہوتا تھا کہ پارسا، نیت غاز اور رِندانِ قدح خوار جرعۂ صبوحی کو بھول جائیں۔[57]

OOO

ابتداے فکرِ سخن [1812ء] میں بیدل واسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا، چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا:

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے[58]

[14/رجب 1231ھ بمطابق 11/جون 1816ء کو 239/غزلیات اور گیارہ رباعیات پر مشتمل اپنا دیوان خود اپنے قلم سے مرتب کیا،[59] جس کی پہلی غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے]:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

بس کہ ہوں، غالب! اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موے آتش دیدہ ہے، حلقہ مِری زنجیر کا[60]

OOO

جب مَیں جوان ہُوا تو مَیں نے دیکھا کہ [منشی شیونرائن آرام کے پردادا] منشی بنسی دھر، [میرے نانا خواجہ غلام حسین] خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے جو کٹھیم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اُس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ مَیں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت، آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر اُن کا بہت دُور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے، چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے

⇦ اُس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اُس کی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔ حوالۂ مذکور (**57**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 252۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 640 (**58**) خلیق انجم 1989ء، ص 846 (**59**) بحوالہ غلام رسول مہر 2015ء، ص 7 (**60**) غالب 1996ء، ص 112

اور اُن کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اُس کے ایک کھٹیاوالی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اَور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹرہ کہ وہ کشمیرن والا کہتا تھا، اُس کٹرے کے ایک کوٹھے پر مَیں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔[61]

OOO

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا، [جس کی کتابت حافظ معین الدین خوش نویس نے 5/ صفر 1237ھ بمطابق یکم نومبر 1821ء کو مکمل کی[62]]۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دُور کیا، اَوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔[63]

OOO

شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں؛ یہ تین آدمی، تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرح نصیب ہو۔ مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اُس کو مار رکھتے ہیں۔ مَیں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو مَیں نے بھی مار رکھا ہے۔ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے مَیں بیگانہ محض ہو گیا، لیکن اَب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُس کا مر نا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔[64]

درد سے میرے، ہے تجھ کو بے قراری، ہائے ہائے
کیا ہوئی، ظالم! تِری غفلت شعاری، ہائے ہائے
تیرے دِل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تُو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری، ہائے ہائے

---

(61) خلیق انجم 1990ء، ص 1054-1055 (62) بحوالہ غلام رسول مہر 2015ء، ص 7۔ کالی داس گپتا نے اس دیوان کو نسخہ بھوپال (بخطِ غالب) لکھا ہے۔ اس دیوان میں 239/ غزلیات اور 11/ رباعیات شامل ہیں۔ مشمولہ دیوانِ غالب کامل، ص 111-207 (63) خلیق انجم 1989ء، ص 846 (64) خلیق انجم 1989ء، ص 723

کیوں مِری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی ، میری دوست داری ، ہائے ہائے

عمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ، ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہَوائے زندگی
یعنی ، تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ، ہائے ہائے

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ، ہائے ہائے

شرمِ رُسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ، ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ، ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اِک لگنے نہ پایا زخم کاری ، ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال؟
ہے نظر ، خوکردۂ اختر شماری ، ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا ، غالب! ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دِل میں جو کچھ ذوقِ خواری ، ہائے ہائے

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتا ، اسد!
میری ، دلّی ہی میں ہونی تھی ، یہ خواری ، ہائے ہائے[65]

---

(65) غالب 1996ء ص 259

عالمِ جوانی میں جب میرے کالے بالوں سے زیادہ میرا چہرہ میرے اعمال کی وجہ سے سیاہ تھا اور پری رُخوں سے محبت کا سودا میرے سر میں سمایا تھا، زمانہ میرے ساغر کو بھی اس زہرابِ بلا سے پُر رکھتا تھا اور دوست کے جنازہ کی رہ گزار کے غم آثار نظارے نے میرے صبر و ثبات کو بھی غبارِ راہ کی طرح بکھیر دیا تھا۔ کتنے روزہائے رَوشن مجھ پر ایسے بھی گزرے کہ مَیں اپنے محبوب کے غم میں سیہ پوش اور پلاس نشین رہا اور کتنی سیاہ راتیں ایسی بھی آئیں کہ مَیں اپنی خلوتِ غم میں پروانے کی طرح شعلہ در آغوش اور شمعِ خاموش کی طرح اشکبار تھا۔ وہ میری ہم خوابہ، جسے رشک کی وجہ سے مَیں وقتِ وداع خدا کو بھی نہ سونپ سکتا تھا، زمانے کا اَب مجھ پر یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ مَیں اس کے تنِ نازنین کو خاک کے سپرد کر دوں۔ میری وہ محبوبۂ دِل نواز، جسے نگاہِ نرگس کی چشم زخم کے ڈر سے گل گشتِ چمن کی دعوت بھی نہیں دی جا سکتی تھی، وقت کی ستم ظریفی کہ اس کی نعش کو مَیں گورستان لے جاؤں۔ معشوق کا عاشق کی ہمدمی میں جاں دینا اگرچہ وہ ایک عمر کی جاں فشانی کے بعد ہو، پھر بھی جنھوں نے کبھی دِل دیا ہے، یہ بات ان سے چھپی نہیں کہ یہ بھی کتنی بڑی مہرپروری و مہربانی ہے۔ اس معشوقِ وفا شعار کی کیا بات کہ جس نے تلافی کا درجہ اندازۂ بایست سے بڑھا دیا اور اپنے عشوۂ طنّار سے جس کا دِل لے لیا، اسی کی محبت میں اپنی جان بھی دے دی؛ اس کے باوجود کہ دوست کی موت کا غم جگر گداز ہے اور دائمی جدائی کا صدمہ جاں کاہ۔[66]

OOO

[3/ مئی 1823ء کو نواب احمد بخش خاں قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہو گئے۔[67]]

OOO

مَیں نے ہر ممکن طریقے سے اپنے دعاوی کا مسئلہ اُٹھانے کی کوشش کی اور وقتاً فوقتاً کبھی تحریری اور کبھی زبانی اپنا مقدمہ [نواب] احمد بخش کے سامنے پیش کیا اور ان سے عرض کیا کہ جنابِ عالی! آخر کون سا محرک ہے، جس نے آپ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ آپ نے ایک اجنبی کو عزیز و اقارب کے زمرے میں شامل کر لیا اور ایک حقیقی بھتیجے [مرزا یوسُف علی] کو اس زمرے سے خارج کر دیا؟ اگر آپ خواجہ حاجی کے کاموں سے بہت خوش ہیں تو اسے اپنی جیبِ خاص سے

(66) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 246-248۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 655 (67) بحوالہ کاظم علی خاں 1999ء، ص 19

دیں یا نصر اللہ بیگ خاں کے دستے میں سے دو تین سواروں کا وظیفہ ان کے لیے مقرر کر دیں۔ اس کے کیا معنی ہوئے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے وظیفے میں سے خواجہ حاجی کو تنخواہ دی جا رہی ہے۔ احمد بخش خاں مجھے خط کے ذریعے بھی جواب دیا کرتے تھے اور اپنے دعوے کے حق میں جھوٹی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے، 'مَیں کیا کر سکتا ہوں؟ مَیں عزت مآب جنرل صاحب بہادُر کو بتا چکا ہوں کہ خواجہ حاجی، نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب میں شامل نہیں اور میری غلطی سے ان کا نام سرکاری ریکارڈ میں درج کیا جا چکا ہے'۔ [مجھ سے کہتے کہ] اَب مجھے ذلیل و رسوا نہ کرو اور چند روز صبر کرو، خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد مَیں یہ دو ہزار روپے تم دونوں بھائیوں کو دیا کروں گا۔ چونکہ احمد بخش خاں دو طرح سے میرے بزرگ اور عزیز تھے: اوّل اس طرح کہ میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں ان کے [بہنوئی] تھے، دوسرے یوں کہ مَیں ان کے بھائی الٰہی بخش خاں کا داماد تھا۔ ان واقعات و حالات کے بارے میں مَیں نے احمد بخش خاں کی بزرگی اور ان کے ساتھ قرابت داری کا احترام کیا اور خود بھی اپنے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی اذیت کو خاموشی سے برداشت کر لیا، [بلکہ] مَیں نے اپنے بھائی [مرزا یوسُف علی] کو بھی باز رکھا کہ وہ بھی اپنی شکایات کا اظہار نہ کرے اور نہ ہی حکومت سے دادرسی کا طالب ہو۔ اس طرح ایک زمانہ گزر جانے کے بعد [1825ء میں[68]] خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا۔ مَیں نے سوچا کہ اس سال کی آمدنی مجھے ملے گی، لیکن جب تنخواہ تقسیم ہوئی تو احمد بخش خاں کی ریاست سے دو ہزار روپے کی رقم فوراً خواجہ حاجی مرحوم کے بچوں [شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدرالدین خاں عرف خواجہ امان[69]] کو ادا کر دی گئی۔[70]

OOO

[اکتوبر 1825ء میں میرا بھائی مرزا یوسُف علی بیگ خاں دیوانہ ہو گیا۔[71]]

❑❑❑

(**68**) بحوالہ کاظم علی خاں 1999ء، ص 19 (**69**) بحوالہ مالک رام 1976ء، ص 54 (**70**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 27-28۔ انگریزی متن: حوالہ مذکور، ص 21-22 (**71**) بحوالہ کاظم علی خاں 1999ء، ص 19

(2)

اندازِ گفتگو کیا ہے؟

(1826ء-1828ء)

مایوسی کے عالم میں مَیں احمد بخش خاں کے پاس فیروز پور گیا اور ان سے کہا کہ آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جو لوگ قانونی طور پر مستحق ہیں، ان کے حقوق بحال کر دینے چاہییں یا پھر مجھے اجازت دیں کہ مَیں اپنا مقدمہ حکومت کے سامنے پیش کروں۔ اُس وقت وہ اپنے بستر سے اٹھ بیٹھے، جس پر وہ زخمی ہو جانے کی وجہ سے لیٹے ہوئے تھے اور الور کی مختاری نکل جانے کے باعث بڑے دِل شکستہ تھے۔ انھوں نے سسکیاں بھر بھر کر میرے سامنے رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے، 'برخوردار! تم میرے بچے اور میری آنکھوں کا نُور ہو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ مَیں زخمی بھی ہوں اور بے در بھی ہو چکا ہوں اور فریب سے مجھے اپنے واجبات سے محروم کر دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ [میجر] جنرل آکٹر لونی سے نہ میری دوستی رہی ہے اور نہ پہلے جیسے پُر تپاک مراسم۔ کچھ دِن اَور انتظار کر لو، تمھارے تمام کے تمام حقوق بحال کر دیے جائیں گے'۔ بعد میں جنرل آکٹر لونی [ریزیڈنٹ دہلی] کا انتقال ہو گیا اور [ان کی جگہ] سر چارلس مٹکاف کی آمد کا اعلان ہُوا۔ احمد بخش خاں نے مجھ سے بہت سے وعدے کیے اور کہا، 'خاموش اور مطمئن رہو، جب سر چارلس مٹکاف آئیں گے تو مَیں تمھارا ان سے تعارُف کرواؤں گا، تفصیل سے تمھارا مقدمہ ان کے سامنے پیش کروں گا اور بتاؤں گا کہ حکومت کے ساتھ تمھارے چچا کے تعلقات و مراسم کی نوعیت کیا تھی اور مستحق کو اس کا حق دلاؤں گا۔ مَیں تم پانچوں کے نام حکومت کی جانب سے سند بنواؤں گا، تاکہ میرے انتقال کے بعد میرے بچے [نواب شمس الدین احمد خاں، نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد

خاں] تمھاری گزر اوقات کے لیے مقرر تنخواہ ادا کرنے میں نہ تو کوئی لیت و لعل کر سکیں اور نہ ہی کوئی دشواری پیدا کر سکیں۔[1]

○○○

اس رنجِ بے دِلی کا کوئی علاج بھی میری نظر میں نہیں اور اس کا انجام کیا ہو گا، یہ کوئی نہیں جانتا۔ ظاہر ہے کہ جو طائر قفس سے نکل کر پھر جال میں پھنس گیا ہو، اس کا اس کے علاوہ اَور ہو بھی کیا سکتا ہے اور جس ناخن میں کیل ٹھونک دی گئی ہو، اس سے کیا گرہ کشائی ہو گی۔ وطن [دہلی] سے دُوری، عزمِ سفر اور عالمِ غربت کا آرام ایک خواب ہے کہ خدا نہ کرے، کسی متنفس کے حصے میں آئے۔ اگرچہ مَیں وطن میں نہیں ہوں، لیکن وطن سے قریب [فیروز پور جھرکہ میں] ہونا بھی قیامت سے کچھ کم نہیں۔ اَب تک اہلِ کاشانہ کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہے، لیکن [قرض خواہوں کے تقاضوں کے پیشِ نظر] جو کچھ دیکھنے میں آتا ہے، وہ آشوبِ چشم کا درجہ رکھتا ہے اور جو سننے کو ملتا ہے، وہ زحمتِ گوش کے علاوہ اَور کیا ہے۔ مَیں مَوج کے ان تھپیڑوں سے، جو نیم جاں لے کر باہر آیا ہوں، شاید خاکِ فیروز پور کی امانت ہے کہ مجھے بہ جبر و اکراہ اس قیام پر راضی ہونا پڑا۔ اپنی موت، جو مَیں ہزار آرزو کے ساتھ خدا سے چاہتا ہوں، شاید اس کے لیے سرزمینِ موعود یہی فیروز پور ہے، لیکن بوجہ اُفتادگی یہاں کے قیام میں درنگ واقع ہو رہی ہے۔ نواب معلّی القاب [احمد بخش خاں] کی سعادتِ ورُود کی خبر سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے، اس سے میرے مدعا کے پورے ہونے کی کوئی راہ نہیں نکلتی۔ یہ بات کہیں سے سننے میں نہیں آتی کہ نواب صاحب اس عرصہ میں رونق فزائے فیروز پور ہوں گے۔ دلِ مضطر کو کسی طرح تسکین نہیں ہوتی۔ جو دوست کہ نواب صاحب کی رکاب میں ہیں، ان میں سے وہ مہربان، جو اسد نوازی اور غالب پروری میں پیش پیش اور منصف مزاج ہیں، ان کا یہ حال ہے کہ وہ تنگنائے اضطراب میں پھنسے ہوئے اس درماندۂ راہ کو کبھی سلام سے بھی یاد نہیں کرتے تو [ان حالات میں] ورُودِ سعادت کی خبر تک بات کیسے پہنچے۔ ستم کشی کی طاقت ختم ہو گئی اور انتظار اپنی حد سے گزر گیا۔ میری مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو میدانِ کارزار میں اپنے پیر پر کاری زخم لگ جانے کی وجہ سے نہ حریف کے سامنے سے گریز و فرار

(1) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 28-29۔ انگریزی متن: حوالہ مذکور، انگریزی حصہ، ص 22

کی راہ اختیار کر سکتا ہے اور نہ دشمن سے مقابلہ و مقاتلہ کی تاب لا سکتا ہے۔ میری طبیعت بے طرح متوحش ہے اور اپنے سے بیزار اور دِل کہ صدہا تشویشوں میں مبتلا ہے، اس کی بے قراری حد سے بڑھ گئی ہے۔[2]

[سر چارلس مٹکاف] کی آمد کے بعد چونکہ بھرتپور [میں مہاراجا بلونت سنگھ کی خود اپنے ماموں دُرجن سال کے ہاتھوں قید و بند[3]] کا معاملہ ان کی توجہ کا مرکز بنا ہُوا تھا اور وہ راجا کی امداد اور بھرتپور میں باغیوں کی گوشمالی کی جانب اپنی ساری توجہ مبذول کیے ہوئے تھے، اس لیے احمد بخش خاں نے کہا کہ مجھے اس سفر میں اُن کے ساتھ جانا چاہیے۔ باوجودیکہ مَیں اُس زمانے میں اپنے بھائی کی علالت اور قرض خواہوں کے سخت تقاضوں کی وجہ سے اذیت ناک پریشانی میں مبتلا تھا اور بالکل اس سفر کے قابل نہیں تھا، اس امید پر کہ موصوف (مٹکاف) کی طرف سے جو فرضِ منصبی مجھ پر عائد ہوتا ہے، وہ ادا ہو جائے گا؛ مَیں نے اپنے بھائی کو بخار اور ہذیانی حالت میں چھوڑا، چار آدمی اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت پر مقرر کیے، کچھ قرض خواہوں سے وعدے وعید کر کے انھیں راضی کیا، دوسروں سے چھپتا چھپاتا اور بھیس بدل کر کسی قسم کی سہولت کے بغیر بمشکل تمام احمد بخش خاں کے ساتھ بھرتپور روانہ ہو گیا۔ بھرتپور کی فتح کے بعد مَیں نے احمد بخش سے بات کی، تاہم انھوں نے اَب بھی سر چارلس مٹکاف سے میرا تعارُف نہیں کروایا۔ اُسی زمانے میں ان کے چہرے پر فالج کا حملہ ہُوا، لیکن ڈاکٹر ڈنکن کے بہترین علاج سے بالآخر انھیں شفا حاصل ہوئی اور وہ فیروزپور واپس آ گئے۔ سر چارلس مٹکاف نے اگرچہ فیروزپور میں تین روز قیام کیا اور مَیں تینوں دِن روزانہ احمد بخش خاں سے التجائیں کرتا رہا، لیکن انھوں نے میرا تعارُف ان سے نہ کرانا تھا اور نہ کروایا۔[4]

مَیں اس انتظار کی آگ میں جلتا رہا ہوں اور اس عذاب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے بیٹھا ہوں۔ یہ وہ دُکھ ہے، جو گوشۂ زِنداں میں کسی مجرم کے حصے میں بھی نہیں آتا اور وہ دیکھ رہا ہوں، جو کوئی کافر جہنم میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ مَیں فیروزپور اس لیے نہیں آیا تھا کہ پھر یونہی بے نیل و مرام دہلی واپس ہو جاؤں۔ نواب [احمد بخش خاں] صاحب نے مجھے بہت طفل تسلیاں دیں اور وہ

---

(2) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 63-65۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 531-532 (3) بحوالہ مالک رام 1976ء، ص 57 (4) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 29۔ انگریزی متن: حوالہ مذکور، ص 22-23

اندازِ ستم رَوا رکھا، جو التفات معلوم ہوتا تھا۔ اس سلوک نے مجھے گمراہ کیا۔ اَب اس پر تا بکے صبر کروں اور اس 'ناہوت' میں کب تک خوش رہوں۔[5]

جب (سر چارلس مٹکاف) دہلی چلے گئے تو مَیں نے احمد بخش خاں سے وابستہ اپنی تمام امیدیں ختم کر دیں اور اپنے دِل میں کہا، انصاف پسند حکمران اپنے حمایتیوں میں سے ہر ایک کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، اس لیے کیا ضرورت ہے کہ مَیں اس کام کے لیے احمد بخش خاں کے وسیلے اور اعانت کا سہارا لوں۔ بہتر یہ ہے کہ کسی اَور کو بیچ میں ڈالے بغیر خود سر چارلس مٹکاف سے ملوں اور اپنا سارا احوال شروع سے آخر تک، بلا کم و کاست ان کی خدمت میں پیش کروں، تاہم قرض خواہوں کے تقاضوں کے خوف نے میرے لیے یہ ناممکن بنا دیا کہ مَیں دہلی جاؤں۔ علاوہ اپنی نیک نامی کے خیال سے کہ اسے بٹہ نہ لگ جائے، مَیں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔[6]

سفر اور اقامت کے مابین تذبذب کے لمحے گزار رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ نقشِ مدعا رَسائی پا جائے اور میری خواہش پوری ہو جائے؛ لیکن بازی گاہِ خیال کا ہنگامہ درہم برہم ہو گیا اور بختِ رم خوردہ نے یاوری نہ کی۔ مقدمہ کی شروعات بڑی دِل فریب تھی، مگر درمیان میں پہنچ کر وہ صورت باقی نہ رہی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اواخر نادیدہ رہ گیا، ورنہ معلوم نہیں، کیا کیا دیکھنا پڑتا۔[7]

OOO

مَیں اپنی ہمت کو سراہتا ہوں کہ اس دَورِ آشفتگی میں سوائے فرماں روائے اودھ کے آستانے کے مَیں نے کسی اَور کی چوکھٹ پر سر نہیں جھکایا اور اس جستجو میں بجز خانِ رفیع الشان کی طرف رجوع کرنے کے، کسی اَور کا احسان نہیں لیا،[8] [چنانچہ] میر امام علی کو مَیں نے اپنی عرضداشت کے ساتھ نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا ہے۔[9] [کاش] یہ عرضداشت شرقستانِ اودھ کے آصف ثانی کی نگاہِ قبول سے فروغ پائے اور یہ قصیدہ ان کی بزمِ بہشتِ آئین میں پڑھا

---

(5) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 49-50۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 432 (6) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 29-30۔ انگریزی متن: حوالہ مذکور، انگریزی حصہ، ص 23 (7) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 65-66۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 533 (8) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 56۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 456 (9) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 50۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 432

جائے۔[10] اگر میرے مخدوم[مولوی کرم حسین خاں، سفیر شاہِ اودھ] کو بیکس نوازی کا خیال ہے تو شاہی عرضداشت کے ساتھ اس قطعے کو بھی شامل کر دیں[گے] اور جو کچھ اس نامہ نگار کے بارے میں مناسب تصور فرمائیں، وہ بھی لکھ دیں[گے]، تاکہ مَیں بادشاہ کی نگاہ میں ذی وقار بھی ہو جاؤں اور صلہ و انعام سے بھی نوازا جاؤں۔ میرا ممدوح صاحبِ خلقِ عظیم ہے اور اس آرزومندی میں میرا واسطہ ایک ایسے کریم النفس شخص، مولوی سید کرم حسین خاں سے ہے، جو اسد اللہ کے ساتھ سوائے کرم کے، اَور کوئی سلوک نہیں کر سکتا۔[11] چونکہ بے سروسامانی، حصولِ مدعا اور مدعا طلبی میں مانع ہے اور [کلکتہ کا] راستہ بغیر توشے کے طے نہیں کیا جا سکتا اور جب تک راستہ طے نہیں کیا جائے، منزل پر پہنچنا ممکن نہیں (اور) ہر ایک کے سامنے بھیک کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا جا سکتا، چار وناچار خواہش ہے کہ اس آئینِ خرد کی کوئی کنڈی ہلائی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس قصیدہ سرائی کے معاوضے اور ثناخوانی کے صلے میں مجھے اس قدر سرمایہ بہم ہو جائے کہ اپنی جمع آوری کے بعد کلکتہ جا سکوں اور کوئی کام کر سکوں۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور کام کی گھڑی گزری جا رہی ہے۔[12]

❍❍❍

مَیں نے صرف اتنا ہی سنا ہے کہ وہ ابیات [نواب غازی الدین حیدر کے] وزیر اعظم [نواب سید محمد خاں بہادُر آغا میر] کی انجمنِ ہمایونی میں پڑھے گئے۔ میرے ان ابیات کو جس طرح [سبحان علی] خانِ والا شان [نائب متعمد الدولہ] تک رسائی میسر ہوئی، اسی طرح اگر وزیر آصف نظیر [رَوشن الدولہ منیر الملک محمد حسین خاں وزیر دربارِ اودھ] تک یہ سخن پارے نہ پہنچے تو [نواب غازی الدین حیدر کی] بارگاہِ سلطانی تک ان کا پہنچ جانا معلوم۔ اس شکل میں میرا اندرانۂ کلام ایک قدم بھی کیسے آگے بڑھ سکے گا۔ جب [سبحان علی خاں] کی توجہ فرمائی اور مہربانی سے یہاں تک کام ہو گیا تو وہ مزید بہتری کی طرف رُخ کیوں نہ کرے اور یہ ارمغانِ شعر وزیر تک رسائی پا جائے تو بادشاہ کی نظر کیمیا اثر سے کیوں نہ گزرے۔[13]

❍❍❍

(**10**) تنویر احمد علوی 2016ء ص 56-57۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء ص 456 (**11**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص60-61۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص455 (**12**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص8۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص429 (**13**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص59-60۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص458

مَیں پا بہ رکاب ہوں اور اگلے دِن دشت آوارگی میں گام فرسا ہو جاؤں گا اور اتفاق یہ کہ میرا کوئی شہر کیا، کوئی مقام بھی معین نہیں ہے۔ ہر روز کسی نئی جگہ اور ہر رات کسی نئی بستی میں ہوں گا۔[14] ان ہی دِنوں گورنر جنرل کی آمد کی خبر عام ہوئی اور امکان یہ تھا کہ سر چارلس مٹکاف، گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ کی ہم رکابی کے لیے تشریف لائیں گے تو میرے دِل میں کانپور جانے اور وہاں سے ان کے خدم و حشم کے جلوس کے ساتھ واپس آنے اور راستے میں خود کو سر چارلس مٹکاف سے متعارف کرانے، اپنی عسرت و تنگ دستی کی ذلت بھری داستانِ بے چارگی اور قرض کا احوال ان کے گوش گزار کرنے اور انصاف حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس ارادے کے ساتھ مَیں [اوائل اکتوبر میں[15]] فیروزپور سے فرخ آباد اور کانپور کی جانب روانہ ہُوا۔[16] [اسی دَوران میرے سسر نواب الٰہی بخش خاں کا دہلی میں انتقال ہو گیا[17]]۔ [دوسری جانب] کانپور پہنچتے ہی مَیں بیمار پڑ گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہلنے جلنے کی طاقت بھی جاتی رہی۔ مجھے اس شہر میں کوئی مناسب طبیب نہ مل سکا۔ مجبوراً دریاے گنگا کو عبور کر کے کرایے کی ایک فینس میں لکھنؤ کی راہ لینا پڑی۔[18]

[26/ اکتوبر 1826ء کو سرکارِ انگریزی اور الور دربار کی منظوری کے بعد نواب احمد بخش خاں اپنی کفو بیاہتا بیوی بیگم جان سے دونوں بیٹوں نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں کے بجاے، میواتی حرم، مدّی بیگم سے اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کو 13/ اکتوبر 1826ء کو والی ریاست (فیروزپور جھرکہ) بنا کر خود گوشہ نشین ہو گئے۔[19]]

OOO

[مَیں نواب غازی الدین حیدر کے وزیرِ اعظم] معتمد الدولہ کے عہد حکومت کے اختتام پر لکھنؤ گیا[20] اور [وہاں] پانچ ماہ اور چند روز صاحب فراش رہا۔[21] رمضان بیگ ایک آزاد منش نے کہ جس پر میرے والد کا حق نمک واجب تھا اور جو اُن دنوں مجدّ الدولہ سید حسن خاں کے خوانِ کرم کا

(**14**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 55۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 466 (**15**) بحوالہ کاظم علی خاں 1999ء، ص 20 (**16**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 30۔ انگریزی متن: حوالۂ مذکور، انگریزی حصہ، ص 23 (**17**) بحوالہ کاظم علی خاں 1999ء ص 20 (**18**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء ص 30۔ انگریزی متن: حوالۂ مذکور، انگریزی حصہ، ص 23 (**19**) بحوالہ مالک رام 1976ء، ص 51 (**20**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 863۔ فارسی متن: کتابِ مذکور ص 954 (**21**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء ص 30۔ انگریزی متن: حوالۂ مذکور، انگریزی حصہ ص 23

ریزہ چیں تھا، جب میرے آنے کا سنا تو مجھ سے ملنے آیا اور آشتی و تواضع کی انتہا کر دی اور صلح جوئی اور آشنانوازی کے سبب اُس نام آور خوش خلق اور میرے درمیان محبت ہو گئی۔[22]

[نومبر 1826ء میں] مَیں نے گورنر جنرل کی آمد کی خوش کن خبر سنی اور ملاقات کے لیے شاہِ اودھ کے سفر [کانپور] کا حال سنا۔ اُن دِنوں مَیں اس قابل بھی نہ تھا کہ اپنے بستر سے اٹھ سکوں، کیونکہ لکھنؤ کی آب و ہَوا مجھے کبھی راس نہ آئی۔[23]

اعیانِ سلطنتِ لکھنؤ میرے ساتھ بڑی گرم جوشی سے پیش آئے اور جو کچھ حصولِ ملازمت کے باب میں قرار پایا، وہ 'خویشتن داری' کے اصول کے خلاف اور شیوۂ اخوان پرستی کے تئیں باعثِ ننگ تھا۔ جو کچھ اس شہر میں اس سلطان صورت امیر کے بارہ میں سننے میں آتا تھا، حق یہ ہے کہ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ابتداے کار میں جس شخص کو اپنی مقصد برآری کے لیے اس نے کارگزار تصور کیا، اس سے چپک گیا۔ لاجرم ایک دو آدمی اس سے متمتع ہوئے اور اَب کہ اپنی دولت کے استحکام کی طرف سے اس کی خاطر جمع ہے۔ وہ روپیہ بٹورنے میں لگا ہُوا ہے۔ لکھنؤ کے تمام قدیم خاندان اس بے رحم کی بیداد کی وجہ سے سیلابِ بلا کی نذر ہو گئے اور شہر کے ناز پرورد ہ اَب اِدھر اُدھر دوسرے شہروں میں دھکے کھاتے پھر رہے ہیں اور وہ خود اپنی طبیعت کے اسرافِ بے جا سے پشیمان اور اس شیوۂ پستی سے دِل تنگ اور برگشتہ خاطر ہے۔ بیدادگری کا بازار گرم ہے۔ مہاجن، ساہوکار اور تاجر خفیہ خفیہ یہاں سے اپنا زر و مال کانپور منتقل کر رہے ہیں کہ اس کے روپیہ سے مطمئن نہیں ہیں۔ جو تھا، وہ بھاگ گیا اور جو ہے، وہ بھاگنے کی فکر میں ہے۔[24]

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے، یہ شہر عزمِ سیر نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
طاقتِ رنجِ سفر بھی نہیں پاتے اتنی ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالب! جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو[25]

---

(22) پرتو روہیلہ 2015ء ص863۔ فارسی: حوالۂ مذکور ص954 **(23)** بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء ص30۔ انگریزی: حوالۂ مذکور، ص23 **(24)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص66۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص533 **(25)** غالب 1996ء، ص272

خدا کی لعنت مجھ پر کہ (مَیں نے) شہزادۂ ماہ لقا [نصیر الدین حیدر، ولی عہد شاہِ اودھ] کے حضور زمین بوسی کی آرزو کی اور وہ بھی [میر ولایت علی] کی وساطت سے۔ اس ہی دفعہ شہزادے سے نہیں ملا ہوں، بلکہ اس سے پہلے بھی دو بار نشیمن باسعادت میں گیا ہوں اور ہر دو بار (انھوں نے مجھے) فوراً باریابی بخشی ہے اور دیر تک بٹھایا ہے اور میری عزت افزائی کی ہے؛ لیکن اس بار شہزادے کے رویے کو فطری نہیں کہا جا سکتا۔ یقیناً میرے آنے سے پیشتر ہی اس بات کا فیصلہ کیا جا چکا تھا کہ تھوڑی دیر مجھے پاسبانوں کے ساتھ بٹھایا جائے اور جب تک کہ شہزادہ کو صندو قچے کے مشغلے میں نہ لگایا جائے، مجھے حضور میں نہ بلایا جائے اور جب سامنے آؤں، حضرت صاحب عالم اظہارِ التفات نہ کریں اور مجھے بیٹھنے کی اجازت نہ دیں؛ گویا کہ شہزادہ ایک ورقِ سادہ ہے کہ نقاشوں اور رنگ آمیزوں کے ہاتھ میں آ پڑا ہے، تا کہ رنگ رنگ کے ڈول ڈالیں اور طرح طرح کے نقش بنائیں۔ قصہ مختصر، تقریب اَور چیز ہے اور تخریب اَور۔ ہم [میر ولایت علی] سے مقرب (کا کردار) چاہتے تھے، نہ کہ مخرب کا۔ ہم شاہ پرستوں میں ہیں اور کشور کشاؤں کے دستِ تیغ آزما ہی سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں، (بھلا) زاویہ نشینوں سے ہمارا کیا تعلق اور رشتہ شکستگان سے کیا تعلق؟[26]

افسوس مجھ پر کہ مَیں نے یہ پانچ ماہ لکھنؤ توئی ٹولے میں خاک نشینی میں گزار دیے اور مجھے [مرزا تقی ہوس اور خواجہ حیدر علی آتش] کی قدم بوسی کا شرف حاصل نہ ہُوا،[27] [چنانچہ] ذیقعد کی 25 [1242ھ، جون کی 21] تاریخ کو مَیں جمعہ کے دِن اس ستم آباد [لکھنؤ] سے باہر نکلا۔[28]

ooo

[جون 1827ء کی] 29ر تاریخ کو دارالسرور کانپور پہنچا۔ دو تین مقامات سے ہوتا ہُوا بالآخر باندہ پہنچ جاؤں گا اور وہاں چند روز آرام کر کے، اگر خدا نے چاہا اور مرگ نے امان دی تو مَیں عازمِ کلکتہ ہو جاؤں گا۔ اگر میرے مدعا کے مطابق کام ہو جائے تو میرے عزم و ارادے کا کیا کہنا اور اگر میرا ہاتھ دامنِ مقصود تک نہ پہنچے تو مَیں کہاں؟[29]

---

(26) پرتو روہیلہ 2015ء ص 328۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 759 **(27)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 867۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 959 **(28)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 66۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 533 **(29)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 66-67۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 533

OOO

چونکہ میرے اور [میری ممانی کے بھانجے] نواب ذوالفقار علی بہادُر (باندہ) کے آبا و اجداد میں دوستانہ مراسم زمانۂ قدیم سے چلے آ رہے تھے اور میرے دِل میں بھی نواب بہادُر کے لیے بڑی محبت اور لگاؤ تھا، اس لیے مَیں نے ایسی تدبیریں شروع کر دیں کہ جس طرح بھی بن پڑے، مَیں بندیل کھنڈ میں باندہ پہنچ جاؤں، [چنانچہ جون کے اواخر یا اوائل جولائی 1827ء میں باندہ پہنچ گیا اور[30]] نواب صاحب کے دولت کدے پر چھ مہینے تک مقیم رہا۔ اللہ کے فضل اور نواب صاحب [ذوالفقار علی] کی توجہ اور تیمارداری کی بدولت مجھے اس خطرناک بیماری سے شفا حاصل ہوئی۔ اُس وقت تک موسمِ برسات گزر چکا تھا اور گورنر جنرل واپس کلکتہ جا چکے تھے۔[31]

بخار اور دردِ سر کا کوئی نشان باقی نہیں۔ اگر کمزوری کا کچھ اثر باقی بھی ہے تو فکرمندی کی کوئی بات نہیں کہ یہ وہ رفیقِ سفر ہے، جو شروع ہی سے ہمراہی پر کمربستہ ہے۔[32]

OOO

جمعرات کے دِن مودہ پہنچا، ہفتے (کے دن) تک آرام کرتا رہا، پیر کو وہاں سے کوچ کر کے، رات گاؤں میں گزار کر، منگل کو چلہ تارا پہنچا۔ خدا کا شکر ہے، سر درد اور بخار رخصت ہو چکے ہیں۔ آج رات چلہ تارا میں گزار کر اِن شاءاللہ کل صبح، بشرطِ زندگی، فتح پور کی تیاری کی جائے گی۔[33]

مَیں مودہ سے نکلا اور ایک بیل تانگہ، جس کو یہاں 'لڑھا' کہتے ہیں، بار کشی کے لیے کرایہ پر لیا۔ چونکہ وہ مجھ سے بھی زیادہ ضعیف الخلقت تھا، آہستہ خرام، بلکہ مخرام، دس بارہ کوس بھی راہ طے نہ کر سکا اور مودہا سے چلہ تارہ [چلہ گھاٹ ؟] تک اس کا پہنچنا مشکل ہو گیا۔ چار رات تک ایک گاؤں میں رُکنا پڑا۔ سہ شنبہ، آخرِ شب میں روانہ ہُوا اور مَیں خود دو پہر دِن چڑھے چلہ تارا کی ایک کارواں سرائے میں پہنچا اور یہ 'ہیچ مخرام' جب تک ایک پہر رات نہ گزر گئی، مجھ تک نہ پہنچ سکا۔[34]

OOO

---

(30) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص 42 **(31)** بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 30۔ انگریزی متن: حوالۂ مذکور، ص 23-24 **(32)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 73۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 545 **(33)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 132۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 557 **(34)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 73-74۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 545

اس مقام سے مَیں نے کشتی کرایے پر لی، بسم اللہ مجریہا و مرسہا کہا اور سفینہ کو رُودِ جمنا کے سپرد کر دیا۔ منظورِ خاطر یہ ہے کہ الٰہ آباد پہنچ جاؤں اور جو توقف مَیں بنارس میں کرنا چاہتا ہوں، وہ یہیں کر لوں۔ چند روز یہاں آرام کر کے اور سامانِ سفر بہم پہنچا کر یہاں سے آگے کا سفر اختیار کروں اور اس کے بعد مرشد آباد بنگالہ کے ماسوا اَور کہیں نہ ٹھہروں۔ کشتی بان کہتے ہیں کہ تین دِن کے عرصہ میں الٰہ آباد پہنچ جائیں گے۔[35] [بہر حال] آدمی اور چوپاؤں کے ساتھ اس میں بیٹھ کر، (درآں حالیکہ) معدے اور آنتوں میں ریاح بھر جانے کی وجہ سے سخت بے چین تھا اور دِل [قیاسی: گھبرا رہا تھا اور جسم] بخار کی تپش سے سلگ رہا تھا، ساتویں روز [27/ نومبر 1827ء کو] (الٰہ آباد کے) ویرانے میں پہنچے۔ افسوس الٰہ آباد! اس ویرانے پر خدا کی لعنت برسے کہ وہاں نہ تو بیمار کے لیے دوا ملتی ہے اور نہ کسی مہذب انسان کی ضرورت کی کوئی چیز دستیاب ہوتی ہے۔ [وفا؟] اس کے لوگوں میں نہیں اور محبت و حیا وہاں کے پیر و جواں میں نایاب ہے۔ اس ہولناک وادی کو شہر کہنا سراسر ناانصافی ہے اور بھوتوں کی بستی میں کسی انسان کا رہنا کیسی بے حیائی ہے۔ خدا کی قسم، اگر کلکتے سے واپسی پر الٰہ آباد کے راستے جانا پڑا (تو) وطن ترک کر دوں گا، پر ہرگز اس راستے [سے] واپس نہ جاؤں گا۔ غرضیکہ پورے ایک دِن رات بار برداری کا (انتظام) نہ ہونے کے جرم میں اس بھوت نگر میں گرفتار رہ کر دوسرے دِن جب کرایے کی بہلی ملی تو صبح سویرے گنگا کنارے پہنچ کر ہَوا کی طرح دریا عبور کر گیا اور پاے شوق سے جانبِ بنارس تیز گامی کی۔[36]

○○○

[اوائلِ دسمبر 1827ء میں] بنارس پہنچنے کے دِن بادِ جاں فزا اور نسیم آسا مشرق کی جانب سے چل رہی تھی اور جان کو توانائی اور رُوح کو بالیدگی دے رہی تھی۔ اس ہَوا کے اعجاز نے میری مٹھی بھر خاک کو فتح کے جھنڈے کی طرح بلند کر دیا اور اس ٹھنڈی ہَوا کی مستی نے میرے جسم کی ساری کمزوری رفع کر دی۔ کیا کہنے نواحِ بنارس کے کہ اگر اس کو فرطِ دِل نشینی کے سبب نقطہ قلبِ عالم کہوں تو بجا ہے اور کیا کہنے ہیں اس بستی کے جوانب کے کہ اگر اس کو فرطِ سبزہ و گُل کے

---

(35) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 74-75۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 546 (36) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 134۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 560

باعث رُوے زمین پر جنت جانوں تو جائز ہے۔ ہماری نظر میں اگر گنگا اس (بنارس) کے قدموں سے اپنا سر نہ رگڑتی تو اس تقدس کی اہل نہ ہوتی اور اگر سورج کا اس کے در و دیوار سے گزر نہ ہوتا تو وہ اس قدر فروزاں اور تابناک نہ ہوتا۔ اگر مَیں اس شہر کی، ایک سرے سے دوسرے سرے تک کی عمارات کی کثرت کا بیان کروں (تو گویا یہ) سراسر مستوں کے عبادت خانے ہیں اور اگر اس کی نواح کے سبزہ و گُل کی ایک فصل بھی پڑھوں (تو یوں لگے، جیسے) بیاباں در بیاباں بہارستان ہے۔[37] اس تماشا گاہ کی دِل فریبی کے وفور سے غمِ مسافت دِل سے محو ہو گیا ہے۔ (میرا) ذوقِ (حسن) بادۂ تماشا سے ایسا بدمست ہُوا کہ وارفتگی میں یادِ وطن (کی شمع) بجھا دی۔ (اگر) یہ اہم مقدمہ پیش نہ ہوتا تو بے درنگ دِین کو خیر باد کہتا اور تسبیح توڑ ڈالتا اور (ماتھے پر) قشقہ کھینچتا اور (گلے میں) زنّار ڈالتا اور اس ہیئت کے ساتھ گنگا کنارے بیٹھا رہتا، تاوقتیکہ مَیں ایک قطرے کی صورت دریا میں ضم نہ ہو جاتا۔ اس ارم آباد میں قدم رکھتے ہی بغیر کسی علاج کے اور بغیر کوئی دوا کھائے، نئے عوارض کی تکلیف جاتی رہی، بلکہ ایک حد تک اصل مرض میں بھی افاقہ ہو گیا۔ روزمرہ کے مرکبات میں سے جس قدر بھی فراہم ہو جاتے ہیں، وہ حفظ ماتقدم کے طور پر ہیں، ورنہ اَب نہ تو تلافیِ ماضی منظور ہے، نہ رعایتِ حال۔ (لیکن) یہ گمان نہ گزرے کہ غالب اپنی شوریدہ سری اور پریشاں نظری کے باعث بنارس میں شہد کی مکھی اور دلدل کے گدھے کی طرح پھنس گیا ہو گا؛ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھ جیسے فلک زدہ کے پاس کسی جگہ قیام کے لیے ساز و سامان کجا اور تفریح کے لیے دِل و دِماغ کہاں، یہ قیام تو مجھے (مجبوراً) اُن دواؤں کی فراہمی کی خاطر کرنا پڑا، جو اکثر میرے استعمال میں رہتی ہیں اور قدرے [وہ] سامان مہیا کرنے کے لیے، جس کی جاڑے میں ضرورت تھی۔ پانچ دِن سراے نیرنگ آباد میں ضائع ہوئے، جو 'سراے نَورنگ آباد' کے نام سے معروف ہے۔ اس کے بعد اسی محلے میں، اسی سراے کے پیچھے ایک مکان مل گیا، چنانچہ اسی مکان میں، جو بخیل کی قبر سے زیادہ تنگ و تاریک ہے، مَیں نے رختِ سفر کھول لیا ہے اور اُفتادگی کے بستر پر آ پڑا ہوں۔ دِل بے کسی و گمنامی کی شرم سے بے حد زخمی ہے کہ جس گوشے میں آ پڑا ہوں، یہ ایک بڑھیا

---

(37) پرتو روہیلہ 2015ء، ص135۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص560-561

کی کوٹھری ہے، جو خود روغنِ چراغ کی محتاج ہے اور اس کے خرابے کی پوچھ گچھ کرنے والا کوئی نہیں۔ نہ اس کے پہلو میں کوئی مشہور بازار ہے، نہ (ہی) اس کے قریب کوئی محل۔ کم از کم چار ہفتوں میں سے غفلت میں گزرا ہُوا یہ ہفتہ بھی ان ہی ایام میں شمار ہو گا۔ کبھی تو یہ خیال آتا ہے کہ عظیم آباد تک خشکی کے راستے جایا جائے اور وہاں سے کشتی کرایے پر لی جائے اور کبھی جی چاہتا ہے کہ یہیں سے دریا کے راستے چل دیا جائے۔[38]

OOO

آج جمعہ کا دِن، ماہِ رواں [جمادی الثانی] کی نو تاریخ [بمطابق 28/ دسمبر 1827ء]، مَیں رختِ سفر باندھ رہا ہوں۔ اگر رات خیریت سے گزر گئی تو کل بنارس سے روانہ ہو جاؤں گا۔ ناخدایاں خدا ناشناس نے بنارس میں کشتی کے سلسلے میں بدمعاملگی کی۔ مَیں جس کے پاس بھی گیا، اس نے کلکتہ تک سو روپیہ کرایہ طلب کیا اور پٹنہ تک بیس روپیہ سے زیادہ مانگا۔ اَب یہی نظر آتا ہے کہ مَیں گھوڑے پر سوار ہو کر اس بقعہ صحرا تک راہ طے کروں گا، لیکن کشتی کی خواہش ابھی میرے دِل سے نہیں نکلی۔ پٹنہ جا کر پھر جستجو کروں گا۔[39]

OOO

مَیں جب مرشد آباد پہنچا تو [میرے ایک دوست میر فضلِ مولیٰ خاں کی زبانی[40]] مجھے [نواب] احمد بخش خاں کے انتقال [اکتوبر 1827ء[41]] اور نواب شمس الدین احمد خاں کی جانشینی کی خبر ملی، لیکن چونکہ میرا دعویٰ احمد بخش خاں کے مؤقف سے متعلق تھا، لہٰذا مَیں نے سوچا کہ ان کی زندگی یا موت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔[42]

ہرچند کہ نواب صاحب کے جسمِ خاکی کے فنا ہو جانے سے نفسِ مقدمہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچتا ہے، پھر بھی مَیں از خود رفتہ دو کیفیات میں مبتلا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جو خطرہ مجھے مستقبل میں تھا، وہ آج ہی پیش آ گیا ہے، یعنی [بیگم کے چچازاد] بھائیوں کے سامنے

---

(38) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 136-137 فارسی متن: حوالہٗ مذکور، ص 562-563 **(39)** تنویر احمد علوی 2016، ص 75۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 546 **(40)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 52۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 433 **(41)** بحوالہ کاظم علی خاں 1999ء، ص 20 **(42)** بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 30۔ انگریزی متن: حوالہٗ مذکور، انگریزی حصہ، ص 24

دستِ سوال دراز کرنا۔ دوسرے یہ کہ (مستقبل کی) فتح کے بعد جس مسرت کا تصور تھا، وہ سراسر زائل ہو گیا، یعنی غاصبِ زبردست [نواب احمد بخش خاں] سے انتقام لینا اور پھر محفلوں میں اس پر ناز کرنا۔[43]

مَیں [نواب احمد بخش کے بھتیجے اور اپنے برادرِ نسبتی مرزا علی بخش خاں کی] طرف سے فکر مند ہوں [کہ انھیں ملنے والے سات سو روپے کے بارے میں نواب شمس الدین احمد خاں کیا فیصلہ کرتے ہیں] اور اندیشہ یہ ہے کہ اَب جو کچھ ہو گا، وہ [مرزا علی بخش خاں کے] حسبِ دِل خواہ نہ ہو گا۔ ناکسوں کی بن آئے گی اور نااہلوں کا دَور دَورہ رہے گا۔ خدا نہ کرے کہ یہ انجمن درہم برہم ہو جائے، ناکردہ کار و بدخواہ جمع ہوں، خوش بختی کنارہ کرے اور آسودگی رخصت ہو۔[44]

❑❑❑

(43) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 139۔ فارسی متن کے لیے: حوالۂ مذکور، ص 565 **(44)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 52۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 433

(3)

کلکتے کا جو ذکر کیا

(1828ء-1829ء)

بخت کی یاوری اور انفاسِ قدسی کی برکت سے گردباد کی طرح دوشِ ہَوا پر پرواز کرتے، جاڑوں کی ٹھنڈی ہَواؤں میں راتوں کو ٹھٹھرتے اور زمانے کے گونا گوں ستم سہتے ہوئے چہارم ماہِ شعبان [1243ھ بمطابق 20/ فروری 1828ء] کو مَیں واردِ کلکتہ ہُوا۔[1] مَیں ان ایزدی بخشائشوں پر ناز کرتا ہوں کہ اس اجنبی شہر پہنچ کر [مانک ٹولہ اسٹریٹ کی نکڑ پر کرائسٹ چرچ (Christ Church) کے عقب میں شملہ بازار میں[2]] مجھے ایک ایسا گھر مل گیا، جس میں ہر طرح کا آرام و آسائش ہے۔ یہ مکان کسی خاص جستجو اور زحمت گفتگو کے بغیر دس [چھ[3]] روپے ماہانہ کرایے پر مل گیا۔ دو روز مَیں نے آرام کیا کہ سفر کی تکان دُور ہو جائے۔[4] بعد ازاں کشتی میں سوار ہو کر ہگلی بندر کا رُخ کیا۔ نواب علی اکبر خاں طباطبائی سے لطفِ ملاقات کے باب میں مجھے اپنی خوش بختی پر تعجب ہُوا اور خود اپنے اوپر رشک آیا۔ خدا کی قسم! حوصلہ مندی اور گراں مائیگی میں ایسا بلند مرتبہ کوئی انسان احاطۂ بنگال میں نہ ہو گا۔ چونکہ پہلی ملاقات تھی، اپنے بارہ میں کوئی بات کیے بغیر دو تین ساعت وہاں بیٹھ کر اپنے غم کدے کی طرف واپس چلا آیا۔[5]

شہر کلکتہ ایک ایسا دیار ہے، جہاں ہر نوع کے ساز و سامان کی فراوانی ہے۔ جس کے ہنر مندوں کے لیے چارۂ مرگ کے سوا ہر طرح کے دُکھ درد کا مداوا آسان ہے اور خوش نصیبی کے علاوہ اس کے بازاروں میں ہر شے بہ افراط ملتی ہے۔[6]

---

(1) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 76۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 547 (2) بحوالہ مالک رام 1976ء، ص 63 (3) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 139۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 546 (4) تنویر احمد علوی 2016ء، ⇦

یہ اللہ پاک کی رحمتوں کے عجیب تر آثار میں سے ہے کہ آب وہَوائے کلکتہ مجھے پوری طرح موافق آگئی اور مَیں اس سے کہیں زیادہ آرام وراحت سے ہوں، جتنا کہ اپنے وطن میں ہوتا۔[7]

○○○

اسے ایزدی نوازشوں میں شمار کرنا چاہیے کہ مجھ جیسے ایک نووارد کو صاحبانِ والا شان اپنے دِل ونگاہ میں جگہ دیں اور اپنی انجمن میں وہ رتبۂ عالی عطا کریں، جو اس کی اپنی خواہشوں سے بھی کچھ فزوں تر ہو۔[8] [جب] مَیں مسٹر [سائمن] فریزر، جوائنٹ سیکرٹری سے ملنے گیا [تو] شائستہ طریقے پر ملاقات ہوئی، عطر وپان سے تواضع کی۔ اس خوش صفات افسر کی طرزِ ملاقات نے مجھے تازہ دَم اور توانا دِل کر دیا۔ مقدمہ کی عرضداشت، جسے گورنر جنرل بہادُر کی خدمت میں پیش ہونا ہے، دستور کے مطابق، صاحب سیکرٹری بہادُر کو سپرد کی گئی اور اسی محبت میں اسے صاحب سیکرٹری بہادُر نے پاٹن صاحب کے سپرد فرمادیا، تاکہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے آگے بڑھائیں۔ یہاں ایک دوسرے امیر [چیف سیکرٹری] اینڈریو اسٹرلنگ[9] کو میرے حال پر بہت رحم آیا۔[10] چونکہ یہ افسر بات کو سمجھنے اور لطفِ سخن تک پہنچنے میں بڑا اِدراک رکھتا ہے، مَیں نے اس کی شان میں پچاس اور پانچ بیت کا ایک قصیدہ لکھا ہے اور قصیدے کے آخر میں اپنا احوال بھی درج کیا ہے۔ قصیدے کا کچھ حصہ مَیں نے پڑھ کر سنایا؛ محظوظ ہُوا، میری دِل جوئی کی اور مجھ سے مدد کا وعدہ کیا۔ سائمن فریزر بہادُر اس افسر فرزانہ کا پیش دست وپیش کار ہے۔ جب دو تین مقدمے کونسل میں پیش کیے جانے کے لیے مہیا ہو جاتے ہیں،

سائمن فریزر بہادُر عرض گزاروں کے اسم ورسم کے بارے میں نگارشہ تیار کر کے اس کے ساتھ لگاتے ہیں؛ نیز وہ مقدمے سے متعلق قابلِ سماعت معروضہ کونسل میں پیش کرتے ہیں۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ میرا 'دادنامہ' کونسل کی سماعت وپیشی کے لائق قرار پایا۔[11]

⇦ ص 77۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 747 **(5)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 77۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 547 **(6)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 51۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 433 **(7)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 78–79۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 548 **(8)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 51–52۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 433 **(9)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 79۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 548 **(10)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 51۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 433 (11) ⇦

○○○

فدوی تین بار [نواب علی اکبر خاں طباطبائی سے ملنے] ہگلی گیا اور ان کی صحبت سے لطف اندوز ہُوا۔ ایک بار یہ کلکتے بھی تشریف لائے اور میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔ [اگرچہ] نواب صاحب صالح بھی ہیں اور مصلح بھی، لیکن ان میں مولوی محمد علی خاں والی بات نہیں کہ مجھ سے عاجز کے کام آئیں۔ خدا ان کا حافظ و ناصر ہو کہ عجیب مرنجانِ مرنج شخص ہیں۔[12]

○○○

مَیں نے کاغذات کی نقول حاصل کرنے کے لیے خصوصاً اور سرکار کے دفتر میں دستاویزات بطور شہادت پیش کرنے کی خاطر عموماً ایک عرضداشت پچھلے بیس سال کی چارہ جوئی اور فیصلوں کے خلاصے پر مشتمل ہے، لکھ لی ہے۔[13]

[شوال 1243ھ کی] تیرہ تاریخ [بمطابق 28/ اپریل 1828ء] اور پیر کا روز تھا اور یہ دربار کا دِن ہوتا ہے، جب تمام سُفرا اور وُکلا اور درخواست گزار [سائمن] فریزر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ فدوی بھی اپنے قطعۂ عرضداشت کے ساتھ، جو نواب گورنر (جنرل) کے نام تھا، حاضر ہو گیا اور اطلاع کے بعد حضوری کی اجازت پر ان کی خدمت میں حاضر ہُوا[14] [اور درخواست پیش کی، جس میں لکھا تھا کہ] فدوی سرکارِ عالی مقام کمپنی انگریز بہادُر دام اقبالہٗ کے متوسلین، پرورش یافتگان اور نمک خواروں میں سے فدوی کے سگے چچا نصراللہ بیگ خاں، اعلیٰ خوبیوں کے مالک جنرل لارڈ لیک صاحب بہادُر کے عہد میں سرکار کی طرف سے چار سو سواروں کے رسالے کا افسر اور سرکار کی جانب سے ایک لاکھ روپے کی جاگیر کا مالک تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے لواحقین کی پرورش کے لیے احمد بخش خاں جاگیر دار میوات کی جاگیر سے سرکار نے وظیفہ مقرر کیا۔ چونکہ مَیں اس رقم کے تعین اور احمد بخش کے طریقۂ تقسیم سے راضی نہیں ہوں، اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے خود کلکتہ آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ نواب والا القاب گورنر جنرل بہادُر کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کروں۔ صاحب ریزیڈنٹ شاہجہان آباد کی خدمت میں فدوی کے حاضر

⇦ تنویر احمد علوی 2016ء، ص 79-80۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 548-549 (**12**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 145۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 571 (**13**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 141۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 567 (**14**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 141۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 567

نہ ہو سکنے کے دو وجوہ ہیں: پہلی وجہ یہ ہے فدوی، احمد بخش خاں کی زیادتیاں برداشت کرتا رہا، پھر بھرتپور کی فتح تک احمد بخش خاں کے وعدے پر سفر سے دُور رہا اور کانپور چلا گیا۔ کانپور میں بیمار پڑ گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جن دستاویزات پر میرے دعوے کا انحصار ہے، ریزیڈنسی کے دفتر واقع شاہجہان آباد میں نہیں ہیں۔ ایک رپورٹ، جو احمد بخش خاں کی جاگیر اور سرکار انگریزی کی طرف سے اس پر زرِ استمراری کی معافی کے بارے میں والا مناقب جنرل لارڈ لیک صاحب بہادُر نے (1806ء) کو کلکتہ سے ارسال کی تھی، وہ بھی کلکتہ کے دفتر میں موجود ہو گی۔ چونکہ دہلی، کلکتہ اور ہندوستان کے جملہ شہر ایک ہی حکومت کے تابع ہیں، لہٰذا فدوی حصولِ انصاف اور کامیابی کی امید سے بے سروسامانی، بیماری اور ناتوانی کی حالت میں دو سو فرسنگ (چھ سو میل) کا فاصلہ طے کر کے اس داد گاہ تک پہنچا ہے اور اس مقدمے سے فدوی کا مقصد سرکارِ جہاں مدار کی خیر اندیشی اور حصولِ حمایت ہے، چنانچہ میری عرضداشت کے ملاحظے کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی۔ امید ہے کہ فدوی کی درخواست حضور سراپانُور کی پُربرکت نظر سے فیضیاب ہو گی۔ آپ کا اقبال اور حکومت کا سورج تاباں اور درخشاں رہے۔[15]

[سائمن] فریزر صاحب تعظیماً اٹھے اور مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ مختصراً مَیں نے شرحِ احوال کیا۔ جب مَیں نے اپنے چچا نصر اللّٰہ بیگ خاں کا نام لیا تو فرمایا، 'ہاں ہاں، انھیں تو ہم جانتے ہیں۔ تمھارا نصر اللّٰہ بیگ خاں سے کیا رشتہ ہے'؟ مَیں نے عرض کی کہ 'مَیں ان کا سگا بھتیجا ہوں'۔ مختصر یہ کہ وقت کی ضرورت کے مطابق، جو کچھ مفیدِ مقصد تھا، مَیں نے کہا۔ انھوں نے استفسار کیا، 'نواب گورنر کے لیے کوئی درخواست لائے ہو'؟ مَیں نے وہ قطعۂ درخواست گریبانِ قبا سے نکالا اور انھیں پیش کر دیا۔[16] [عرضداشت میں مَیں نے لکھا تھا کہ] نصر اللّٰہ بیگ خاں کے متوسلین میں پہلا وہ شخص تھا، جس کا نام خواجہ حاجی تھا، جو اٹھارہ انیس سال احمد بخش خاں کے توسط سے دو ہزار روپے سالانہ وصول کرتا رہا اور جو ابھی تک احمد بخش خاں کی جاگیر سے اس کے بچوں کو مل رہا ہے۔ اس کی تاریخ یہ ہے کہ نصر اللّٰہ بیگ خاں کے والدِ محترم قوقان بیگ خاں کے زمانے میں، ایک

---

(15) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص108-109 (16) پرتو روہیلہ 2015ء، ص141۔ فارسی متن: ص567

نوجوان خواجہ مرزا پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ پر اسپ سواروں کے دستے میں بطور بارگیر ملازم تھا۔ قوقان بیگ خاں کی اہلیہ، یعنی نصر اللہ بیگ خاں کی ماں کی ایک بیوہ بہن تھیں، جن کی ایک غیر شادی شدہ بیٹی تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ کسی دوسرے متوسل کی طرح اپنی بہن اور بھانجی کی کفیل اور محافظ تھیں۔ قوقان بیگ خاں نے اپنی بیوی کی بہن کی بیٹی کا عقد خواجہ مرزا سے کر دیا اور یہ خواجہ حاجی ان ہی کا بیٹا تھا۔ سوائے اس کے کہ خواجہ حاجی کی والدہ نصر اللہ بیگ خاں کی ماں کی بہن کی بیٹی تھیں، خواجہ حاجی اور نصر اللہ بیگ خاں کے والدین کے درمیان نہ کوئی قرابت داری یا تعلق تھا اور نہ ہے۔ نصر اللہ بیگ خاں کے جائز وارثوں میں ایک میری دادی، نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ تھیں، جن کے لیے احمد بخش خاں نے اپنی زندگی ہی میں پندرہ سو روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ وظیفہ ان کی بڑی بیٹی کو ملتا رہا، جو نصر اللہ بیگ خاں کی سب سے بڑی بہن ہیں اور یہ وظیفہ انھیں اَب بھی مل رہا ہے۔ وہ اپنی آمدنی اس طرح تقسیم کرتی ہیں کہ اس آمدنی کا ایک حصہ اپنی دو نوجوان بہنوں کو دے دیتی ہیں اور بقیہ رقم خود اپنی ضروریات پر خرچ کرتی ہیں۔ میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے اَور وارث، نصر اللہ بیگ خاں کے بھتیجے اور میرے بھائی یوسُف علی خاں المعروف مرزا یوسُف ہیں۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ احمد بخش خاں نے ان کے لیے ایک پھوٹی کوڑی بھی وقف نہیں کی اور اس بندوبست میں انھیں بالکل فراموش کر دیا۔ نصر اللہ بیگ خاں کا ایک اَور جائز وارث مَیں، آپ کا درخواست گزار، محمد اسد اللہ خاں المعروف مرزا نوشہ ہوں۔ احمد بخش خاں نے میرے گزارے کے لیے پندرہ سو روپے سالانہ مقرر کیے تھے۔ اس زمانے میں میرا بھائی دِماغی عارضے میں مبتلا ہو چکا تھا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے مجھے چھ سو روپے نکالنے پڑتے تھے اور میرے پاس قرض خواہوں کو ادا کرنے کے لیے نو سو روپے بچ رہتے تھے۔ میری شکایات کا لب لباب یہ ہے کہ حکومت نے احمد بخش خاں کو بیس بائیس [بیس یا تیس[17]] ہزار کی رقم واجب الادا ادائیگی سے اس لیے مستثنیٰ کیا، تاکہ نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کو دیے جاتے اور نصر اللہ بیگ خاں کے اسپ سوار دستے کی خدمات حاصل کرنے کے لیے خرچ کیے

(17) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، انگریزی حصہ، ص 27

جاتے اور یہ کہ احمد بخش خاں نے ایک شخص کے ساتھ مل کر، جو نصر اللہ بیگ خاں کا ایک ملازم تھا، اسپ سوار دستے کو فی الفور برطرف کر دیا اور بلا جھجک دستے کی خدمات اپنے لیے حاصل کر لیں اور یہ کہ نصر اللہ بیگ خاں کے خاندان کا وظیفہ موقوف کر کے صرف پانچ ہزار روپے کی رقم مقرر کی، جس میں سے دو ہزار روپے اس سے خواجہ حاجی کو اس کی اُن خدمات کے صلے میں دیے، جو اس نے نصر اللہ بیگ خاں کے اسپ سوار دستے کو برباد کرنے میں انجام دی تھیں اور تین ہزار روپے سالانہ نصر اللہ بیگ خاں کی ایک بہن اور ایک بھتیجے کو دیے، تا کہ یہ بات کہی جا سکے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے قرابت داروں کو وظیفہ مل رہا ہے۔ میرے مطالبے کا لب لباب یہ ہے کہ حکومت ہی میری سند، میری گواہ، میری سلامتی، میری شناخت اور میری طاقت و قوت کا سرچشمہ ہے۔ وہ ازراہِ مہربانی جنرل لارڈ لیک بہادُر کے زمانے کے کاغذات اور وہ رپورٹیں ملاحظہ کر لے، جو انھوں نے 1805ء سے 1806ء کے اختتام تک کلکتہ بھیجی تھیں۔ جیسا کہ میرے ادعا کے موجب خواجہ حاجی کی کارستانی اور نصر اللہ بیگ خاں کے سواروں کے دستے کی بربادی ثابت ہو چکی ہے، اس لیے وہ دو ہزار روپے یقیناً اس وظیفے کے حساب میں شامل نہیں کیے جائیں گے، جو نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے لیے مقرر کیے گئے تھے، نہ ہی حکومت کو وہ رقم شاملِ حساب کرنی چاہیے، جو اسپ سوار دستے کے لیے رکھی گئی تھی، کیونکہ اس کے لیے گھوڑوں اور سواروں کی موجودگی ایک ضروری شرط تھی، لیکن جب گھوڑوں اور سواروں کا کوئی وجود ہی نہیں تو حکومت کا ان کے لیے کوئی بھتہ مقرر کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ حکومت کو احمد بخش کی جاگیر سے تقاضا کرنا چاہیے کہ وہ 1806ء کے آغاز سے اسپ سوار دستے کے لیے مقرر کیا گیا الاؤنس واپس کرے اور اسے سرکاری خزانے میں جمع کرائے، کیونکہ میرا اور میرے ساتھیوں کا اس روپے پر کوئی دعویٰ نہیں۔ نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کا وظیفہ کچھ بھی ہو، حکومت کو اس میں سے تین ہزار روپے سالانہ کے حساب سے منہا کر لینا چاہیے اور بقیہ رقم احمد بخش خاں کی جاگیر سے لینی چاہیے اور میرے بیانات کے مطابق اگر یہ ثابت ہو جائے کہ دو بھتیجے اور تین بہنیں نصر اللہ بیگ خاں کی وارث ہیں تو گزشتہ برسوں کی رقم پانچ افراد میں ان کے دعوؤں، استحقاق اور ان میں سے ہر فرد کی عسرت و مفلسی کے

مطابق تقسیم کر دی جانی چاہیے، تاکہ ہر ایک کو دہلی کے خزانے سے فرداً فرداً وظیفہ ملنے لگے اور ہم پانچوں ستائے ہوئے لوگوں کو ان کا حق دوبارہ حاصل ہو جائے۔[18]

چنانچہ ریزیڈنٹ کی عدالت سے پہلے رجوع نہ کرنے کا عذر تسلیم کر لیا گیا۔ چونکہ اگر یہ عذر قبول نہ ہوتا تو (فریزر صاحب کی عدالت میں) میری درخواست منظور نہ ہوتی۔ پہلی مشکل ہی ایک خطرناک ٹیلہ اور خوفناک ڈگمگا دینے والی جگہ تھی کہ جس سے مَیں، بفضلِ خدا، خیر و خوبی سے گزر گیا اور درخواست منظور ہو گئی۔ رخصت کے وقت انھوں نے عطر دان اور پان دان منگوا کر دست خاص سے مجھے عطر اور پان عطا کیا اور کرسی سے سرو قد کھڑے ہو کر میرا اسلام قبول کیا۔[19]

OOO

میرزا یوسُف کو (دیوانگی کی وجہ سے اپنے جسم و جاں کا ہوش نہیں) مادر زاد ننگے رہتے، مجنونوں کی طرح چین سے ایک جگہ نہ بیٹھ سکتے، نہ ماں کو ماں (اور نہ بہن کو بہن) کہتے۔ ستائیسویں رمضان [12/ اپریل 1828ء] کو ایک خط دہلی سے پہنچا، مَیں نے جیسے ہی لفافہ کھولا، ایک کاغذ کے ٹکڑے پر نظر پڑی، (مَیں نے پہچان لیا کہ) میرے بھائی کی تحریر ہے۔ جب مَیں نے اطمینان سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ (مرزا یوسُف ہی کا) خط ہے، جو اس نے خود تحریر کیا ہے اور القاب و آداب کو پوری ہوش مندی کے ساتھ ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ مَیں تو خوشی سے اچھل پڑا اور ناچنے لگا اور فرطِ مسرت سے زار و قطار رونے لگا۔ جب ذرا ہوش آیا تو مَیں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنی خانم کے خط کی طرف توجہ دی۔ لکھا تھا کہ 'تمھارے (جانے کے) بعد مرزا یوسُف کے جنون کے شور نے (ہم سب کو سخت بے چین کر رکھا)، جس کا ہمیں پہلے سے ڈر تھا اور ہمارے شب و روز اس کی چیخ و پکار اور مار پیٹ میں سخت بدمزہ گزرے۔ سرکارِ شاہی کے ایک فیل بان نے، جو محل کی ایک خادمہ کے ذریعے یہاں پہنچا تھا، اس کا علاج کرنا شروع کیا۔ اس نے جنون کو جادو کا اثر قرار دیا اور اس کی نشانیاں بھی بتائیں، چنانچہ اس نے شہر پناہ کے باہر ایک درخت کی جڑ کھودنے اور ایک کنواں تلاش کرنے کو کہا۔ وہاں جو ہم نے کھدائی کی تو جو جو چیزیں اس نے بتائی

(18) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 31-34۔ انگریزی متن: حوالہ مذکور، انگریزی حصہ، ص 24-28 (19) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 141۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 567

تھیں، وہاں سے ملیں۔ غرضیکہ پانچ ماہ کے علاج میں یوسُف کی دو حصے بیماری رفع ہو گئی؛ چنانچہ اس قدر ہوش و حواس برقرار ہو گئے ہیں کہ کپڑے پہنے، ستر پوشی کرے، بول و براز سے احتراز کرے۔ کھانا دستر خوان پر کھائے اور بیوی، بیٹی اور ماں کو بیوی، بیٹی اور ماں سمجھے۔' خدا کی قسم، اس کی صحت مجھے پدرِ مرحوم کے زندہ ہو جانے سے عزیز تر ہے۔[20]

میرزا یوسُف ہے، غالب! یوسُفِ ثانی مجھے — دی مِرے بھائی کو حق نے از سرِ نَو زندگی[21]

OOO

خدا کی رحمت کے حیرت انگیز آثار میں سے ایک یہ ہے کہ مَیں کلکتے کی آب و ہَوا کا احسان مند ہوں، جو مجھے خوب راس آ گئی ہے۔ شدید گرمیوں میں شکر اور مصری کے ساتھ ناریل کے تازہ پانی نے بڑا فائدہ پہنچایا۔ جسمانی امراض کی کوئی شکایت نہیں، بلکہ دہلی سے زیادہ آرام سے ہوں۔[22]

OOO

ایک بد طینت اور میرے وطن کا ستم گر [خواجہ حاجی کا خواہر نسبتی اور خواجہ جان اور خواجہ امان کا ماموں] (مرزا افضل بیگ) میرے کلکتہ پہنچنے سے پہلے [اکبر شاہ ثانی کا وکیل[23] بن کر] دہلی سے یہاں آ چکا تھا اور اربابِ حکومت سے تعلقات رکھتا تھا۔[24] اس کی [مولوی سراج الدین احمد کے چچا اور دفتر فارسی کلکتہ میں میر] منشی عبدالکریم کے ساتھ بڑی یاری دوستی ہو گئی تھی، یہاں تک کہ وہ منشی عبدالکریم ہی کے مکان میں مقیم بھی ہے، میرے ساتھ پوشیدہ دشمنی رکھتا تھا اور اہلِ سنت میں مجھے کٹر رافضی اور اہلِ تشیع میں صوفی و ملحد و زندیق (مشہور کرتا تھا):[25]

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری — کہتے ہیں وہ مجھ کو رافضی و دہری
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی — شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری[26]

اس نے میرے خلاف یہ پروپیگنڈا [بھی] کیا کہ 'دہلی سے اس تازہ وارد نے (کلکتہ پہنچ کر) اپنا نام اور تخلص دونوں بدل لیے ہیں'، جس کی وجہ سے دفتر کے کارکنوں کو سربراہ (گورنر جنرل)

(**20**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص 141-142۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 567-568 (**21**) غالب 1996ء، ص 267 (**22**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص 145۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 571 (**23**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص 145۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 571 (**24**) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص 124 (**25**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص 145۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 571-572 (**26**) غالب 1996ء، ص 302

کے سامنے میرے معاملے کو پیش کرنے میں تامل ہُوا۔ سات سال سے زیادہ مدت ہوئی کہ مَیں نے اپنا دیوانِ ریختہ مرتب کیا تھا۔ اس دیوان کے آخر میں میرے نام کی ایک مُہر ثبت تھی۔ مُہر پر 'اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ 1231ھ' کندہ تھا۔ دشمنوں کا مُنھ بند کرنے کے لیے یہ مُہر کافی تھی، مَیں نے سرکاری دفتر کے افسرِ اعلیٰ کے پاس یہ دیوان بھیج دیا اور یہ خط ساتھ بھیجا، [میں نے وضاحت کی تھی کہ] دو سو فرسنگ سے تلوار کی دھار پر سفر کرتا ہُوا اور شرکا کے ظلم و ستم کے خلاف فریاد کرتا ہُوا عدالتِ انصاف میں حاضر ہُوا ہوں۔ اگر یہاں سے لعنت کا طوق گردن میں ڈال کر اور ملامت کے سنگریزے دامن میں بھر کر واپس جاؤں تو میرے بعد یہاں کے لوگ کہیں گے کہ فلاں زمانے میں ایک ایسا گمنام اور مجہول الاحوال شخص اس عظیم شہر میں آیا تھا، جو ہر سال نیا تخلص اختیار کرتا تھا اور ہر مہینے اور ہر ہفتے اپنا نیا نام رکھ لیتا تھا۔ میرا دیوان اور پرانی غزلوں کے مقطعے دیکھے جائیں، مدعی کو خاموش کرنے کے لیے یہ کافی ہیں۔ واللہ بغیر بالعباد۔ میرے دوسرے دیوان کے خاتمے پر میرے نام کی مُہر، جو اُن اَوراقِ پریشان پر ثبت ہے، خاص طور پر بغور دیکھی جائے یہ مُہر بھی، اس گفتگو میں تیغِ دودَم کی حیثیت رکھتی ہے۔ مُہر میں کندہ میرا نام مخالفوں کے مُنھ بند کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ بھی ثابت کرنے کے لیے یہ مُہر کافی ہے کہ اس گمنام نے مستقل طور پر اپنے نام کو قبول کیا ہے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فقیر کا نام اسد اللہ خاں ہے، عرف مرزا نوشہ اور تخلص غالب ہے، لیکن چونکہ لفظ 'غالب' میں چار حروف ہیں، اس لیے بعض مصرعوں میں یہ تخلص نہیں آ سکتا۔ اس گناہ گار کا اسمِ مخفف 'اسد' ہے، یہ سہ حرفی لفظ ہے، اس لیے کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر 'اسد' بھی بطور تخلص استعمال کر لیتا ہوں۔ اگر یہ غلطی ہے تو معافی چاہتا ہوں اور اگر جائز ہے تو انصاف کا طالب ہوں۔ توقع ہے کہ میری اس گزارش کے بعد، نام تبدیل کرنے کا کمینے پن کا داغ میرے دامن سے دُھل جائے گا۔[27]

اسی طرح [اس نے] شعرا میں یہ [بھی] مشہور کر دیا کہ یہ شخص قتیل کو بُرا بھلا کہتا ہے اور سخنورانِ کلکتہ کو بے حیثیت گردانتا ہے اور اس طرح اس نے ایک بڑی خلقت کو میرا مدمقابل بنا دیا۔ [دفتر خانۂ فارسی کے میر منشی] مولوی عبدالکریم کے عزیزوں میں سے ایک نے تو خاص طور پر

(27) بحوالہ خلیق انجم 2005ء ص 124-125 (28) پرتو روہیلہ 2015 ص 146-147۔ فارسی متن: ص 573

مجھے ذلیل وخوار کرنے کی خاطر ایک محفل ترتیب دی اور مشاعرے کا اہتمام کر کے شعرائے کلکتہ کو دعوت نامے ارسال کیے اور مجھے بھی مدعو کر لیا۔ ریختہ گویوں کو ریختے اور فارسی گویوں کو فارسی مصرع طرح بھیجا، جب کہ مجھے دونوں مصرعے دیے؛ چنانچہ گزشتہ اتوار ماہِ جون کی آٹھ [اور ذیقعد 1243ھ کی چوبیس] تاریخ مشاعرہ ہُوا۔ مَیں بھی گیا اور مَیں نے دونوں زبانوں کی طرحی غزلیں پڑھیں۔ اللہ کے کرم سے ہر خاص وعام کو پسند آئیں اور منصف مزاجوں میں سے ایک گروہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس شخص کے سامنے قتیل کیا حیثیت رکھتا ہے، بلکہ اسیر و بیدل جیسے دوسرے پیش رَووَں کو بھی اس کا مثیل ٹھہرائیں تو زیب دیتا ہے۔[28] خدا کی قسم، وہ [افضل بیگ] میرے کام میں جو بھی رخنہ ڈالتا، وہ میرے لیے روزنِ نجات بن جاتا تھا۔ [سائمن] فریزر صاحب سے ملاقات کے وقت مولوی عبدالکریم صاحب سے کیسی کیسی غلط بیانیاں ہوئیں، لیکن علی ابنِ طالب کے اعجاز پر نازاں ہوں کہ گزشتہ پیر کو جب مَیں [سائمن] فریزر صاحب سے ملنے گیا تو صاحب موصوف نے ادائے احترامات و پُرسشِ احوال کے بعد، بغیر میرے اس بارے میں کچھ کہے، انگریزی میں لکھی ہوئی ایک تحریر مجھے دِکھائی اور کہا کہ 'یہ آپ کی عرضی ہے، ہم اس کے مقابلے سے فارغ ہو گئے ہیں، اَب یہ صاحبانِ کونسل کے پاس پہنچ جائے گی۔ خاطر (جمع رکھیے) کہ آپ کا حق سرکار پر ثابت ہو چکا ہے اور اراکینِ سرکار (کسی کے) حق کی ادائیگی میں کوئی لحاظ نہیں کرتے'۔ ان درخواستوں کی پیشی کے لیے ہفتے میں دو دِن مقرر ہیں، جمعرات اور جمعہ۔ آج جمعہ [20/جون 1828ء] ہے، شاید میری درخواست آج کونسل میں پیش ہوئی ہو۔[29]

مَیں کلکتے کی آب وہَوا سے بھی خوش ہوں اور مقدمے کی شروعات کے طریق سے بھی کافی توقعات رکھتا ہوں۔ اگرچہ مَیں کمزور ہوں، تاہم میرا خدا قوی ہے۔ خدا کی قسم، اگر آغازِ مقدمہ بشارت دینے والا اور خیر پر انجام پذیر ہونے والا نہ ہوتا تو آج میری جگہ حیدرآباد میں ہوتی یا ایران کے کسی شہر میں۔[30]

OOO

---

(29) پرتوروہیلہ 2015ء، ص 145-146۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 572 **(30)** پرتوروہیلہ 2015ء، ص 147۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 573

مَیں فقیر بے سر و سامانی کی حالت میں گھر میں جھاڑو پھیر کر وطن اور اہل وطن سے رخصت ہو کر جب باندے پہنچا تو مَیں نے نواب صاحب [ذوالفقار علی خاں] سے دو ہزار روپے قرض مانگے، (جو انھوں نے) دے دیے۔ جس دِن [کلکتہ] پہنچا، (میرے پاس) چھ سو روپے (باقی) تھے۔ شعبان، رمضان، شوال اور ذی قعد تو گزر گئے؛ ذی الحجہ بھی آ گیا۔ اگر آسمان سے کوئی بلاے ناگہانی نہیں ٹوٹتی تو (فی الحال) دو ماہ کے لیے مَیں روزی کی فکر سے آزاد ہوں۔ نواب صاحب سے [مزید] دست گیری کی ایک موہوم سی امید تھی، (لیکن) آثار (امید افزا نہیں ہیں)۔[31]

OOO

میری عرضداشت اجلاس کونسل میں گزرانی کی گئی۔ حکم ہُوا کہ قاعدہ کے مطابق اسے پہلے ریزیڈنٹ دہلی کے جناب میں پیش ہونا چاہیے۔ مَیں نے کہا، 'میرے پاس نہ زادِ سفر ہے، نہ مراجعت کی قوت' تو حکم ہُوا کہ 'تم خود یہیں ٹھہرو اور اپنا مقدمہ وکالتاً ریزیڈنسی دہلی میں پیش کرو'۔ لاجرم، مَیں نے اپنے وطن کے احباب میں سے ایک دوست [مولوی فضلِ حق خیر آبادی] کے پاس خط بھیجا اور ان سے اعانت چاہی۔ انھوں نے بیکس نوازی کی اور وہ خود کار فرما بن گئے [اور لالہ ہیرا لعل کو] میری طرف سے وکیل مقرر کیا اور مجھے لکھا۔ مَیں نے وکالت نامہ لکھ کر وکیل کے نام بھیج دیا۔ یہ دوست، جو مجھ پر مجھ سے بھی زیادہ مہربان ہیں اور میرے کام کو اپنے کام سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔[32]

نواب علی اکبر خاں [کو] جب یہ بات معلوم ہوئی کہ کونسل کے صاحبانِ اختیار نے میری کاربر آری (مقدمہ کے کاغذات) کو حاکمانِ دہلی کے سپرد کر دیا ہے تو انھوں نے [لارڈ کولبروک، ریزیڈنٹ دہلی کے] منشی التفات حسین صاحب کو ایک سفارش نامہ لکھ دیا۔ منشی التفات حسین اور نواب صاحب موصوف سے دیرینہ رسم وراہ ہے۔ یہ سفارش نامہ مَیں نے اپنے خط میں ملفوف کر کے [اپنے وکیل] لالہ ہیرا لعل کو بھیج دیا ہے۔ مجھے یہ بھی خبر مل گئی ہے کہ وہ خط منشی صاحب تک پہنچ چکا ہے۔ علاوہ بریں آغازِ کار میں کرنل ہنری املاک؛ نیز صاحب ریزیڈنٹ دہلی کے لیے

(**31**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص147۔ فارسی متن: ص573-574 (**32**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص72-73۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص549-550

موصوف نے میرے حق میں کلماتِ خیر لکھ کر بھیجے تھے اور یہ انھیں کے کلمۂ خیر کا اثر ہے کہ حاکمِ دہلی کی توجہ مجھ دادخواہ اور میرے وکیل کے حال پر کچھ زیادہ ہے۔[33]

ربیع الاوّل کی انتیسویں تاریخ [مطابق 9/ اکتوبر 1828ء]، جمعرات کے روز، دِن چڑھے جناب مولوی ولایت حسن صاحب کا آدمی پہنچا اور [مولوی محمد علی خاں صدر امین] کا ایک مکتوب اور مولوی ولایت حسن صاحب کا ایک خط مجھے پہنچایا۔ سب سے پہلے مَیں نے [مولوی محمد علی خاں] کا خط کھولا۔ چونکہ [ان] کی اور دوسرے اعزا و اقربا کی سلامتی اور خیریت معلوم ہوئی، خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا، لیکن خارجی احوال معلوم کر کے دلِ خیر طلب قدرے افسردہ ہو گیا۔ اَب جو مولوی [ولایت حسن] صاحب کی تحریر پر نظر پڑی تو لکھا تھا کہ 'جنابِ قبلہ کے حکم کے مطابق دو سو روپے کے تین قطعے، جنھیں یہاں نوٹ کہتے ہیں، بھیجے جا رہے ہیں'۔[34] [مولوی صاحب] نے اپنے عنایت نامہ کے نوشتہ ورق میں اس سے متعلق ایک حرف بھی تحریر نہیں فرمایا تھا۔[35] انتہائی حیرت ہوئی اور ایک شدید اضطراب طاری ہو گیا۔ [مولوی محمد علی] کے ٹھیکے کے کاروبار کی ابتری اور اس میں نقصان ہونے کا احتمال ذہن کو پراگندہ کرتا ہے، لیکن چونکہ ضرورت مجھ سے قوی تر ہے اور مَیں بہت زیادہ کمزور ہوں، (اس لیے) اس کے قبول کرنے میں (عار محسوس نہیں کرتا)۔ اگر یہ رقم نہ پہنچتی تو میرا حال ناگفتہ بہ ہو جاتا۔ دوست بیگانے ہو گئے ہیں اور لوگوں کے دلوں سے محبت ختم ہو گئی ہے۔ بھیک مانگنا باعثِ شرم ہے اور بغیر کھائے زندہ رہنا (ناممکن)۔ جب تک سفر اور اقامت کی کشمکش میں تھا، مَیں نے گھوڑے کو جُدا نہیں کیا تھا۔ جب مَیں نے دیکھا کہ ایک عرصے تک کلکتے کی خاک چھاننا پڑے گی اور اس کے ساتھ ساتھ روپیہ اور وقت دونوں چاہییں کہ دِل اس چوپایے کی نگہداشت کے دکھ سے آسودہ ہو، (ناچار) مَیں نے گھوڑے کو فروخت کر دیا۔ اس کی قیمت مجھے ڈیڑھ سو روپے ملی۔ مَیں نے سائیس کو ہانک دیا اور ملازم کو بھی جواب دے دیا۔ اَب میرے پاس ایک کہار اور تین خدمت گار رہ گئے ہیں اور مَیں بھی، اگر غلطی نہیں کر رہا، کم از کم

(**33**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 53 فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 434 (**34**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 148۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 575 (**35**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 202۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 539

آدھا آدمی تو شمار ہو سکتا ہوں کہ مجھ جیسے بشر دِن رات میں کم از کم دو بار تو معدے کے تنور کو گرم کرتے ہیں۔ گھوڑے کی فروخت کے بعد پچاس روپے خرچ ہو گئے۔ سو روپے باقی تھے کہ [مولوی محمد علی خاں] کا مکتوبِ سعادت پہنچا، جس نے دِل کا غم دُور کر دیا، کیونکہ مَیں سوچ رہا تھا کہ جاڑے آ گئے ہیں، سو اس کے لیے کوئی خاص اہتمام نہ سہی، ایک گدڑی، ایک توشک اور ایک کمبل تو پھر بھی چاہیے۔ [ان] کی مدد نے مجھے پُر سکون کر دیا اور بے چینی سے رہائی دِلا دی۔ اَب گھوڑے کی (فروخت کی) رقم جڑاول کے مہیا کرنے اور ربیع الثانی کے چار ہفتے گزارنے میں خرچ ہو گی اور حالیہ دو سو روپے جمادی الاوّل کی پہلی تاریخ سے رمضان کی پہلی تک کفایت کریں گے۔ چونکہ مَیں نے دِل میں عہد کر رکھا ہے کہ پچاس روپے ماہانہ سے زیادہ کسی طرح خرچ نہ کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ان پانچ مہینوں میں کام بن جائے اور مقدمے کا فیصلہ ہو جائے اور مقدمے کے دَوران [مولوی محمد علی خاں] بھی، جیسا کہ ظاہر ہے، مجھ سے قرض کی واپسی کا تقاضا نہ کریں گے۔[36]

OOO

[مولوی سراج الدین احمد] کی خواہش ہے کہ 'غالب آشفتہ حال شملہ بازار کے ویرانے کا اُلّو نہ بنے، بلکہ ہماری عظمت کے قلعے کی دیوار پر اپنا آشیانہ بنائے'، [حالانکہ] اتنے بُعد اور فصل پر [ان کی طرف سے] اس قدر موردِ عتاب ہُوں تو ایسی قربت میں اپنی عزتِ نفس کی کس طرح حفاظت کر سکوں گا۔ [ان] کی ناراضی بھی برداشت کی جا سکتی ہے، لیکن خوف اس بات کا ہے کہ اگر [افضل بیگ اور اس کے زیرِ اثر مخالفین کے] اُس ٹولے سے قربت ہو گئی تو کون سا دکھ ہے، جو مجھے برداشت نہ کرنا ہو گا اور کون سی نادیدنی ہے، جو مجھے نہ دیکھنی ہو گی۔ کلکتہ میرے سفر آوارگی کی انتہا تو نہیں ہے۔ مجھے (خود) معلوم نہیں کہ کون سے کوہ و بیاباں پار کرنے ہیں اور یہ پاؤں کن کن راہوں پر گھسانے ہیں۔ اگر دو تین ماہ [سراج الدین احمد] کی دیوار کے سایے میں ستا بھی لوں تو کیا فائدہ؟ 'میرے لیے اس سے بڑی عنایت اَور کوئی نہ ہو گی، اگر مجھ بے کس کے بارے میں یہ فرض کر لیں کہ اس کو مسافرت میں موت آ گئی اور وہیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔[37]

---

(36) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 148-149۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 575-576 **(37)** پرتو روہیلہ 2015ء ص 82-83۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور ص 504-505

اس شہر [کلکتہ] کے شہر سخن سنجوں اور نکتہ رسوں نے فدوی کے یہاں پہنچنے کے بعد ایک بزمِ سخن مرتب کی تھی کہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی اتوار کو سارے شعرا اور سخن فہم حضرات سرکار کمپنی کے مدرسے [مدرسۂ عالیہ] میں جمع ہوتے اور [ہندی و فارسی[38]] غزلیں پڑھتے اور سنتے تھے۔ اتفاقاً بادشاہِ ہرات [شہزادہ کامران درّانی] کا ایک سفیر [کفایت خاں] اس محفل میں آ پہنچا اور اس نے اس جاے عالی کے فارسی گویوں کے اشعار سنے؛ میری اس نے بڑی شد و مد سے تعریف کی اور کہا، 'اس کلام کی قدر ہندوستان میں کون کر سکے گا۔ آپ کا کلام تو اس لائق تھا کہ فصحاے ایران سنتے اور سر دھنتے' اور [اس قلمرو کے نادرہ گویوں کے کلام پر زیرِ لب مسکراتے رہے[39]]۔ پھر اس نے حاضرین کی طرف رُخ کر کے کہا، 'دوستو! یہ ایک شخص تم لوگوں میں غنیمت ہے اور شعر و شاعری سے قطع نظر زبانِ فارسی کا عالم ہے'۔ چونکہ (انسانی) طبائع جبلتاً خود پسند ہوتی ہیں، (انھوں نے) [اس داد و تحسین کو سن کر[40]] حسد کیا اور اس انجمن کے بزرگوں اور مقتدروں نے میرے دو اشعار پر غلط اعتراضات کر کے انھیں بعض کمینوں کے نام سے شہرت دے دی۔[41] مخدومی و محافظی نواب علی اکبر خاں [اور محترمی مولوی محمد حسن[42]]، خدا ان کے اقبال کو دوام دے، اس منصفی میں میرے ہم زبان رہے ہیں اور انھوں نے شر پسندوں کو بڑے تدبر سے خاموش کر دیا، چنانچہ فقیر نے [ان دو بزرگوں کی فرمائش پر بزبانِ فارسی 'بادِ مخالف' کے نام سے] (ایک مثنوی لکھ کر) اپنے عجز و انکسار کے اظہار کے ساتھ ساتھ ان کے اعتراضات کے جواب بھی دیے ہیں۔[43] یہ مثنوی ان صاحبانِ طبع عالی کو بہت پسند آئی۔[44]

(**38**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 82۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 551 (**39**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 82۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 551 (**40**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 82۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 551 (**41**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 156-157۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 584۔ مالک رام کے مطابق، پٹیالہ کے دفتر خانے میں ایک خط موجود ہے، جو محمد شاہ والیِ ہرات نے مہاراجا کرم سنگھ کے نام لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے مہاراجا سے درخواست کی ہے کہ کفایت خاں ہمارا سفیر کلکتے سے دلّی اور پٹیالہ کے راستے واپس آ رہا ہے، اس کی ہر طرح امداد کی جائے۔ مالک رام کے خیال میں، غالباً یہ محمد شاہ، مرزا کامران درّانی کا جانشین ہو گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ کفایت خاں بہت دِنوں تک کلکتے میں مقیم رہا۔ **ذکرِ غالب**، ص 68 (**42**) تنویر احمد علوی 2016ء ص 82۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء ص 551 (**43**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 157۔ ⇦

مَیں ایک گونہ بندۂ شکم ہوں اور قدرے ناتواں۔ اپنے دستر خواں کی آرائش بھی چاہتا ہوں اور اپنی رُوح کی آسائش بھی۔ خرد مند جانتے ہیں کہ یہ دونوں خوبیاں آم میں موجود ہیں اور اہلِ کلکتہ کو معلوم ہے کہ ہگلی بندر گاہ آم کی قلمرو ہے۔ آم کو ہگلی سے وہی نسبت ہے، جو پھول کو چمن سے، ایثار کو ذاتِ والا سے اور سپاس گزاری کو اس نیاز مند سے۔ میر اشوقِ فراواں مجھ سے کہتا ہے کہ مَیں اس فصل کے ختم ہونے سے پہلے دو تین بار اپنے ولیِ نعمت [نواب علی اکبر خاں طباطبائی] کو ضرور یاد آؤں گا اور میرا دِل کہ خواہشات کا بندہ ہے، فریاد کرتا ہے کہ ہر گز ہر گز مَیں اتنے سے خوش نہ ہوں گا۔[45]

OOO

[حیدرآباد کے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے پوتے، کلکتہ میں گورنر جنرل کے دربار میں تعینات شاہِ اودھ کے سفیر اور مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں عربی کے مدرّس مولوی کرم حسین صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی تو مَیں نے کہا،] 'فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں، ویسا نہیں ہے'۔ [کہنے لگے، 'فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے رُوبرو گیا تھا، اس نے اڑھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا۔ مَیں نے عرض کی،] 'اب بھی اللّٰہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں'۔[46] انھوں نے [جیب میں سے ایک] چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ 'اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجے'۔ مَیں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر اُن کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی اُن سے لی۔[47]

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے، اُسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ، انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

⇦ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص584-585 (44) تنویر احمد علوی 2016ء، ص82۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء ص551 (45) تنویر احمد علوی 2016ء، ص85۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص423 (46) خلیق انجم 2005ء، ص403 (47) خلیق انجم 1989ء، ص714-715

مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوے شگرفانِ خود آرا کہیے
مِسّی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجیے
خالِ مشکینِ رُخِ دِل کشِ لیلا کہیے
حجرِ الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ ، آہوے بیابانِ ختن کا ، کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعے میں اِسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز
مے کدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اِسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟
کیوں اِسے نقطۂ پَرکارِ تمنا کہیے؟
کیوں اِسے گوہرِ نایاب تصور کیجے؟
کیوں اِسے مَردُمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اِسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے
کیوں اِسے نقشِ پےِ ناقۂ سلما کہیے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دِل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے[48]

جمادی الاوّل کی سترہ تاریخ [25/ نومبر 1828ء] کو [محمد علی خاں] کے نوازش نامے کی جھلک [نظر] آئی۔ جب فکر نے حرف و تحریر کا طواف مکمل کر لیا تو دہلی میں مقدمے کے پیش نہ ہونے پر دِل میں نئی گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔[49]

مَیں نے مقدمے کے کاغذات، مقدمے کی بنیاد کو مستحکم کرنے کے لیے، اُس عرضی کے ساتھ، جس پر (اراکین) کونسل کے دستخط تھے، مع سیکرٹری کونسل کے خط کے، جو مقدمے کی ابتدا کے باب میں ریزیڈنٹ کے شمول کے ایما پر محیط تھا اور صاحبِ والا شان کی چٹھی بنام [سر ایڈورڈ] کول بروک صاحب اور نواب علی اکبر خاں صاحب کا خط بنام منشی التفات حسین خاں، یہ سارے کاغذات ایک ورق میں لپیٹ کر خود ڈاک خانے لے گیا اور پوسٹ ماسٹر اور ڈاک خانے کے دوسرے عملے کو اس پر گواہ بنا کر لفافے کو ان کی موجودگی میں لاکھ سے بند کیا۔ اَب جو لفافے کا وزن کیا گیا تو وہ دس روپے کے برابر بیٹھا۔ دہلی کے لیے انگریزی ڈاک کا محصول ایک روپے پر پورا ایک روپیہ ہی ہے، پورے پورے دس روپے ڈاک کا محصول دے کر اور رسید لے کر آیا۔ اُس دِن منگل تھا اور صفر کی چودھویں تاریخ [26/ اگست 1828ء] تھی۔ ابھی اس مراسلے کے پہنچنے کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ مولوی فضل حق خیر آبادی کا خط آ گیا۔ مضمون یہ تھا کہ اپنی مہر والا مختار نامہ بغیر رجسٹری کے نہ بھیجنا، حالانکہ وہ مختار نامہ، جو اس کام کے لیے بھیجا جا چکا تھا، غیر رجسٹری شدہ تھا؛ چنانچہ مَیں نے فوراً اک اسٹامپ خرید کر اس پر مختار نامہ تحریر کر کے رجسٹری کرا کر اس خط کے پیچھے روانہ کر دیا۔ جس دِن یہ کاغذ روانہ کیا گیا، اتوار کا دِن تھا اور ربیع الاوّل کی چوتھی تاریخ [14 ستمبر]، آج تک کہ جمادی الاوّل کی سترہ یا اٹھارہ تاریخ [25/ نومبر] ہے، اس خط کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں، نہ ہی اس کا کوئی ردِّ عمل ظاہر ہُوا۔ اس وقت تک مَیں سات خط مزید اس کے پیچھے روانہ کر چکا ہوں، (مگر کوئی جواب) نہیں آیا۔ مَیں دِل کو سمجھاتا ہوں کہ

(48) غالب 1862ء، ص 201-203 (49) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 150۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 577

انگریزی ڈاک سے خط تلف نہیں ہوتا اور تُو نے چونکہ اس کو رجسٹری کرا کے بھیجا ہے، اس لیے اطمینان سے رہ، کوئی خطرہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ لفافہ راستے میں تلف ہو جاتا اور مکتوب الیہ کو نہ ملتا تو وہ اپنی انتہائی سست قلمیوں کے باوجود اس کی عدم رسیدگی کی اطلاع دیتے۔ مَیں تین ماہ سے اپنے غم کدے کی دیوار بنا بیٹھا ہوں، کوئی محرم نہیں کہ اس سے دِل کا حال کہا جائے۔ مَیں ہفتے میں ایک روز اُس آقائے ولی نعمت [اسٹرلنگ] کے پاس جایا کرتا تھا؛ اَب اس عمل سے تھک چکا ہوں کہ اگر جاؤں اور وہ منصف مقدمے کا احوال پوچھے تو یہ کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ دہلی بھیجا ہی نہیں اور اگر یہ کہتا ہوں کہ بھیجا ہے تو لازماً وہ مقدمے کی پیش رفت کے بارے میں سوال کریں گے، پھر مَیں کیا جواب دوں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ کارفرما ایسا بھی (بُرا) نہیں کہ اس پر غصہ کیا جا سکے اور اندیشہ ہائے دُور دراز کیے جائیں۔ یک گونہ شکایت جو ہے تو وہ اس کے تغافل سے ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ وہ اس فکر میں ہو گا کہ جیسے ہی مقدمہ شروع ہو تو مَیں اطلاع دوں۔[50]

مَیں نے (ہنڈوی) مخدومی مولوی ولایت حسن صاحب کے سپرد کی اور رقم اپنی مٹھی میں لے لی۔ چونکہ میرا کوئی حقِ خدمت [مولوی محمد علی خاں] پر نہیں بنتا، بالخصوص ایسے وقت میں کہ ٹھیکے میں نقصان کے سبب پیچ و تاب میں اور قرضے کی فکر و پریشانی اور عوام کے تقاضوں سے پراگندہ خاطر ہوں گے۔ خدا کی قسم، مجھے اس عرصۂ سفر میں ایک ایسا منعم و آقا نصیب ہو گیا ہے، جس کی مہربانیاں سوائے رحمتِ ایزدی کے اَور کسی سے مماثل نہیں، یہی وجہ ہے کہ ادائے شکر کی تب و تاب سے آزاد ہوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ باپ اپنے بیٹوں کی پرورش میں ان پر کوئی احسان نہیں کرتے، اس لیے کہ یہ نفسِ رحمانی کا فیض ہے، جس کے پردے میں وہ اپنی ذات کے مراتب کی تکمیل کرتے ہیں۔ مجھے اپنی حینِ حیات میں کسی کو اپنا باپ کہنے پر صرف دو موقعوں پر احساسِ افتخار ہُوا ہے؛ ایک تو میر ببر علی خاں مغفور اور دوسرے [مولوی محمد علی خاں] جیسے کرم کرنے والے کو۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں جگہ مَیں نے اُلفتِ پدری کو اس کی مکمل شکل میں دیکھا ہے۔[51]

(**50**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 150-152۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 577-580 (**51**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 153۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 580-581

دہلی کا حاکم، جس نے میرے نام خط میں اطلاعِ ثانی کا اشارہ [کیا] کہ میرا مقدمہ اس کی نظر میں مستحکم معلوم ہُوا اور جنرل لیک صاحب کے دَورِ تعیناتی کے وہ کاغذات، جو ریزیڈنسی کے دفتر میں (موجود) نہ تھے، صدر دفتر سے منگوائے اور صاحبانِ کونسل سے اس مقدمے کی نئے سرے سے تحقیق کی اجازت لی، چنانچہ نواب گورنر جنرل بہادُر (اِن) کونسل نے درخواست گزار کی فریاد کے اسباب کی تحقیق و توثیق کا حکم ان الفاظ کے اضافے کے ساتھ، جن کا مطلب 'بہت جلدی' نکلتا ہے، (دیا ہے) اور جرنیل صاحب کے عہد کے کاغذات بھجوا دیے ہیں اور دہلی کے حاکم کے فرمان اور اس حکم نامے کی نقلیں بمطابق اصل میرے ہاتھ آ گئی ہیں اور منصف دادرَس مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ نے جو کچھ بتایا تھا، بعینہٖ وہی ہُوا ہے، بلکہ اس حق پرست بادشاہ کے اندازِ بیان سے تو یہ ٹپکتا تھا کہ گویا ثانوی رپورٹ کا وقت بھی قریب ہی ہے۔ اَب دیکھنا یہ ہے کہ ریزیڈنٹ کی رائے کس بات کی متقضی ہوتی ہے۔ (اس قدر رقم) خواجہ حاجی اور اس کے لڑکوں کو ملی، اگر پرورش کی رقم میں مجرا نہ ہوئی ہو گی تو سات ہزار روپے سالانہ آج تک چاہیے اور اگر سرکاری کاغذات کے مطابق بھی حساب کیا جائے، جس میں کہ احمد بخش خاں کی غلط بیانی کو سراسر دخل ہے، (تب بھی) پانچ ہزار روپے سالانہ ابتدائے 1806ء تا 1821ء مخالفین کے ذمے واجب الادا (ہیں)۔[52]

OOO

ہرچند کہ مَیں پانچ ماہ سے سیکرٹری صاحب [اینڈریو اسٹرلنگ] کے سلام کو نہ گیا تھا، لیکن چونکہ بڑے دِن کے روز عید [الاضحیٰ] بھی تھی، مَیں مجبوراً گیا۔ (انھوں نے بڑی مہربانی فرمائی) اور نرم لہجے میں شکایت بھی کی اور (مجھ سے) وعدہ لے لیا کہ ہفتے عشرے میں ایک بار ضرور ملاقات کرتا رہوں گا۔ مَیں تو خدا سے یہی چاہتا تھا۔ (مَیں اگر) نہیں گیا تھا تو مقدمے کے احوال سے ناواقفیت کی شرم سے نہیں گیا تھا؛ غرض چند باتیں انھوں نے مقدمے کی بابت بھی کیں۔ ان کے انداز و اطوار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پچاس سواروں کی تنخواہ کے سلسلے میں ایک ہزار روپے ماہانہ کے حساب سے، چوبیس سال میں تین لاکھ روپے کی رقم بن جاتی ہے، بشرطیکہ ہمدردی سے مقدمے کی کاوِشوں پر غور کریں۔ چونکہ عالمِ اسباب میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے تو خدا کی

(52) پرتورہیلہ 2015ء ص 154-155۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 581-582

قدرت و طاقت سے جب بھی صبحِ مراد کی رَوشنی ہونے کا وقت آیا تو کامیابی کا سورج نیک بختی کے افق سے چمکنے لگے گا۔[53]

ooo

خدا کی قسم، میرا دوست [مولوی فضلِ حق] میرے کام [مقدمۂ پنشن] سے غافل نہیں تھا اور اس نے چارہ جوئی سے کبھی پہلو تہی نہیں کی، بلکہ (یوں کہنا چاہیے کہ) وہ مجھ پر مجھ سے زیادہ مہربان ہے اور چارہ جوئی کے طور طریقوں سے مجھ سے زیادہ واقف۔ یہ جو آج تک اس نے کوئی اطلاع نہیں دی تو یہ یک دِلی اور یگانگت کے افتخار کے باعث تھا، نہ کہ دُوری و دیوانگی کے سبب۔[54]

ooo

خبر یہ ہے کہ گورنر جنرل کے پرچموں کی روانگی تمام ارکانِ کونسل اور عمالِ دفتر کے ساتھ ماہِ اگست میں [کلکتہ سے] بجانب ہندوستان ہو گی اور وکلا، سُفرا، مُنصف حضرات اس لشکر کے پیچھے جائیں گے۔ شنید یہ تھی [کہ] جنوری کے اواخر میں ریزیڈنٹ کی واپسی دہلی ہو گی، اَب کہ جنوری ختم ہو کر فروری کا آغاز ہو گیا، لازمی وہ دہلی پہنچ چکے ہوں گے اور میرا مقدمہ (بھی) پیش ہو گیا ہو گا۔ دیکھنا چاہیے کہ ان پانچ چھ مہینوں میں کیا ہوتا ہے۔ جناب سیکرٹری صاحب [اینڈریو اسٹرلنگ] بر سبیل تلطف یہ کہتے تھے کہ اس طرح (یعنی گورنر جنرل اور اعیانِ کونسل کے دہلی جانے سے) آپ لوگ ریزیڈنٹ کی خوشی ناخوشی سے عافیت میں ہیں، کیونکہ لارڈ صاحب بہ نفسِ نفیس ہر مقدمے کی تہہ کو پہنچ کر ظلم و ستم کو دھو کر، ناانصافیاں دُور کر دیں گے۔[55]

ooo

جناب نواب سید علی اکبر خاں طباطبائی جب بھی ہگلی سے تشریف لاتے ہیں، کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ اپنے ورُود سے مجھے (افتخار نہ بخشیں)۔ اَب کہ (ان کی) چھوٹی لڑکی کی شادی در پیش ہے، وہ مجھے یہ فرما کر گئے ہیں کہ مَیں جب بھی بلاؤں گا، تمھیں ہگلی آنا ہو گا اور میرے ساتھ ایک ہفتہ رہو گے۔ مَیں نواب صاحب کے بلاوے کا منتظر ہوں۔[56]

---

(53) پرتو روہیلہ 2015، ص 156۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور ص 583-584 **(54)** پرتو روہیلہ 2015ء ص 157۔ فارسی متن: ص 585 **(55)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 158-159۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 587
(56) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 159۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 587-588

ooo

[کلکتہ میں گورنر جنرل کے دربار میں سفیر اودھ] جنابِ منشی عاشق علی خاں صاحب بہادُر نے اس ننگ آفرینش کو لکھا کہ کوئی وقت مقرر کر کے مجھے اطلاع دو۔ مَیں دوسرے دِن خود ان کی قدم بوسی کے لیے گیا۔ اگرچہ دفتر کے آنے جانے میں جنابِ ممدوح سے تعارُف (ہو چکا تھا، بلکہ) قبلہ وکعبہ نواب علی اکبر خاں کے مکان پر گلے ملنے کا اتفاق بھی ہُوا تھا، لیکن اس مرتبہ (ان کی) محبت کا نقش دِل پر جم گیا۔[57] چند روز بعد [15/ فروری کو] مجھے اطلاع دیے بغیر جنابِ ممدوح (ایسے وقت) میرے گھر تشریف لے آئے کہ مَیں موجود نہ تھا۔ جب مَیں واپس آیا اور مجھے معلوم ہُوا تو مَیں پانی پانی ہو گیا اور تلافیِ مافات کے لیے تیز قدمی کرتا ہُوا اُن کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔[58]

ooo

[14/ فروری کو] مَیں صاحبِ موصوف [اینڈریو اسٹرلنگ] کی خدمت میں حاضر ہُوا اور حضوری کی تمنا کی، جو انھوں نے انتہائے کرم سے منظور کر لی اور کافی مہربانی کی۔ میرا نام صفِ اصحاب الیمین میں (درج کرا دیا) اور مجھے عزت کی کرسی پر بٹھایا اور حسنِ اتفاق سے نمبر 1 پر راجا بھوپ سنگھ، جانشینِ راجا کلیان سنگھ عظیم آبادی، [نمبر 2 راجا مانک سنگھ،[59]] نمبر 3 سفیر شاہِ دہلی، نمبر 4 سفیر شاہِ اودھ، نمبر 5 ہمایوں جاہ نواب مرشد آباد کا وکیل، نمبر 6 وکیل جودھ پور، نمبر 7 وکیل جے پور، نمبر 8 وکیل راجا نیپال، نمبر 9 میرے قبلہ وکعبہ جناب علی اکبر خاں دام اقبالہ اور دسواں نمبر فدوی کا قرار دیا۔ مجھے ایک انجمن میں ایک ایسے شخص کے پہلو میں جگہ دی گئی ہے، جسے مَیں شرفائے بنگالہ میں منتخب (شمار کرتا ہوں)، لیکن افسوس کہ نواب صاحب ہگلی سے تشریف نہ لا سکے۔ جب مَیں نے صاحبِ نعمت کی عنایت اپنے اوپر بیش از بیش دیکھیں (تو مَیں نے) خلعت کی آرزو کی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئے، پھر سر اٹھایا اور بڑے دِل فریب انداز میں کہا، 'اس وقت اس کی گنجائش نہ تھی کہ کسی کا نام اہلِ دربار میں اضافہ کیا جاتا؛ ہم نے (تیرا نام اضافہ کر کے) تیری دِل دہی اور خاطر داری کی ہے۔ جب کلکتے سے تیری رخصت کا وقت آئے گا، اُس وقت ایک خلعت گراں مایہ 'بہادُر' کے خطاب کے ضمیمے کے ساتھ تیرے لیے لارڈ صاحب کے

(**57**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 160-161۔ فارسی متن: حوالہٴ مذکور، ص 589-590 (**58**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص162۔ فارسی متن: حوالہٴ مذکور، ص590 (**59**) حاشیہ از پرتو روہیلہ 2015ء ص162

آستانے سے حاصل کر لی جائے گی'۔ چونکہ یہ باتیں اس قدر خوش کن تھیں، مَیں خاموش ہو گیا۔[60] جب اتوار آئی تو مَیں اپنے غم کدے سے اٹھ کر سراج الدین احمد کے مکان پر چلا گیا اور رات وہاں بسر کی۔ پیر کے دِن وہیں سے سوار ہو کر پہلے دفتر گیا اور وہاں سے گیتی پناہ دربار میں پہنچا۔[61] جب نواب گورنر جنرل بہادُر تشریف لائے اور (میرے پیش ہونے کی باری آئی،) مَیں نے دو اشرفیاں نذر کیں۔ رسم کے مطابق انھوں نے معاف فرما کر چندے توقف فرمایا اور میری نیاز مندی کو سراہا، انتہائے شفقت سے اپنے دستِ خاص سے عطر اور پان مجھے عنایت فرمائے۔[62]

○○○

قبلہ و کعبہ سید علی اکبر خاں [بیٹی کی] شادی کی مصروفیت سے فارغ ہو گئے ہیں۔ دربار کے دِن چونکہ لارڈ صاحب تشریف نہیں لائے اور ان کی جگہ میرے پہلو میں خالی رہی۔ وہ بیمار ہیں اور طبیعت ٹھیک نہیں، چنانچہ مَیں عیادت کے لیے گیا اور پانچ دِن اور رات ہگلی میں رہا، چنانچہ کل واپس آ کر اپنے کلبۂ احزاں میں پہنچا۔ دہلی سے آیا ہُوا خط،[63] لکھا تھا کہ شعبان کی پانچویں [10/ فروری] کو تمھارا مقدمہ مسل کے کاغذات میں شامل ہو گیا۔ ہر چند کہ مَیں اس کا مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھ سکا، لیکن (یہ امر) میری عرضداشت کے مسل پر لگ جانے کی خبر دیتا ہے۔[64]

شنید ہے، برسات میں، جب دریا زوروں پر ہوتا ہے، نواب گورنر جنرل تمام افرادِ کونسل اور اشخاصِ عملہ کے ساتھ ہندوستان جائیں گے اور تین سال کے لیے ضلع میرٹھ دارالسلطنت قرار پائے گا۔ اس صورت میں سارے متوسلین، خواہ وکیل ہوں یا درخواست گزار، سب کے سب اس قافلے میں ہم سفر و ہم قدم ہوں گے۔ مَیں کہ اقامت کی تاب نہیں رکھتا، بھلا سفر کے لیے حوصلہ و سامان کہاں سے لاؤں! کاش کہ مقدمے نے کوئی بہتری کی راہ پکڑ لی ہوتی تو حکومت سے اعانت کے طور پر کچھ قرض لے سکتا یا ایسا ہوتا کہ حضرت قبلہ گاہی [محمد علی خاں] خود ٹھیکے کی مشکلات میں گرفتار نہ ہوتے۔ کاش! نواب ذوالفقار کو یہ توفیق ہو کہ وہ مزید ایک ہزار روپے امین کرن سے دلوا

(**60**) پرتوِ روہیلہ 2015ء ص162-163۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص591-592 (**61**) پرتوِ روہیلہ 2015ء ص 370۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص804 (**62**) پرتوِ روہیلہ 2015ء، ص163۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص592 (**63**) پرتوِ روہیلہ 2015ء، ص163-164۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص593 (**64**) پرتوِ روہیلہ 2015ء، ص163۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص593

دیں۔ یہ موت سے پہلے واویلا اس لیے ہے کہ اُس قیامت میں چار ماہ سے زائد فرصت باقی نہیں۔ اپنی تہی دستی کے غم کے بارے میں [کیا کہوں] کہ رمضان آپہنچا ہے اور زرِ نقد تمام ہو چکا ہے۔ اگر لارڈ صاحب سے ملاقات شعبان میں نہ ہوتی تو رمضان اچھا گزر جاتا، لیکن رمضان کی عیاشی کی رقم گورنر جنرل اور سیکرٹری کی خدمت میں اور عملے کے انعام و بخشش میں صرف ہو گئی۔[65]

رمضان کی تیرہ تاریخ، ایک خط وطن سے پہنچا۔ اس سے اس قدر سمجھ میں آتا ہے کہ مقدمہ اس عدالت میں پیش ہو گیا ہے اور حاکم نے اپنے کارپردازوں کو کام پر لگا دیا ہے۔[66] 28/ شوال [1244ھ، 3/ مئی 1829ء] دہلی سے وکیل کا مکتوب پہنچا۔ جنابِ ریزیڈنٹ صاحب کا مہر کردہ نوازش نامہ، فدوی کا خط اس میں منسلک اور ہزار رنگ آرزوئیں اس کے لفظ و معنی میں پوشیدہ تھیں۔ [انھوں نے لکھا تھا،] شوقِ ملاقات کے بعد واضح ہو کہ جنابِ عالی کا خط مطالبات کے اظہار کے بارے میں پنڈت ہیرا لعل کے دوسرے منسلک کاغذات کے ساتھ وصول ہُوا اور کاشفِ حال ہُوا۔ مہربان اس مقدمہ میں اہالیانِ صدر کے سامنے لکھ کر بھیج دیا گیا ہے۔ ان مہرباں کے جواب کے آنے پر آپ کو اطلاع دی جائے گی۔ (مرقومہ 17/ اپریل) غرضیکہ وہ آدھا دِن اور ساری رات خوشی میں بسر کر کے پیر کے دِن [4/ مئی] کہ وُکلا کی ملاقات کا دِن ہوتا ہے اور مجھ جیسا کم حیثیت لوگوں کو اس دِن قربِ ملازمت [یعنی ملاقات] ذرا کم تر ہی ہوتا ہے، دلِ پُر آرزو کے ساتھ دفتر خانے گیا۔ اہلِ بار کی بزم جب برخاست ہو گئی اور خداوندِ بارگاہ (گورنر جنرل) اپنے خاص کمرے میں چلے گئے تو مَیں نے اذنِ باریابی چاہا اور ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ مَیں نے ریزیڈنٹ کا خط انھیں دِکھایا، انھوں نے دیکھا اور اس سے پہلے کہ مَیں (کچھ) پوچھتا، فرمایا کہ ہاں، تمھارے مقدمے میں کولبروک صاحب نے صدر دفتر کو ایک خط لکھا تھا اور یہاں سے مناسب جواب بھجوا دیا گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ جنابِ ریزیڈنٹ صاحب آپ پر نظرِ عنایت رکھتے ہیں اور توقع یہ ہے کہ آپ کے دعووں کی تشخیص و تحقیق کر کے صدر دفتر کو رپورٹ بھیجیں گے، غرض بات یہاں پر ختم ہو گئی۔ مَیں نے سلام کیا اور واپس گھر آ گیا۔[67]

(**65**) پرتورہیلہ 2015ء، ص164-165۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص593 (**66**) پرتورہیلہ 2015ء، ص165۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص595 (**67**) پرتورہیلہ 2015ء، ص166-167۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص596

ہنڈوی اکبر آباد سے پہنچی ہے۔ جب حاصل کر لی تو پتا چلا، چار سو پچھتّر روپے کی تھی، رقم وصول ہو گئی۔ ملازمانِ حضرت قبلہ گاہی [مولوی محمد علی خاں صدر امین] کی عطا سے ابھی کچھ (رقم) باقی ہے اور کاروانِ کونسل کے کوچ سے پہلے اپنی کامیابی کے لیے امیدوار (ہوں)۔[68]

○○○

وہ صدر نشین، جو اس وقت حاکمِ عہد ہے، نہ معلوم کن مسائل سے دوچار ہے اور آئندہ کیا کرنے والا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ اس کے ہم نشین بھی اس کی مکاری سے عاجز آ کر اس کی مخالفت میں یکجا ہو گئے ہیں۔ چغل خوروں نے کونسل کے اربابِ دانش تک یہ بات پہنچائی کہ اطراف و جوانب کے حاکم نذر کے طور پر مروارید منگواتے ہیں اور تحفے (کے لین دین میں) ہزاروں اور لاکھوں اِدھر اُدھر سے لیتے ہیں؛ چنانچہ حکم ہُوا اور ہر علاقے اور بستی میں اعلان کر دیا گیا کہ رسمِ نذر و پیشکش باطل قرار دی جاتی ہے اور بطور تحفہ لائی ہوئی چیز، چاہے کلیتاً پھلوں کی ٹوکری اور مصری کا ایک طبق ہی کیوں نہ ہو، موقوف و ممنوع کی جاتی ہے۔ غالبِ آشفتہ نوا نے جب کام کا یہ ڈھنگ دیکھا تو ایک رباعی کہہ کر منصف کی خدمت میں گزرانی۔ کیا بتاؤں کہ اس کی فطرت میں شگفتگی کے کیسے (لطیف ریشے پنہاں) تھے کہ (رباعی نے) اس کی پیشانی کو چاند کی طرح تاباں کر دیا۔ ہونٹوں پر تبسم (لا کر) آنکھوں میں محبت (بھر کر) اور زبان کو ستائش سے تر کر کے اس نے کہا کہ زہے مخلصانِ صادق نہ منع ہی کر سکتے ہیں اور نہ ہی معاف۔[69]

نہ معلوم، کیا پیش آیا کہ دہلی کے حاکم نے ابھی تک مقدمے کی طرف توجہ نہ کی۔ (حاکمِ دہلی کا) وہ حکم ماہِ اپریل کے وسط میں دہلی کی جانب نفاذ پذیر ہُوا، میری فکر کے مطابق اپریل کے آخر میں دہلی میں پہنچا ہو گا۔ آج تک کہ وسط جولائی ہے، اس ساز سے کوئی آواز نہیں ابھری۔ جو کچھ کہ وکیل کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، ذی الحجہ کی ساتویں تک کہ جون کی دس تاریخ تھی، حاکم نے کوئی استفسار نہیں کیا۔ نہ معلوم، اس ماہ کے عرصے میں [کہ] ذی الحجہ سے محرم کی آٹھویں تک گزر گئی، کوئی تحقیق ہوئی یا ابھی تک منصف خواب میں اور داد خواہ اضطراب میں ہے۔ باوجود اس کے کہ

(**68**) پرتو روہیلہ 2015، ص169۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص598 (**69**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص170-172۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص600-602

ریزیڈنٹ بہادُر نے اپنے خط میں اسد اللہ کو صدر دفتر کے حکم کا امیدوار بنایا تھا اور صدر کا حکم ہر صورت سے سائل کی مرضی کے مطابق صادر ہُوا تھا اور اس کو بھی تین ماہ گزر گئے، [معلوم نہیں،] رکاوٹ کس جگہ ہے اور تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ اگر مَیں جان لوں کہ میرا وکیل لااُبالی ہے تو اس کی کارفرمائی کے لیے (اس شخص کو لکھوں، جس کے ذریعے اس کو وکیل مقرر کیا گیا ہے) اور جو میرے لیے اور میرے کام کے لیے میری طرح (ہے) اور اس کو آگاہ کروں، تا کہ وہ وکیل کو جنبشِ ابرو اور گردشِ چشم سے آمادہ بہ عمل کرے اور اگر حاکم ہی فی الوقت لیت ولعل کر رہا ہے تو اس کے سامنے شکایت لے جا کر (طلبِ انصاف) صدر سے کی جائے۔ انتظار کی مدت، جو تین ماہ تک پہنچ چکی ہے، اَب گزر چکی ہے۔[70]

مَیں اس انتظار میں تھا کہ ثانوی رپورٹ دہلی سے آنے والی ہے، لیکن خلافِ مقصود بات ہوئی اور رپورٹ آج تک نہ پہنچی اور وطن کے معززین کی تحریر سے معلوم ہُوا کہ [وہ بھی] 7/ ذی الحجہ [1244ھ-10/ جون 1829ء] کے مطابق تھی، کوئی باز پرس درمیان نہیں آئی۔ میرا حال بُرا ہو گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ ظاہر ہُوا کہ نہ حاکم (نے سستی) کی ہے اور نہ ہی مدعی کے وکیل سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے اور نہ ہی حکمِ سرکار توقف کا مقتضی تھا۔ اس [حاکمِ دہلی] کے دشمنوں نے اس پر چند تہمتیں لگائی ہیں اور اس لیے وہ فی الوقت اپنی خدماتِ مفوضہ انجام نہیں دے رہا اور جب تک ان الزامات کی تحقیق مکمل نہیں ہو جاتی، یہی حال رہے گا اور اگر (تحقیقات کے نتیجے میں) بے گناہ و پاک نکلا تو اپنے عہدے پر بحال ہو جائے گا، ورنہ اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی آ جائے گا۔[71]

○○○

اگست کی پہلی تاریخ کو ہفتے کے دِن لارڈ صاحب نے دربارِ عام کیا۔ سلام کرنے والوں کی دعوت دی۔ سب ہم مرتبہ لوگ گئے، مَیں بھی گیا اور دسویں نمبر پر نواب علی اکبر خاں کے بعد دستور کے مطابق بیٹھا۔ یہ ملاقات وِداعی تھی، یعنی اس سے متصل ہی نوابِ معلی القاب کی ہندوستان کی جانب کوچ کی خبر پھیل گئی۔ ستمبر کے مہینے میں دفتر بھی دریا کے راستے روانہ ہو جائے گا

(**70**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص174۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص603 (**71**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص174۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص604

اور اکتوبر کے آخر میں لارڈ صاحب بھی ڈاک کے ذریعے یا دخانی جہاز سے کوچ کر جائیں گے۔ اکثر دخانی جہاز کلکتہ سے الٰہ آباد دو ہفتے میں پہنچے ہیں؛ غرضیکہ ان حالات میں مَیں نے یہ سوچا کہ دو تین ماہ مجھے کلکتہ میں بیٹھے نہیں رہنا چاہیے، بلکہ اس قافلے سے پہلے کوچ کرنا چاہیے۔ بہر حال، کشتی مہیا کی اور ساحلِ باندہ تک پہنچانے کا طے کیا۔ کل کہ ہفتے کا دِن، صفر کی چودھویں اور اگست کی پندرہ تاریخ ہے، (کشتی) پکڑوں گا اور روانہ ہو جاؤں گا؛ چنانچہ آج کہ جمعہ کا دِن ہے، میرے سفر کا کچھ سامان کشتی میں پہنچ چکا ہے۔ مَیں نے [کلکتہ کے] ان بزرگ [مولوی سراج الدین احمد] سے یہ درخواست کی ہے کہ اگر کوئی نئی بات ہو تو ایک خط لکھ کر باندہ بھیج دیا جائے اور اس طرح کی ایک گزارش [دہلی کے] مولوی فضل صاحب کی خدمت میں بھی تحریر کی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جب مَیں باندہ پہنچوں تو مجھے دونوں جگہوں کے حالات، انتظار کی تکلیف کے بغیر معلوم ہو جائیں۔[72]

OOO

[غالباً] مجھے دو تین دِن اَور بھی کلکتے میں ٹھہرنا پڑے گا، (چنانچہ) جب دیکھا کہ ابھی فرصت ہے [اور صدر دیوانی کے مختار] جناب [مرزا احمد بیگ طپاں] کی خدمت میں حاضر [بھی] نہیں ہُوا، اَور آشنا جگہوں پر جانا موقوف کر دیا۔[73]

[مرزا احمد بیگ طپاں کی طرف سے [الوداعی] کھانے پر دو واضح عذر ہیں۔ ایک تو یہ کہ مَیں رات کو کھانا ہی نہیں کھاتا، دوسرے یہ کہ آج اتوار ہے اور اس دِن مَیں گوشت سے پرہیز کرتا ہوں، [چنانچہ] کل [17/ اگست 1829ء کی] صبح کے وقت [ان] کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ کھا کر رخصت ہوں گا۔[74]

چونکہ مشہور ہے کہ جمعرات کے دِن سفر مبارک ہوتا ہے، ورنہ کل اپنے سامان میں سے کچھ سامان [صدر امین] کے دولت خانے بھیج کر جمعہ کی صبح [ان] کی قدم بوسی کے بعد سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔[75]

OOO

(**72**) پرتو روہیلہ 2015ء ص 174-175۔ فارسی متن: حوالہ مذکور ص 604-605 (**73**) پرتو روہیلہ 2015ء ص 351۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 785 (**74**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 352۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 785 (**75**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 175-176۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 605-606

کلکتہ کے ملاحوں کے جھگڑے اور ان کے بھاگ جانے کے سبب اور اس کشتی کے ہاتھ سے نکل جانے اور دوسری کشتی تلاش کرنے کے باعث ہگلی میں پانچ دِن اَور بھی ٹھہرنا پڑا اور مَیں نے آقا صاحب [آغا محمد حسین خاں] کی تندرستی کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے سرکار نواب صاحب [علی اکبر خاں طباطبائی] کے ایک اہل کار کے ذریعے ایک خط [سید ابوالقاسم خاں] کے نام لکھ کر بھجوایا تھا۔ [ان] کی ہمدردی کا وہ انداز، جو مَیں نے اپنے حق میں دیکھا ہے، ایسا نہیں کہ اس کثیر سے قلیل کی وضاحت بھی کی جا سکے۔ خدا کی قسم، [ان] کے اخلاق کی تقویت سے کی بِنا پر مَیں دہلی کی جدائی کا غم بھول گیا تھا۔[76] جب اُن پانچ روز کے توقف کے دَوران کوئی جواب نہ آیا اور کشتی کا بندوبست ہو گیا تو افسردہ دِل چل پڑا۔[77]

OOO

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو ، پَر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر ، تیغ ہے ذوالفقار ایک
ہم سخن و ہم زباں ، حضرتِ قاسم و طپاں
ایک طپش کا جانشیں ، دردؔ کا یادگار ایک
دونوں کے دِل حق آشنا ، دونوں رسولؐ پر فدا
ایک محب چار یار ، عاشق ہشت و چار ایک
لایا ہے ، کہہ کے یہ غزل ، شائبہ ریا سے دُور
کر کے دِل و زبان کو ، غالبِ خاکسار ، ایک[78]

❑❑❑

(**76**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 372۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 807 (**77**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 373۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 808 (**78**) غالب 1996ء، ص 275

(4)

جستجو کیا ہے؟

(1829ء-1840ء)

جنابِ مرزا[احمد بیگ] صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ دہلی پہنچوں گا، ہو سکتا ہے کہ (ان کے آنے کا) اتفاق ہو، لیکن میرا ہاتھ [ابوالقاسم خاں] کے دامن تک دوبارہ نہیں پہنچے گا۔ افسوس مجھ پر اور میرے نصیب پر۔ آج [27/اکتوبر 1829ء] کہ منگل کا دِن ہے، مرشد آباد میں ہوں اور کشتی کی تلاش ہے۔ امید کرتا ہوں کہ ان ہی ایک دو روز میں دریا کے راستے روانہ ہو جاؤں گا۔[1]

ooo

خدا کی قسم، کسی پڑاؤ پر بھی آغا محمد حسین کی خیریت سے غافل نہیں رہا اور آج بھی وہ کشمکش بدستور ہے۔ آج عظیم آباد [پٹنہ] کے گھاٹ کے کنارے بیٹھا ہوں اور کل عازمِ مراد ہوں گا۔ خدا مجھے میرے آشیانے [تک] پہنچائے اور میری رات کی سحر کر دے۔[2]

ooo

آغا [محمد حسین خاں] صاحب کے صحت پانے کی خوش خبری نے دِل کو تازہ اور رُوح کو شاد کر دیا۔ خدا کی قسم کہ [ابوالقاسم خاں] نے کلکتہ میں غربت کا دُکھ اور بے کسی کا غم میرے دِل سے محو کر دیا تھا۔ مَیں سمجھتا تھا کہ کلکتہ دہلی ہے اور غربت وطن ہے، قید خانہ گلستاں ہے اور بیاباں چمن۔ بالآخر جمعہ کے روز کہ جمادی الاوّل [1245ھ] کی پہلی تاریخ [30/اکتوبر 1829ء] تھی، باندہ پہنچا؛ ہفتے کے دِن اس جگہ سے روانہ ہو جاؤں گا۔[3]

ooo

---

(1) پرتوروہیلہ 2015ء، ص372۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص807 (2) پرتوروہیلہ 2015ء، ص373۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص808 (3) پرتوروہیلہ 2015ء، ص373۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص808-809

کولبروک صاحب ریزیڈنٹ دہلی کو عہدے سے معزول کر دیا گیا ہے اور فرانسس ہاکنس صاحب حاکمِ دہلی [ریزیڈنٹ دہلی] تعینات ہوئے ہیں۔ [لوگ] کہتے ہیں کہ رحم دِل اور سلیم الطبع انسان ہے، لیکن افسوس کہ مظلوموں کی فریاد پر کان نہیں دھرتا اور ستم زدوں کو انصافِ عاجلانہ نہیں دیتا۔ ہرچند کہ میرے مقدمہ میں مرکزی دفتر کا حکم محکم ہے، لیکن [یہ معلوم ہونا ضروری ہے] کہ مسٹر فرانسس ہاکنس بہادُر کے جناب کرنیل صاحب سے محبت کے تعلقات ہیں یا نہیں؟ اگر ایک دوسرے سے آشنا نہیں تو خیر، اور اگر آپس میں دوستی ہو تو [ابوالقاسم خاں] اور آغا [محمد حسین کو چاہیے کہ] میری جانب سے خانم کی خدمت میں تسلیمات پہنچا کر اور ان کو میری بے چارگی یاد دِلا کر اتنا کریں کہ ایک سفارشی خط ہاتھ آجائے، (اس طرح) کہ حکومت کا حکم اور کرنیل صاحب کی تحریر دونوں مل کر مہربانی کے حصول اور نجات کی منزل کے وصول کا ذریعہ بن سکے۔[4]

○○○

وائے، اگر [مَیں] دہلی پہنچا ہوتا، اس مضمون کے مصداق، 'جب تک تُو مجھ تک پہنچے گا، مَیں خدا تک پہنچ جاؤں گا'۔ ناچار طوعاً و کرہاً وطن جا رہا ہوں، لیکن سخت افسردگی کے عالم میں؛ چنانچہ ہفتے کے دِن، اس مہینے کی نویں تاریخ کو راہ پیما کے پیر سے بند کھول دیا جائے گا اور پیغامِ اجل نہ پہنچا تو اس ماہ کے آخر میں اُس شہر میں پہنچ جاؤں گا۔[5]

مَیں چونکہ اہلِ کرم کے اخلاق کا محتاج اور بزرگوں کے الطاف کے دستر خوان کا ریزہ چیں ہوں اور کسی فقیر کو بھیک مانگنے میں عار نہیں آتی، [اس لیے] مَیں اپنی عرض [کلکتہ کے نواب سید علی اکبر خاں طباطبائی] کی خدمت میں پہنچاتا رہوں گا۔ [کاش] اگر اس کی کوئی سبیل ہو سکے تو اس قوم (انگریز) کے عمائدین میں سے کسی کا ایک سفارشی خط مجھ خاکسار کے بارے میں لے کر [وہ] مسٹر فرانسس ہاکنس صاحب بہادُر ریزیڈنٹ دہلی کے نام بھیج دیں۔[6]

○○○

صبح ہنگامے میں اور آدھا دِن قلم گھسانے میں گزر گیا۔ دِن کے اختتام پر نواب صاحب [باندہ] کی مسند بوسی کی نوید ہے اور رات کو اپنے ساتھ نمکین پانی کے ساتھ کھانے کی دعوت (دی

(4) پرتوروہیلہ 2015ء، ص 373۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 809 (5) پرتوروہیلہ 2015ء، ص 3۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 424-425 (6) پرتوروہیلہ 2015ء، ص 3-4۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 425

گئی) ہے۔ کل صبح اگر مَیں اپنے بستر سے زندہ اٹھا تو [محمد علی خاں صدر امین] کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔[7]

OOO

یکم جمادی الثانی [1245ھ / 29/ نومبر 1829ء] بروز اتوار (جیسے) قیدی زندان میں، بچہ مکتب میں، (اسی طرح) غالبِ پریشاں حال وطن [دہلی] پہنچ گیا۔ دہلی کی عدالت کا تو یہ حال ہے کہ وہاں لوگوں کا دِن بے وفاؤں کی آنکھ سے زیادہ سیاہ ہے۔ نہ اُس (معزول حاکم) کا اختیار باقی ہے اور نہ اِس (موجودہ حاکم) کو یقین یا اعتمادِ کامل نصیب ہے؛ غرضیکہ جو کچھ بھی دُنیا میں ہو رہا ہے، وہ خواص کی فکر میں ہے اور عوام کی زبان پر۔ اس گتھی کا حل کسی کے پاس نہیں ہے۔ منصفانِ بالا کی آمد آمد کا شہرہ (البتہ) دِل بڑھاتا اور تسلی دیتا تھا، (لیکن) اَب اس قافلے کے ہر اول دستے کو، جو بنارس تک پہنچ چکا تھا، واپسی کا حکم ہو گیا ہے۔ سارے لوگ واپس پایۂ تخت چلے گئے اور کوچ اگلے سال پر ملتوی ہو گیا۔ مَیں جب یہاں پہنچا، بے سُود ہر سمت دَوڑتا پھرا اور (فضول) حاکموں سے ملا۔ ایک قصیدہ فرانسس ہاکنس کی خدمت میں پیش کیا، جو اس کی طبعِ نکتہ داں کو پسند آیا۔[8] (اس کے) مصاحبین نے مجھے بتایا کہ اس حاکم نے آج تک امراے دہلی میں سے کسی کی طرف توجہ نہیں دی اور نہ کسی سے میل جول کیا۔ یہ بات خلافِ واقعہ بھی نہیں ہے، کیونکہ پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے پورے ایک گھنٹے تک قصیدہ پڑھنے، کلکتہ کی خبروں کی پوچھ گچھ اور میری نالش کے دائر کرنے کے متعلق بات چیت میں ملتفت رہا۔ مختصر یہ کہ بزعمِ خویش سخن فہم ہے، کیا (ہی) اچھا ہوتا، اگر تھوڑا (سا) معاملہ فہم اور اداشناس بھی ہوتا۔ نہ معلوم، قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اپریل 1829ء میں میرے مقدمے کی رپورٹ دہلی سے مرکزی دفتر گئی اور اُسی ماہ اُس کا جواب بھی آ گیا، لیکن اتفاق سے مرکزی دفتر کے احکام کا پہنچنا، حاکم کی معزولی کا ہنگامہ اور دفتر کے شیرازے کے اَوراق کی پریشانی، یہ سب (واقعات) ایک ہی وقت میں ظہور پذیر ہوئے۔ دفتر کے اراکین نے منصف کے حکم پر فائلیں چھان ماریں اور ورق ورق پلٹ ڈالا، لیکن وہ کاغذ نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ دہلی ریزیڈنسی

---

(7) پرتوروہیلہ 2015ء، ص176۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص606 (8) پرتوروہیلہ 2015ء، ص177۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص607

کے سیکرٹری صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ ہم نے اس مقدمے کے بارے میں مرکز کو لکھا ہے اور اس حکم کا مثنیٰ طلب کیا ہے، تاکہ وقت پر کام آجائے اور کھوئی ہوئی چیز مل جائے۔[9]

افسوس ہے اپنے حال پر کہ قسمت نے مجھے ایران کی خوش گوار آب وہَوا کے شہروں میں نہ پہنچایا۔ ہائے وہ یزد کے آتش کدے اور شیراز کے شراب خانے۔ مانے لیتا ہوں کہ اُس بہارستان میں نہیں پہنچا، (تاہم) جنت البلادِ بنگالہ کیا کم تھی کہ مجھے اس خارزار [دہلی] میں لے آئی۔[10]

پہلی بجلی، جو [دہلی] پہنچنے کے ساتھ ہی میری نظر پر گری، وہ بھائی کی نشست وبرخاست کی روش کا مشاہدہ تھا کہ بیماری کی شدت کے سبب ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا اور اس کے جسم کے خون کا ہر قطرہ سوداویت کی انتہا سے نقطۂ سیاہ ہو گیا تھا۔ جس حال کو بے عقل لوگ درست خیال کر رہے تھے، ہر گز افاقہ نہیں تھا، (بلکہ) وہ بھی فنونِ جنوں کا ایک رنگ تھا؛ غرضیکہ مَیں یہ سوچتا تھا کہ اگر یہ حال زائل ہو جائے اور مرض صحت میں تبدیل ہو جائے (تو) کیسا عجوبہ ہو گا، لیکن اَب تو مریض کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ طبیعت شفا کو قبول نہیں کر رہی، (چنانچہ) مَیں اپنی آنکھوں کے ذریعے یقین کی اُس منزل پر پہنچا ہوں کہ مرزا یوسُف تاحیات بیمار ہی رہے گا اور بس![11]

ooo

[نواب] احمد بخش خاں سے مجھے دو شکایات تھیں اور ہیں۔ پہلی تو پنشن میں بغیر کسی خطا و جرم کے کمی کر دینی اور دوسری بغیر کسی استحقاق کے ثبوت کے، خواجہ حاجی کی (پنشن میں) شمولیت ہے۔[12] اب کہ بات عدالت تک پہنچ چکی ہے، بالفرض اگر نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کا پنشن پورے پانچ ہزار بھی قرار پائے، مجھے (پھر بھی) خواجہ حاجی کی شمولیت پر شکایت ہو گی۔ خدا کی قسم، [مرزا افضل] مجھے آزار پہنچانے کے درپَے ہے اور (اس نے) اپنی بہن [زوجہ خواجہ حاجی] کی اَولاد کی مدد کو اس ایذا رسانی کی سند بنا لیا ہے۔[13]

ooo

(**9**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 177۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 607-608 (**10**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 178۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 608 (**11**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 178۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 608 (**12**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 86۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 508 (**13**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 87۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 509

مرکزی دفتر سے (دستاویز کی)[نقل] آ گئی۔[14] 4/ر جنوری [1830ء] دہلی کے فرماں روا [فرانسس ہاکنس][15] نے اس کو دیکھا اور پھر شمس الدین [احمد] خاں کو خط لکھا اور پھر نصر اللہ خاں کے متعلقین کا احوال دوبارہ معلوم کرنا چاہا۔[16] خدا کا شکر ہے کہ تفتیش کا دروازہ (تو) کھلا:

چونکہ محمد اسد اللہ خاں کے دعوے کے مقدمے کی تحقیقات کا حکم صدر دفتر سے پہنچا ہے، خانِ مذکور کی عرضی کی نقل اس خط کے ساتھ منسلک ہو کر قلمِ محبت رقم کے سپرد کی جاتی ہے، تاکہ اس کے مضمون کے معنی سمجھ کر اس کا مفصل جواب دیا جائے۔ فقط

تاحال صدر دفتر کے احکام کے اجرا پر ریزیڈنسی سے کوئی عمل نہیں ہُوا، تاہم حاکمِ دہلی کی فطرت میں کسی کی جانب داری یا مخالفت پائی ہی نہیں جاتی اور حسنِ اتفاق یہ ہے کہ دفتر کے کارکنوں میں سے بھی کوئی میرا شناسا نہیں۔[17] مدعا علیہ [نواب شمس الدین احمد خاں] نے جواب بھیجا کہ جنرل لارڈ لیک بہادُر کے مُہر زدہ پروانے کے مطابق اس جماعت کو پانچ ہزار روپے سالانہ دے رہا ہوں۔ حاکم نے معائنہ کے لیے اصل سند منگوائی۔[18] مدعا علیہ نے ایک سند، جس پر جنرل لیک کی مہر لگی ہوئی تھی اور جو پانچ ہزار روپے سالانہ پر مشتمل تھی، بھجوا دی۔ حاکم نے مجھ سے اس کا جواب مانگا۔ مَیں نے اس سند کا جواب محکمے کے دفتر پہنچا دیا۔ دراصل یہ سند جعلی ہے اور مَیں نے اس سند کے جعلی ہونے کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ ان میں سے ایک (دلیل) یہ ہے کہ دلّی سے کلکتہ تک اس سند کی نقل کسی دفتر میں نہیں ہے۔[19]

اولاً مجھے اہلِ حکومت کے اربابِ عدل و انصاف کی ڈھارس ہے اور دوسرے مجھے اپنی حق گوئی پر اعتماد ہے اور اللہ کرتا ہے، جو چاہتا ہے اور حکم کرتا ہے، جو ارادہ کرتا ہے۔ مَیں نے اپنے کام خدا کے حوالے کر دیے ہیں اور مجھے اپنے دشمنوں کے انبوہ سے خوف نہیں۔[20]

OOO

(**14**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 88۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 510 (**15**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 179۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 609 (**16**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 86۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 507 (**17**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 179۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 609 (**18**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 86۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 507 (**19**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 88۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 510 (**20**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 86۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 508

اب اگر کچھ اَور دِن حالات اسی نہج پر چلتے ہیں تو خاندان کے خاندان سیلابِ فنا میں غرق ہو جائیں گے۔ خاص کر اس دیار میں، جہاں خواص نے بھی چغل خوری اور افترا پردازی کا شیوہ اختیار کر رکھا ہے۔ حکام ان لوگوں کی گفتگو پر کان دھرتے ہیں۔ نجانے کتنے بندگانِ خدا ہیں کہ اپنے اموال و املاک کے معاملے میں خوف زدہ ہیں۔ خستہ خاطروں کی جان نوازی کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے زخمِ دِل کے مرہم کا حصول مرکز کے دارالشفاہی میں ممکن ہے۔[21]

کچھ وقت کے لیے مَیں نے سعیِ آوارگی کو چھوڑا اور دہلی کے ایک گوشے میں پاؤں دامن میں سمیٹ کر بیٹھ گیا۔[22] بزمِ خیال میں امیدِ موہوم کا چراغ جلائے ہوئے ہوں۔ حاکمانِ صدر کی داد گری کی طرف سے مَیں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔[23] کسی ماتم زدہ کا دِل کچھ یونہی تو تسکین نہیں پاتا اور ایک خستہ جگر بہر حال مرہم کا طلب گار ہوتا ہے۔(نواب گورنر جنرل بہادُر کی طرف سے)مارچ کے سفر میں مہربانی ہو جائے اور حق، حقیقی حقدار کو پہنچ جائے اور[مولوی سراج الدین احمد]اس کے ظہور میں کوشش کریں تو میری اپنے دِلی مقصد تک رسائی آسان ہو جائے۔[24]

سنا جا رہا تھا کہ نواب گورنر جنرل بہادُر حسبِ دستور سفر کرتے اور انصاف فرماتے ہوئے اُدھر سے اِدھر آئیں گے اور دہلی پہنچیں گے۔ اَب اچانک یہ خبر آئی ہے کہ گورنر جنرل کی سواری صرف الٰہ آباد تک آئے گی اور بس۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نواب معلی القاب الٰہ آباد تک آئیں گے اور وہیں سے کلکتہ واپس ہو جائیں گے؛ بعض افراد کا کہنا ہے کہ دو تین دِن اس بقعۂ زمین میں قیام رہے گا اور گورنر جنرل وہاں آرام فرمائیں گے۔ میرا دِل اسی کشاکش میں گرفتار ہے اور اس شورش میں مبتلا۔ جب اس کا سرشتہ کہیں ہاتھ نہیں آتا تو کسی کی بات پر یقین بھی نہیں ہوتا۔[25]

○○○

(**21**) تنویر احمد علوی2016ء، ص 105۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 478 (**22**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 97۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 493 (**23**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 105۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 478 (**24**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 104۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 481 (**25**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 112-113۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 490

اہلِ نظر میں، جو بھی شخص مجھے دیکھتا ہے، وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ راہرو، منزل پر پہنچ گیا ہے اور اپنے وطن میں آرام کر رہا ہے، بلکہ یہ خیال کرتا ہے کہ مَیں کوئی درد مند ہوں، جو وطن سے دُور نکل آیا ہے اور جو تازہ تازہ غربت کا داغ کھائے ہوئے ہے۔ جس شخص کا مولوی سراج الدین احمد، مرزا احمد بیگ خاں[طپاں]، مرزا ابوالقاسم خاں اور آغاز محمد حسین کا ساتھ چھوٹ گیا ہو، اس کو تو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ ان تین برسوں کے دَوران کہ جو وطن سے دُوری اور صحرانوردی میں گزرے، دہلی کے بڑے لوگوں کی رسم وراہ بدل گئی۔ احباب کی طبیعت میں مہر ووفا باقی نہ رہی۔ جب سے یہاں آیا ہوں، ہر طرف دیکھ رہا ہوں اور کسی بھی طبیعت میں مجھے محبت کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ حاکم بخود مشغول ہے اور جس کو منصب سپرد کیا گیا، اس نے شہر کو پریشانیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ اَب بہتری کی کوئی امید اس سے زیادہ نہیں کہ کوئی یہ سوچے کہ آبجُو سے نکلا ہُوا پانی پھر آبجُو میں واپس آجائے گا؛ لیکن یہاں جو کچھ ہے، وہ عام لوگوں کی زبان پر اور خاص لوگوں کے گمان میں ہے، سر رشتہ کار کسی پر ظاہر نہیں۔[26]

اس وقت عدالت کا یہ حال ہے کہ حاکم نے میل ملاقات بند کر دی ہے، (چنانچہ) کام بگڑے ہوئے ہیں۔ دفتر کے اہلکار قسمیں کھاتے ہیں کہ سوائے پروانۂ راہداری کے اَور کسی تحریر کو ہم نے ہاتھ نہیں لگایا ہے اور مشاہدہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ جب تک حاکم پذیرائی کرتا تھا، مَیں بھی جاتا اور (اس کے پاس) بیٹھا کرتا۔ چونکہ شعر وسخن کا ذوق رکھتا تھا، اس لیے اکثر اوقات اسی ضمن میں بات چیت ہُوا کرتی اور مطلب کی بات بھی کہہ دی جاتی۔ اَب کہ فتنے کی گرد اُٹھی ہے تو مَیں کیا، کسی شخص کی بھی حاکم تک رسائی نہیں۔ (لوگ) کہتے ہیں، حاکم یہ چاہتا ہے کہ اگر مجھے مرکزی دفتر ہی سے استحکامِ کار کی خوش خبری ملے تو (مَیں بھی) کام کی طرف توجہ دوں۔[27]

پرنسپ صاحب [سیکرٹری ٹیریٹوریل ڈیپارٹمنٹ] کا اس معاملے سے تعلق ہی نہیں ہے، لیکن چونکہ مجھ سے اور میرے مقدمے سے قدرے واقف ہیں اور اپنے عہدِ حکومت میں انھوں نے نوابِ والا منقبت کی خدمت میں میری قدر افزائی کی ہے اور میرے استحقاق کو سراہا ہے، (اس

---

(26) تنویر احمد علوی 2016ء، ص97-98۔ فارسی متن: پرتوروہیلہ 2015ء، ص493-494 (27) پرتوروہیلہ 2015ء، ص88۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص510

لیے مَیں نے ان کو) دوستانہ خط لکھا ہے۔ [اگر] اتنا ہو جائے کہ [وہ] میرا خط وصول کر لے اور میرے وکیل کو وکالت کے لیے قبول کر لے، اس کے بعد معاملات بہت اچھے اور امیدیں بہت۔[28]

❍❍❍

ماہِ مئی [1830ء] کی چار اور [ذی قعد 1245ھ] کی گیارہ تاریخ تھی، میرے مقدمہ کی رپورٹ اس داد گاہ سے صدر روانہ ہوئی۔ ہائے ہائے، کیا رپورٹ اور کیا مقدمہ۔ رپورٹ ایک جہانِ آرزو کے واسطے فتوائے خوں ریزی اور رپورٹ کہ اسے ریزشِ آبرو کا فرمان کہنا چاہیے۔ چونکہ مَیں حاکمِ شہر کو شروع شروع میں اپنے حال پر مہربان تصور کرتا تھا، اَب مجھے شرم آتی ہے کہ بات کو بڑھاؤں اور شکوہ سنجی کی راہ اختیار کروں۔[29] مئی کی 12/ تاریخ تھی اور شمع وچراغ رَوشن کرنے کا وقت آ گیا تھا کہ محکمہ ایجنٹی کا اردلی پہنچا اور مجھے [کمشنر دہلی] ولیم فریزر بہادُر کا خط پہنچایا۔ بارے ملفوف کو وا کیا تو پتا چلا کہ اس میں میکناٹن صاحب کا خط بھی لپٹا ہُوا ہے۔ مضمون یہ تھا کہ ہاکنس صاحب کی تجویز کو منظور کیا جاتا ہے۔ مرزبانِ میوات (رئیس فیروزپور جھرکہ کی) پیش مہر اور دستخط صحیح ہیں اور سرکار میں مندرج بندوبست غیر واضح اور نامکمل ہے۔[30] [غرض] وہ رپورٹ مسٹر فرانسس ہاکنس نے مقدمے کے بارے میں مرکزی دفتر بھجوائی ہے، کیا بتاؤں کہ کس قدر امید شکن اور غم افزا رہی ہے۔ مجھے میدانِ فنا کے اُس تیز گام کی مشکل کشائی پر بھروسا تھا۔ مدعیِ ناانصاف نے (میرے) مقصد کی راہ میں جو فساد کی گرد اڑائی ہے، کیا بتاؤں، کتنی نظارہ سوز اور جانکاہ ثابت ہوئی۔ اَب تو دونوں طرف سے آسمان دشمن کی کامیابی کے درپے ہے۔[31]

❍❍❍

ذی الحجہ [1245ھ] کی پندرھویں تاریخ [7/ جون 1830ء] اور پیر کا روز تھا، میرے مُنھ میں خاک، [23/ مئی 1830ء کو] مسٹر اسٹرلنگ نے جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اَب کس سے غمخواری کی امید رکھوں اور دِل کو کس کی گردشِ چشم کے خیال سے تسکین دوں۔[32]

---

(28) پرتو روہیلہ 2015ء، ص89۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص511 **(29)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص109۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص483 **(30)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص113-114۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص496-497 **(31)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص94۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص516 **(32)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص94۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص516

حیران ہوں کہ ایک اقبال مند، جواں سال حاکم کی اچانک موت میں کیا حکمت تھی اور قضا و قدر کے دفترِ اعلیٰ کے کارکنوں کو اس واقعہ سے کون سا عظیم نتیجہ نکالنا منظور تھا۔ اَب معلوم ہُوا کہ غالبِ بدبخت کی امید کو سیلابِ فنا میں بہا دینا مقصود تھا اور اس کی صورت نہیں نکلتی تھی، بجز اس طوفانِ ہوش رُبا کے ظہور کے۔[33]

اُس خرابِ آباد کے حاکم نے کہ جس کو فرانسس ہاکنس کہتے ہیں، فیروز پور کے جاگیر دار کے ساتھ رشتۂ محبت و الفت باندھ کر یہ چاہا کہ مجھے مروا ڈالیں، (لہٰذا) اپنی مرضی کے مطابق ایک رپورٹ مرکزی دفتر بھجوا دی۔ کیا جانوں کہ میرے بُرے نصیب نے وہاں میرے ساتھ کیا کِیا؟ اِس جگہ اسسٹنٹ ریزیڈنٹ صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ مسٹر فرانسس ہاکنس صاحب بہادُر فرماتے ہیں کہ [اینڈریو اسٹرلنگ کی رائے کے مطابق] ہماری یہ تجویز ہے اور ہم نے یہی حکم دیا ہے کہ نصراللہ بیگ خاں کے متعلقین فیروز پور کے جاگیر دار کی پیش کی ہوئی سند کے مطابق پانچ ہزار روپے سالانہ، جس طرح ماضی میں حاصل کرتے رہے ہیں، آئندہ (بھی) پاتے رہیں گے۔[34]

[فرانسس ہاکنس نے یہ فیصلہ اینڈریو اسٹرلنگ کے 5/ مئی 1830ء کی رَوشنی میں کیا ہو گا، جس کے مطابق] اسد اللہ خاں کو اس سے زیادہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں، جتنا لارڈ لیک صاحب بہادُر نے اُن کے اور اُن کے بھائی مرزا یوسُف کے لیے مقرر کر دیا تھا، یعنی پندرہ سو روپے سالانہ، جو نواب شمس الدین خاں ہمیشہ ادا کرنے کے لیے تیار رہے ہیں۔[35]

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ یہ بندۂ خدا کیا کہتا ہے۔ اس پانچ ہزار کی بابت تو مَیں نے خود کونسل کو بتلایا تھا اور اس (رقم کی) مقدار پر اپنی ناراضی کا اظہار کر کے ہی تو مَیں نئے فیصلے کا طلب گار ہوں۔ سابقہ کونسل کی تجویز کا کیا ہُوا اور مرکزی دفتر کے حکام کو کیا پیش آیا؟ کرنل میلکم صاحب [گورنر بمبئی] کی سند پر مندرجہ دس ہزار روپے کون لے اُڑا؟ خدا کی قسم، اِس وقت شش جہت سے چارہ جوئی کے دروازے بند ہیں اور دُنیا مجھے اپنی مخالف نظر آ رہی ہے۔[36] کونسل میں ایسا اتفاق کبھی نہیں ہُوا ہو گا کہ تجویزِ سابق کو اسی طرح اٹھا پھینکیں۔ حاکمِ دہلی شروع میں مجھ پر مہربان

(**33**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص96۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص519 (**34**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص96-97۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص519 (**35**) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص107 (**36**) پرتو روہیلہ 2015ء ⇦

تھا، لیکن آخر آخر میں دشمنوں کی چغل خوری کارگر ہوگئی اور [وہ] دشمن کا طرف دار بن گیا اور مجھ سے مُنھ پھیر لیا۔ دشمن کی پیش کی ہوئی سند کو مرکزی دفتر کے اراکین کو درست اور سنجیدہ طریقے سے دِکھایا اور وہ جواب کہ جو مَیں نے دیا تھا او وہ دو وَرق، جو مَیں نے ظالموں کے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کر کے محکمے کو بھیجے تھے، رپورٹ میں شامل نہ کیے اور میرے مقدمے کا کونسل میں یک طرفہ فیصلہ ہو گیا۔[37] اس حاکم کی بے تمیزی اور ناانصافی سے میرے کام میں ایسی کھنڈت پڑ گئی کہ ہزار زبان سے بھی اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔[38] عوام کے تمسخر اور خواص کی ملامت کا قدرے آزار برداشت کرتا ہوں اور وہ بھی گزر ہی جائے گا۔[39] میرا گمان یہ ہے کہ مَیں ناکام نہ ہوں گا۔ ہاں، مجھے حاکمِ اعلیٰ تک پہنچنا چاہیے، اس لیے کہ مَیں اپنے حقیقی و تحقیقی حق کو جانتا ہوں اور ایسا کوئی آدمی محروم نہیں کیا جا سکتا۔[40] مَیں نے چاہا ہے کہ ایک عرضداشت نواب گورنر جنرل بہادُر کے ذریعے سائمن فریزر بہادُر کی خدمت میں ارسال کروں، تاکہ انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہو جائے، بلکہ اس کا کچھ ابتدائی حال سیکرٹری صاحب کے بھی گوش گزار [ہو جائے]، تاکہ [وہ] ایک ناکام کا خیال کریں اور ایک واماندہ کو پہچانیں۔[41]

❍❍❍

یہ معلوم کر کے کہ نواب گورنر بہادُر گیارھویں اکتوبر کو ہندوستان روانہ ہو گئے ہیں اور پرنسپ صاحب نے محکمہ سیکرٹری میں فتح مندی کے ساتھ قدم رکھا ہے، ایسی حیرت میں ڈال دیا ہے کہ جس کی گتھی سرکاری اہلکاروں کی توجہ کے ناخن کے کھولنے کے لائق ہے۔ مستقل یہ خبریں آتی رہیں اور عوام میں پھیل گئیں کہ فارسی اور انگریزی کے دفتروں میں الحاق ہو گیا ہے اور ان دونوں دفاتر کی افسری کے لیے مسٹر سونتین بہادُر کا فیصلہ ہُوا ہے۔[42]

⇦ص97۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص519 **(37)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص357۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص791 **(38)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص374۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص810 **(39)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 357۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 791 **(40)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 108۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء ص482 **(41)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص97۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص519-520 **(42)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص97-98۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص520

[میری عرضداشت پر جی سوئنٹن (چیف سیکرٹری) نے رپورٹ دی کہ] نواب شمس الدین نے [فرانسس] ہاکنس کے مراسلے، جو گزشتہ 5/ مئی کو پیش کیا گیا تھا، میں بڑی غیر سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ ان کی رائے سے کہ وہ (غالب) ایک شاعر ہے اور شاعر کے اس استحقاق سے وہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے اور پورا فائدہ اٹھاتا ہے، اسد اللہ کے دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ہمیں مقدمے کا سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے۔ ہمیں احمد بخش خاں کو عطا کی گئی سند مؤرخہ 4/ مئی 1806ء کا جائزہ لینا چاہیے، جو اصل و حقیقی ہے اور گورنر جنرل صاحب بہادرانِ کونسل نے اس کی توثیق کی تھی۔ اس کی ایک نقل سر جان میلکم کے اسی تاریخ کے مراسلے میں شامل ہے اور وہیں دیکھی جا سکتی ہے۔ وظیفے کی مد میں حقیقتاً نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے لیے دس ہزار روپے رکھے گئے ہیں، لیکن بدقسمتی سے جس ڈھیلے ڈھالے انداز میں 4/ مئی 1806ء کی سند کو الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہے، اس میں ٹھیک رقم کا کوئی ذکر نہیں۔ زرِ استثنیٰ کو ایک مقررہ مقصد، یعنی نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کی کفالت اور گزر اوقات کے لیے پچیس ہزار سے کم کر کے پندرہ ہزار کر دیا گیا ہے۔ اس میں کنایتاً مذکورہ بالا منہائیوں اور شرائط کا ذکر تو کیا گیا ہے، لیکن منہائی اور شرائط کے الفاظ عمومی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ لارڈ لیک صاحب بہادر نے، جو اُس وقت کانپور میں تھے، 4/ مئی کو یہ پروانہ عطا کرنے اور اسی مہینے کی سولہ تاریخ کو حکومت کا جواب ملنے کے بعد، جس میں جو کچھ کہا گیا تھا، اس کی منظوری دی گئی تھی، احمد بخش خاں کو یہ بتانے کے لیے کہ گزشتہ مہینے کی سولہ تاریخ کو کیا طے پایا، 7/ جون کو دوبارہ خط لکھا ہو؟ نواب احمد بخش کی درخواست پر (جو اُس وقت لارڈ لیک صاحب بہادر کی معیت میں کانپور میں تھے) لکھا تھا کہ اگر لارڈ موصوف نے 7/ جون کا خط لکھا تھا تو کرنل میلکم صاحب بہادر نے، جنھوں نے چند روز بعد (10/ جون) 16/ مئی کے سرکاری احکامات کے وصول پانے کی اطلاع دی تھی، یہ رپورٹ کیوں نہ دی کہ احمد بخش خاں کو ایک خط ارسال کیا گیا ہے، جس میں پانچ ہزار روپے کی ایک معینہ رقم نصر اللہ بیگ خاں کے خاندان والوں کی کفالت کے لیے مقرر کی گئی ہے اور ان اسباب کی وضاحت کی گئی ہے، جن کی بنا پر زرِ استثنیٰ کی بقیہ رقم وظیفے میں دوبارہ شامل نہیں کی گئی، جو نواب کی

جاگیر سے ادا کی جاتی ہے؟ لیکن ایسی کوئی رپورٹ نہیں۔ اگر دستاویز اصلی ہے تو یہ بعید از قیاس نہیں کہ احمد بخش نے یہ فریب اور دھوکا سے حاصل کی ہو، لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایک ایسا حکم ہے، جو لارڈ لیک صاحب بہادُر نے اپنی رضامندی سے جاری کیا ہے تو کیا لارڈ موصوف اتنے بااختیار تھے کہ بغیر گورنر جنرل ان کونسل کے منظور کیے ہوئے، کسی سابقہ فیصلے کو درہم برہم کر سکیں اور کیا حکومت اس کی پابند ہو گی؟ مجھے یہ تصور بھی نہیں کرنا چاہیے اور خواہ یہ دستاویز اصلی ہو یا جعلی، ظاہر یہی ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے اقربا زیادہ وظیفے کے حق دار ہیں۔[43]

[لیکن جب مزید جانچ کے لیے یہ دستاویز چیف سیکرٹری برائے حکومتِ بمبئی سی نورس کو ارسال کی تو گورنر جنرل کا یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ] فارسی خط کی پشت پر انگریزی زبان میں کوئی تصدیقی دستخط نہیں ہیں، جیسا کہ دستور ہے کہ دفتر فارسی کے معتمد کے دفتر سے فارسی زبان میں جاری کیے جانے والے خط کی پشت پر دستخط ہُوا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے یہ حکم لکھوا کر باقاعدہ دفتر میں داخل نہیں کیا، بلکہ اپنے پاس رکھ لیا۔[44]

حیران ہوں کہ مَیں دہلی میں ایسے اندھیر سے دوچار کہ خدا دشمن کو نہ دِکھائے، واماندہ پڑا ہوں اور کلکتہ کے مہربانوں نے مجھ سے رُخِ التفات یکسر موڑ لیا ہے۔[45] مرزا ابوالقاسم خاں اور آغا محمد حسین کے حال پر افسوس اور اس سے بڑھ کر اپنی زندگی پر افسوس کہ [مرزا افضل] بیگ کلکتے میں آگ بھڑکانے میں مصروف اور مَیں اس شہرِ بے شہریار میں پتّھروں سے سر پھوڑ رہا ہوں اور ناکامی میں جان دے رہا ہوں، کوئی میری آہ و بکا نہیں سنتا۔[46] شاید کلکتہ کے خاص و عام پر اس [مرزا افضل بیگ] کا حکم چلتا ہے کہ سارے دوست اس کی پیروی پر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں، [میرے خلاف] ان کا غیظ و غضب بڑھ رہا ہے اور ان کی وفا میں کمی آ رہی ہے۔[47] بخدا، دہلی میں وہ توانائی نہیں کہ کوئی آزادہ منش یہاں خاک نشین بن جائے۔ نیت یہ ہے کہ جب یہ مقدمہ ختم ہو جائے تو کسی بہانے سے اس شہر سے نکل کھڑا ہوں اور کلکتہ پہنچ جاؤں۔[48]

---

(43) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص 115-116 (44) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص 117 **(45)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 357۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 811 **(46)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 98۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 520 **(47)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 357۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 811 **(48)** ⇦

○○○

[30/ نومبر 1830ء کو چیف سیکرٹری بمبئی نے بتایا کہ] اس سند پر لارڈ لیک صاحب بہادُر کے دستخط ثبت ہیں۔ جس زمانے میں یہ حاصل کی گئی تھی، اُس وقت واجبات کی ادائیگی کر دی گئی تھی۔ معزز ہندوستانی باشندے احمد بخش خاں کو لارڈ لیک صاحب بہادُر اور ان کے دیگر واقف کاروں کا بھرپور اعتماد حاصل تھا، نیز مقامی باشندوں کی دیانت دارانہ نظر میں بھی وہ قابلِ احترام تھے۔ ایسی صورتِ حال کہ ان پر غیر دیانت دارانہ طرزِ عمل کے لگائے گئے الزامات کے خلاف صفائی پیش کی جاسکتی ہے۔ اگر وہ ان نازیبا اقدامات کو قرار واقعی مرتکب ہوتے تو میرے خیال میں کسی نہ کسی فریق کی جانب سے ان پر اعتراضات ضرور صادر کیے جاتے۔[49]

[چونکہ مجھے اس دستاویز کے جعلی ہونے پر اصرار تھا، چنانچہ مَیں نے گورنر جنرل (ولیم بنٹنک) کو مطلع کیا کہ] اس سند پر لگی ہوئی مہر اور دستخط سب جعلی ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ سند مرحوم نواب احمد بخش خاں نے اپنی رہائش گاہ پر تیار کی اور لکھوائی اور عملے کو رشوت دے کر اُس زمانے میں، جب لارڈ لیک صاحب بہادُر دوسرے اہم امور و معاملات میں بہت الجھے ہوئے تھے، اس دستاویز کو فارسی زبان کی دوسری ڈھیروں دستاویزات اور کاغذات میں رکھ کر، جو روزانہ دستخط کے لیے اُن کے سامنے گزاری جاتی تھی، یہ درخواست بھی پیش کروائی، اس پر دستخط حاصل کر لیے اور یہ اپنی نوعیت کا بدترین فریب اور انتہائی گھٹیا اور خطرناک جعل سازی ہے۔[50]

[میری اس درخواست کا اُلٹا اثر ہُوا اور فرانسس ہاکنس نے 8/ اکتوبر 1830ء کو سونتین، چیف سیکرٹری کو بتایا کہ] نواب صاحب (شمس الدین احمد خاں) نے مطلوبہ خط، جو فارسی میں لکھا ہُوا ہے اور جس پر لارڈ لیک بہادُر کی مہر اور دستخط ثبت ہیں، مجھے ارسال کر دیا ہے اور اسے پیش کرتے ہوئے مجھے امید ہے کہ اس طرح یقین ہو جائے گا، جس طرح مجھے گزشتہ مئی میں اُس وقت یقین ہو گیا تھا، جب مَیں نے اسے دیکھا تھا اور مَیں نے اسد اللّٰہ خاں کے دعوے میں رپورٹ دی تھی اور اس شخص کے جھوٹے دعوے کو تسلیم کرنے کی اذیت میں مبتلا نہیں ہو گی، جس نے نہ

⇦ پرتوروہیلہ 2015ء، ص354۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص787 (**49**) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص117-118 (**50**) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص118

صرف حکومت کو، بلکہ آپ کو اور مجھے بہت پریشان کیا اور نواب کی دِل شکنی کی۔ اَب وہ [غالب] سزا سے نہیں بچ سکے گا۔[51]

○○○

تین ماہ ہو گئے کہ مخدومی مرزا احمد بیگ [طپاں] اور ابو القاسم خاں نے رسم و راہِ محبت کو ترک کر رکھا ہے اور بے مروّتی کے راستے پر گامزن ہیں۔ مولوی سراج الدین احمد کانپور پہنچ گئے ہیں، 'افسوس! کلکتہ میں کوئی ایسا نہ رہا، جو میری طرف سے چارہ جوئی اور میری رہنمائی کر سکے۔[52]

○○○

مَیں اور میرا دِل آئنہ دارِ راز ہے۔ وہ گواہی دے رہا ہے، اس تفرقہ کو نظر میں رکھتے ہوئے، جو حکومت کے قوانین پر گہرے طور پر اثر انداز ہُوا ہے، نیز اس کشاکش کے باعث، جو میرے سر رشتہ کار میں لگی ہوئی ہے، اگر فی المثل میرے متعلق یہ حکم صادر ہو کہ مجھے قتل کر دیا جائے تو میرے لیے یہ بھی غیر متوقع بات نہ ہو گی۔ جب انصاف ہی دُنیا سے اٹھ گیا تو پھر اَب کچھ بھی ہو سکتا ہے اور جو ہونا ہے، وہ ہو جائے گا۔[53]

[31؍ دسمبر 1830ء کو جارج سوئنتن نے ریزیڈنٹ دہلی ڈبلیو بی مارٹن کو ہدایت کی کہ وہ نواب شمس الدین احمد خاں سے اصل دستاویز حاصل کر کے کلکتہ بھیجے۔ دستاویز کے ملاحظہ کے بعد انھوں نے پرنسپ کے نام ایک خط میں مطلع کیا کہ] حضور والا (گورنر جنرل) نصر اللّٰہ خاں کے متوسلین کی مالی امداد کے ضمن میں فیروز پور کے جاگیر دار کے کیے ہوئے انتظام و انصرام میں مداخلت پسند نہیں فرمائیں گے۔[54]

چونکہ مَیں صرف حقیقی حق کے ظہور کا طلب گار ہوں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں؛ کتنی بھی تحقیق کیوں نہ ہو، مطلب کے مطابق اور میری آرزو کے حق میں ہے۔ مَیں نے شروع ہی میں سرکار کے دفتر کو گواہ بنایا ہے اور مرکزی دفتر کے حکام نے جناب میلکم صاحب بہادُر کے خط کو محکمہ

(**51**) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص 119 (**52**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص102-103۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء ص480-481 (**53**) تنویر احمد علوی 2016ء ص117-118۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء ص498 (**54**) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص119

ریزیڈنٹی دہلی میں بھیج دیا ہے اور میری پرورش کے اخراجات کی مقدار اُس تحریر کے مطابق متعین کی ہے۔ چونکہ مرکزی دفتر کے حکام نے مدعاعلیہ کی ارسال کردہ سند کو میلکم کے پاس بھیج دیا ہے۔ یہ میرے لیے خوش خبری ہے کہ میرا داغ مرہم تک اور میرا مرض دوا تک پہنچ گیا۔[55]

OOO

حاکمِ دہلی نے حاکمِ میوات کے وکیل کو اپنے پاس بلایا اور پیش کردہ کاغذ اس کو واپس دیتے ہوئے کہا کہ یہ جعلی ہے۔ اس کاغذ کی مہر اور دستخط مستند نہیں اور سر جان میلکم نے (بھی) اپنے تدبر اور تجربے کے ساتھ (اس حقیقت کو) جان لیا ہے۔ اب میرے رشتۂ خیال میں چند گرہیں پڑ گئی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ سر جان میلکم نے اس فارسی کی بے نشان دستاویز کو (جعلی) ٹھہرایا ہے تو اس انگریزی رپورٹ کو بھی، جو (اس کی ہی بنا پر) سرکاری دفتر میں تیار کی گئی ہے، غلط بتایا ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ فارسی خط اس انگریزی رپورٹ کی تنسیخ نہیں کر سکتا تو اتنی جلدی کس طرح واپس آ گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ دونوں دستاویزات کو مقابلہ کیا جاتا، تاکہ (معاملہ زیرِ غور) کا فیصلہ ہو جاتا۔ تیسرے یہ کہ یہ فارسی کا خط، جو مدعاعلیہ ہی کا پیش کردہ ہے، جب اس کو واپس کر دیا گیا تو مدعی سے یہ کیوں نہ کہا گیا کہ اس میں لکھی ہوئی رقم وصول کرے اور زیادہ شور نہ مچائے۔[56]

OOO

اہلِ دفتر سے معلوم ہُوا کہ 'پرنسپ صاحب نے غالبِ سرگشتہ کے مقدمے کے کاغذات مرکزی دفتر کے حکم کے مطابق جمع کر کے مسل مرتب کر لی ہے'، لیکن وہ سارے کاغذات تاحال طاقِ نسیان پر گلدستے کی صورت ہیں۔[57]

OOO

اپنے منصف خدا کا شکر گزار ہوں کہ جسم کی اس لاغری کے باوجود اس نے ایسا مضبوط اور تنومند دِل دیا ہے کہ اگر دونوں عالم تلپٹ ہو جائیں، تب بھی مجھ پر اثر نہ ہو گا اور ان سب امور کے باوجود [دوستوں کے معاملے میں] پاسِ وفا میں ایسا ثابت قدم ہوں کہ اگر سر کٹ جائے، راہِ وفا سے میرے پاؤں نہیں لڑکھڑائیں گے۔[58]

(**55**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص89-99۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص521 (**56**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص60۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص480 (**57**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص102۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص526 ⇦

OOO

آج [5/ اگست 1831ء کو] **جامِ جہاں نما** کے اَوراق دیکھ کر ایسا نیا حال معلوم ہُوا کہ اُس رسوائی پر صبر نہیں کیا جاسکتا۔ خواجہ رحمت نام کے ایک حرامی نے کہ جو بریلی کے سادھو بچوں میں سے ہے اور ایک فتنہ پرداز جادوگر ہے، شمس الدین خاں کو اپنی جادوبیانی سے مطیع کر لیا ہے اور اس کے دِل میں ایسا گھر بنالیا ہے کہ شمس الدین خاں کے لیے اس کے دائرۂ حکم سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہا ہے۔ خبر نگاروں کو مال و قال سے اپنا فریفتہ کر کے، جو خبر بھی چاہتا ہے، اطراف میں بھیج دیتا ہے۔[59] [چنانچہ مَیں نے ادارۂ **جامِ جہاں نما** سے التماس کی کہ] یہ ننگِ وجود کہ جس کا نام اسد اللہ خاں ہے اور جو مرزانوشہ کے نام سے معروف ہے اور جس کا تخلص غالب ہے، اپنا حق کہ انگریزی سرکار کا عطیہ ہے، فیروزپور کے جاگیر دار سے طلب کر رہا ہے، لیکن چونکہ جاگیر دار فیروزپور دولت مند اور مَیں مفلس، خاص و عام کے گروہ کے گروہ اُس [جاگیر دار فیروپور] کی حمایت میں متفق و متحد ہیں۔ اس وجہ سے سارے خبر نگار، ریزیڈنٹی کے دفتر میں اُس ثواب کی خاطر کہ جو انھیں میرے آزار سے ملنے کی امید ہے، میرے مقدمے کے احوال کو نامناسب عنوانات سے مذکور و مشہور کر رہے ہیں اور **جامِ جہاں نما** کے مطبع میں بھی بھیج رہے ہیں اور یہ خلافِ واقعہ خبریں چھپ بھی رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ پورے شہر سے لڑا نہیں جاسکتا اور (ساری) مخلوق کو اپنے حال سے سے آگاہ نہیں کیا جاسکتا۔ مجبوراً دشمنوں کے دبدبے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں اور مطبع کے عمائدین سے یہ چاہتا ہوں کہ بے کسوں کی حمایت پر توجہ دیں اور یہ چند سطور اَوراقِ **جامِ جہاں نما** میں چھاپ دیں اور آئندہ جو خبر بھی کہ اس سرگشتہ و گمنام کے بارے میں دہلی سے پہنچے، اس کو نظر انداز کریں اور **جامِ جہاں نما** میں نہ چھاپیں۔ یہ درخواست ہمیشہ کے لیے ہے اور مجھے اس التماس کے قبول کیے جانے پر اصرار ہے۔[60]

ان اندھیرے دنوں [13/ اگست 1831ء] میں، جب نواب گورنر جنرل بہادُر اس شہر میں دوسری بار آرہے ہیں، مَیں حیران و پریشان گلی گلی کوچے کوچے پھر رہا ہوں، ظلم کی چھری

⇦ **(58)** پرتو روہیلہ 2015ء، 355۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص789 **(59)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص356۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص790 **(60)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص376۔ فارسی متن نہیں مل سکا۔

نے دِل کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔ مزید مشکل یہ کہ مقدمہ تاحال جاری ہے اور ناامیدی کی سیاہ رات کی صبح ہونے نہیں پاتی۔ کاش! مجھے معلوم ہو سکتا کہ اس مسئلے کا حل کون سی منزل پر ہے کہ پریشان نہ ہوتا اور امید و بیم کی کشمکش نہ ہوتی۔[61]

OOO

[شیخ امیر اللہ سرور] کی فرمائش کہ غالبِ سرگشتہ چند اردو غزلیں کہہ کر ارسال کرے تو یقیناً [وہ] بھول گئے کہ (ان دنوں) فارسی گوئی میرے ذہن پر طاری ہے۔ اردو غزل گوئی ترک ہو چکی ہے، پھر یہ بھی کہ (اردو غزلیں) لکھنؤ بھیجنا ایسا ہے، جیسے چمن کو پھول اور اصفہان کو سرمہ۔ [مَیں نہ صرف] اردو غزل گوئی ترک کر چکا ہوں، [بلکہ] سابقہ غزلوں سے، جو میرے ذوقِ شعری پر پوری اترتی ہیں، علیحدہ کر کے باقی سب پر قلم تنسیخ پھر دیا ہے۔[62] اَب کہ مجھے اپنے سے طرح طرح کی رنجشیں اور آویزشیں ہیں، قافیہ سخن سنجی تنگ ہے۔ مَیں وہ ہوں کہ زمانہ سے اگر مجھے ذرا بھی آسائش میسر آ جاتی تو اپنی قدرتِ فکر سے مَیں اربابِ سخن کا پنجہ موڑ دیتا۔[63]

OOO

[24/ اگست 1831ء کو ڈبلیو بی مارٹن (ریزیڈنٹ دہلی) نے ایک خط کے ذریعے گورنر جنرل کو مطلع کیا کہ] یہی وہ دستاویز ہے، جس کی بابت اسد اللہ خاں کا دعویٰ ہے کہ اُس میں تحریف کی گئی ہے، لیکن جب اصل دستاویز سر جان میلکم کو تجزیے کے لیے پیش کی گئی تھی تو موصوف نے اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی تھی، چنانچہ تمام حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہ تو مدعی نالش کرنے کا مجاز ہے، نہ ہی حکومت نواب شمس الدین خاں سے کسی رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کر سکتی ہے، جیسا کہ دادخواہ چاہتا ہے۔ گورنر جنرل صاحب فضیلت مآب نائب صدران کونسل کے خیالات سے کُلی طور پر اتفاق فرماتے ہیں، لہٰذا ایسی صورت میں نواب شمس الدین خاں سے موجودہ پنشن میں اضافے کا مطالبہ سراسر نارَوا ہے اور جنرل لارڈ لیک صاحب کی عطا کردہ سند، جس میں مختلف حصے داروں کے نام مخصوص رقم کا اندراج ہے، بالکل صحیح ہے۔[64]

OOO

(**61**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 867۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 959 (**62**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 867-868، ص 959 (**63**) تنویر احمد علوی 2016ء ص 128-129۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 498 ⇦

دہلی کی عدالت میں میرا کام بگڑ چکا ہے۔ افسوس، اگر میری معاش یہی پانچ ہزار روپے اسی تفریق کے ساتھ ثابت ہو، جیسا کہ دفتر دارانِ سرکاری کی رُو سے ثابت کی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں صاحبانِ صدر کو مجھے اپنے دربار سے نکال دینا چاہیے تھا اور کہنا چاہیے تھا کہ جتنا تمھیں مل رہا ہے، اس سے زیادہ کے تم مستحق نہیں۔ مَیں دیوانہ تھا، اگر اس پر بھی اس کشور کی طرف واپس آتا اور اپنے خویشوں اور قرابت داروں کے ساتھ جھگڑا کرنے کے لیے کھڑا ہوتا، لیکن اَب تو ساری بساط ہی اُلٹ گئی اور اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو گئی۔ اَب مَیں اسی میں مصلحت دیکھتا ہوں کہ [مولوی سراج الدین احمد] اس داوری و دادگستری سے قطع نظر فرمائیں اور میرا وکالت نامہ کہ منشی نصر اللہ خاں کے پاس ہے، ان سے واپس لے لیں اور اسے پارہ پارہ کر دیں اور ان سب سے گزر جائیں۔[65]

○○○

دل میں درد، نگاہ میں ہنگامہ، طبیعت میں تفرقہ اور سر میں گونا گوں قیامتیں ہیں کہ ہر وقت بپا رہتی ہے۔ میرے شب و روز کس طرح بسر ہوتے ہیں، کچھ کہہ نہیں سکتا۔[66] سوچ رہا ہوں کہ جب کونسل کے رکن اعظم، اشرف الاُمرا [گورنر جنرل] لارڈ ولیم کونڈش بینٹنک بہادُر اس دیار میں آئیں تو مَیں ان کا دامن پکڑ لوں اور ان سے انصاف کا طلب گار ہوں اور حکمِ آخر صادر کیے جانے کی درخواست کروں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نواب گورنر جنرل دہلی نہیں آئیں گے اور اُدھر سے اُدھر اجمیر چلے جائیں گے۔[67] یہ [بھی] سننے میں آ رہا ہے کہ لشکر جے پور نہیں جائے گا اور سیدھا اجمیر چلا جائے گا۔[68] اگر یہی ہے تو مجھ پر اور میرے حال پر ہزار افسوس۔ راہ کی دُوری میرے کام کی درازی اور مقصد سے میری مہجوری پر آہ، صد آہ۔[69]

○○○

⇦ (**64**) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص119-120 (**65**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص124-125۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 492-493 (**66**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 100 فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص487 (**67**) تنویر احمد علوی 2016، ص143۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص542 (**68**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص100۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص523 (**69**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 143۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص542

11/شوال[15/مارچ1832ء] جمعرات کے دِن صبح کے وقت سو کر اٹھا اور ہاتھ مُنھ بھی ابھی نہیں دھویا تھا کہ ڈاکیا آیا اور اس نے مجھے [کلکتہ سے مولوی سراج الدین] کا خط دیا۔ اس خط کے آنے کی ہیبت سے میرا دِل خود بخود کانپنے لگا، گویا میرے دِل میں کسی نے یہ بات ڈال دی کہ میرزا احمد [بیگ] کا انتقال ہو گیا۔[70] میرا یہ دوست کہتا تھا کہ مَیں دہلی آ رہا ہوں، مگر اس وعدہ فراموش و بے مروّت نے اثنائے راہ میں اپنی سواریِ ناقہ کا رُخ راہِ عدم کی طرف موڑ دیا۔[71] ہر چند مرگ پر واویلا نہیں کیا جا سکتا اور جامۂ زندگی کے تار و پود کے بکھرنے کا کوئی علاج نہیں، لیکن انصاف بالائے طاعت، ابھی احمد بیگ مرحوم کے مرنے کا وقت نہیں تھا۔ (بھلا) اتنا صبر کیوں نہ کیا کہ مَیں کلکتہ پہنچ کر اس کا چہرہ دوبارہ دیکھ لیتا۔ ہائے، یہ کیا بکواس کر رہا ہوں اور یہ کیا قصہ ہے کہ سنا رہا ہوں اور فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ [الاعراف34:7]، 'جب ان کی اجل آتی ہے تو نہ ایک گھڑی آگے ہوتی ہے اور نہ ایک گھڑی پیچھے'۔[72] سبحان اللہ، زندگی گریزپا، موت گھات میں، فرصت نایاب، حیات مختصر اور دِل ہوس سے پُر اور دِماغ حرص سے معمور اور ہم موت سے غافل۔ اللہ اللہ اللہ۔[73]

○○○

اب تو یہ ارادہ ہے کہ اگر حکام حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں تو فقیروں کی طرح ان کے دروازے پر پہنچ کر اپنا دردِ دل ایسے لحن میں ادا کروں کہ ہَوا میں اُڑتے پرند اور پانی میں مچھلیاں بھی میرے حال (زار) پر رونے لگیں۔[74]

○○○

کہتے ہیں کہ دہلی کی ریزیڈنٹی، کمشنر دہلی [ولیم فریزر] کو دے دی گئی۔ اَب یہ دونوں فرائض ایک ہی صاحب والا شان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ریزیڈنٹی کا عملہ بدستور ہے، تادمِ تحریر کسی قسم کی چھانٹی یا تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔[75]

(**70**) پرتو روہیلہ 2015ء ص104۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص527 (**71**) تنویر احمد علوی 2016ء ص118۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء ص489 (**72**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص103۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص526 (**73**) پرتو روہیلہ 2015ء ص104 فارسی متن: حوالۂ مذکور ص527 (**74**) پرتو روہیلہ 2015ء ص101۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص524 (**75**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص101-102۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص524

نواب عالی جناب چودہ مارچ کو متھرا پہنچے ہیں اور 15/ مارچ تک اس ہی جگہ آرام پذیر ہیں اور کل کہ 16/ مارچ ہے، کوچ کریں گے اور 24/ مارچ کو دہلی پہنچیں گے۔ کہتے ہیں کہ اس مرحلے پر شاہِ دہلی سے ملیں گے اور دونوں طرف کی گرد ملال بیٹھ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس عرصے میں میرا حقِ خوابیدہ بھی تسلیم کر لیا جائے گا اور میری انصاف طلبی ڈگر پر آجائے گی۔[76]

OOO

کہتے ہیں کہ جب نادر شاہ نے سرزمینِ ایران پر تسلط حاصل کر لیا اور اس مبارک خطۂ ارض کو اپنے جور و ستم سے ویران کر دیا، زمانہ کے مزاج دانوں اور پاداشِ عمل کے رمز شناسوں نے یہ کہا تھا کہ نادر دراصل ہمارا ہی اعمال نامہ ہے اور ہماری بدکرداری کا نتیجہ؛ اسی طرح ہمارے دَور میں حاکمِ حقیقی اور داورِ تحقیقی نے اپنے خاص فرمان کے ذریعے میری خام طبعی، بدخصلتی اور تباہ کارانہ ہوس پیشگی کو ایک قالب میں یکجا کر دیا ہے۔[77]

OOO

[گورنر جنرل] لارڈ کونڈش بینٹنک بہادُر نے [مارچ 1832ء میں] تیسری مرتبہ دہلی میں نزولِ اجلال فرمایا اور باریابی کی خوش خبری لوگوں کے گوشِ سماعت تک پہنچی۔ شہر کے بڑے لوگ وظیفہ دارانِ حکومت سرکاری مشاہرہ پانے والے اور مُرزبانانِ ریاست باریاب ہوئے، عطر و پان سے تواضع کی گئی۔ غالبِ آزادہ خود کہ اپنے اعمال کی صورتِ معقول کا مارا ہُوا ہے، اس دربار میں حاضر نہ ہُوا اور اس ہنگامہ زار میں شرکت سے باز رہا۔[78]

OOO

[منشی محمد حسن] کو میرے دیوان کے حصول کا شوق بے انتہا ہے، مجبوراً مَیں نے نواب حسام الدین حیدر خاں بہادُر کی خدمت میں عرضداشت پیش کی اور وہ دیوان کہ جنابِ موصوف نے انتہائی شوق سے (اپنے لیے) لکھوایا تھا، طلب کیا۔ انھوں نے اپنے شوق کی نفی کر کے دیوان کے تحریر شدہ اجزا مجھے دے دیے، چنانچہ وہ اجزا [منشی محمد حسن] کی خدمت میں بھیجے جا رہے ہیں۔[79]

OOO

(**76**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 101-102۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 525 (**77**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 120۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 491 (**78**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 121۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 491 (**79**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 9 فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 430

میرا دِل فرنگی بے وفاؤں کے اختلاط سے اوبھ گیا ہے اور میری رُوح ان سیاہ قلب حبشیوں کے میل جول سے تنگ آ گئی ہے۔ اَب نیت ہے کہ اگر کوئی ہندوستان کا صاحبِ مرتبہ شخص میری طرف توجہ کرے اور بہ شیوۂ پاس داری و اصولِ مرتبہ دانی مجھے اپنے پاس بلالے تو مَیں دِل کو اس کے راستے کی دِل آویزگی کی زُلفوں کے پیچ و خم میں باندھ دوں اور پھر اپنا رختِ سفر اس کے بلند قلعے کی دیوار کے سایے ہی میں کھولوں، ورنہ قلندروں کے طور سے اس سیاہ خاک دان سے اُٹھ کر جگہ جگہ، قریہ قریہ گھومتا ساری دُنیا کا گز بن جاؤں۔[80]

OOO

مَیں جانتا ہوں اور میرا خـدا کہ مَیں اپنے پراگندہ نثر پاروں کو کبھی جمع نہیں کر سکا، بلکہ خود کو اس کشاکش سے الگ رکھا۔ مَیں جانتا ہوں کہ میرے قلم کے یہ نقوش و آثار یا تو لایعنی صورتوں کی زمرہ میں آئیں گے یا پھر انھیں 'رقومِ خوش جوہر' کے سلسلہ سے منسلک کیا جائے گا۔ پہلی صورت میں کیا ضروری ہے کہ خود کو ایک بے قیمت شے بنا کر فروخت کیا جائے اور آئندہ ان 'نقش ہاے بے صورت' کے دیکھنے والوں کی ناپسندیدگی کو مول لیا جائے۔ دوسری صورت میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ جانے والے یہاں سے اپنے ساتھ کیا لے گئے، جو ہم لے کے جائیں گے اور جس کے حصول کی آرزو ہمیں اس درجہ بے تاب رکھے۔ اُن چند سطروں میں، جو دیوانِ ریختہ کے لیے بطور دیباچہ معرضِ تحریر میں آئیں، جن خیالات نے لباسِ حروف پہنا ہے اور وہ دھواں، جو **سفینۂ گُلِ رعنا** کی زیب دہی کے لیے میرے سویدا دِل سے اٹھا ہے، بطورِ سوغات [حکیم احسن اللہ] کی خدمتِ عالی میں بھیج رہا ہوں اور اپنی نگارشات کی تنگ مائگی پر شرم سے پانی پانی ہُوا جاتا ہوں۔[81]

اگست [1833ء] کی دوسری تاریخ کو منتخب دیوانِ ریختہ موم جامہ میں لپیٹ کر بسبیلِ ڈاک انگریزی [شیخ امام بخش ناسخ] کی خدمتِ عالی درجت میں روانہ کیا گیا۔[82]

OOO

(**80**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 365۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 799 (**81**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 141-142۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 467 (**82**) تنویر احمد علوی 2016ء ص 149۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء ص 459

سوچتا رہا ہوں کہ جاڑے کے شروع میں افسردگی کا یہ دَور ختم ہو جائے گا اور اس درماندگی سے نجات کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ خواہی نخواہی مَیں اس دامگاہ سے رہائی حاصل کر کے صحرا کی طرف نکل جاؤں گا، لیکن اس عقدۂ کار کو کشائش کی کوئی صورت میسر نہیں آئی اور یہ ارادہ دِل کا دِل ہی میں رہ گیا۔ افسوس کہ مَیں اپنے اس گمان سے منفعل ہوں اور اپنے اس انتخاب پر شرمندہ۔ کلکتہ کے مجمع احباب میں مولوی سراج الدین احمد کے سوا میرا دِل اَور کسی کے نام پر قرار نہیں پاتا۔ اب تقریباً ایک سال ہو گیا، انھوں نے مجھے یاد نہیں کیا اور اس خاموشی و فراموشی کے لیے کوئی عذر بھی نہیں چاہا۔ آج کہ دسمبر کی 28/ تاریخ ہے اور 1833ء کا اختتام قریب ہے، میرا دِل دردِ بے صبری سے تڑپ رہا ہے۔[83]

کلکتہ ایسی تازگی رکھنے والا شہر اس دُنیا میں کہاں۔ وہاں کی خاک نشینی کسی دوسرے علاقے کی مسند آرائی سے زیادہ بہتر ہے۔ مَیں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ اگر مَیں خانگی ذمہ داریاں نہ رکھتا اور عیال داری کا طوق میری گردن میں نہ پڑا ہوتا تو جو کچھ بھی یہاں ہے، مَیں اسے گردِ دامن کی طرح جھاڑ دیتا اور اُس بقعۂ زمین میں پہنچ جاتا۔ جب تک زندہ رہتا، اُس بہشت کدہ میں عمر گزارتا اور دوسرے مقامات کی ناخوشگوار آب و ہَوا کی تکلیف سے آسودہ رہتا۔ وہاں کی سرد و خنک ہَوا، وہاں کا خوش ذائقہ پانی، اے سبحان اللہ! اس پر عمدہ شراب اور ثمرہائے پیش رس:

همه گر میوهٔ فردوس، بخوانت، باشد ... غالب! آں انبہ بنگالہ فراموش مباد[84]

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے ہم نشیں! ... اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب ... وہ نازنیں بُتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر ... طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ، واہ ... وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے[85]

○○○

(**83**) بنام سراج الدین احمد: تنویر احمد علوی 2016ء، ص 98-99۔ فارسی متن: پرتوروہیلہ 2015ء، ص 488
(**84**) تنویر احمد علوی 2016ء ص 116 فارسی متن: پرتوروہیلہ 2015ء ص 495 (**85**) غالب 1996ء ص 276

میرے ایک بھائی [نواب ضیاء الدین احمد خاں] نے کہ ان سے زیادہ عزیز مجھے اپنے برادران سے کوئی اَور نہیں، میرے سخن پاروں کو، جن سے میری نثری تحریریں مراد ہیں، جمع کیا اور انھیں ایک بیاض کی شکل دے دی ہے۔[86]

○○○

میری مثال اس تنہا مسافر کی سی ہے، جس کا پیر دلدل میں پھنس جائے۔ اَب جتنا جتنا وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنا پیر اس دلدل سے باہر کھینچ لے، اتنا ہی وہ اس میں اَور دھنستا چلا جاتا ہے۔[87]

○○○

نواب امین الدین خاں بہادُر نے (کہ مَیں ان کے چہرۂ رَوشن میں اپنی دُنیاے آرزو کا عکس دیکھتا ہوں اور ان سے ملاقات کو اپنی زندگی خیال کرتا ہوں) کلکتہ کا سفر اختیار کیا ہے۔ اَب میں (ان کی عدم موجودگی میں) اپنی زندگی سے کاہے کو پیار کروں اور اپنے دِل کو کس کے دیدار سے شادمانی بخشوں۔ برادرِ مشفق کو اس موجِ بلا کے تھپیڑوں نے دِل شکستہ بنا دیا اور ان کے خانۂ جاں کو سیلابِ فنا کے سپرد کر دیا اور خونِ وفا میری گردن پر ہے کہ مَیں اس سفر میں ان کی ہمراہی سے باز رہا۔ امین الدین خاں کہتے تھے کہ ’جب وہ اُس دیار [کلکتہ] میں پہنچیں تو میرا ایسا کوئی دوست میری جگہ ان کا غمخوار ہو‘۔ بخدا، مولوی سراج الدین کے سوا میرا اَور کوئی ایسا دوست نہیں، جس کے بارے میں میرا دِل مطمئن ہو سکے، چنانچہ مَیں نے [سراج الدین کے] نام ایک خط لکھ کر ان کو دے دیا ہے۔[88] اگر سراج الدین احمد اس کی تلافی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں تو مَیں اس پریشانی و تشویش سے نجات پا سکتا ہوں اور شرمندگی کی گرد اپنے چہرے سے صاف کر سکتا ہوں۔ [کاش!] غمخواری و مسافر نوازی پر اپنی کمر ہمت چست کریں اور اپنے آپ کو امین الدین کے دوستِ دیرینہ سمجھیں اور اس طرح ان کی دلجوئی و چارہ سازی میں لگ جائیں کہ یہ دوست اپنے خانماں سے دُور رہتے ہوئے اسد اللہ رُوسیاہ کو فراموش کر دے اور [سراج الدین] کو اس کی جگہ پر سمجھے۔ جب وہ کلکتہ پہنچیں اور [ان] سے ملیں تو یہ سمجھیں کہ اسد اللہ ان سے پہلے ہی کلکتہ پہنچ گیا ہے۔[89]

(**86**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 93۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 470 (**87**) تنویر احمد علوی 2016ء ص 122۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 492 (**88**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 122۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 492 (**89**) تنویر احمد علوی 2016ء ص 111۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 484

مَیں ایسا بندۂ ناساز بخت ہوں کہ مَیں [کلکتہ کی] انجمن سے باہر نکل گیا تو میرے آقا [مولوی ولایت حسین خاں] نے یہ محسوس کیا کہ اس کے اوقاتِ روزی میرے شور و غوغا سے محفوظ ہو گئے اور میرے ہمدموں کے لیے میری ہمدمی وجہِ اندوہ و ملال نہیں رہی اور نہ میرا نام شفاعت کرنے والے لبوں کے گرد کبھی طواف کرتا ہے۔ اس تمام ناکسی و نارَسائی کے باوصف مَیں اپنی اس دیدہ وری پر خوش ہوں کہ مجھے شائستہ گفتار و شائستہ کردار لوگوں کا شناس بنایا گیا ہے اور میری طرف سے بے جا گلہ مندیوں کو انھوں نے اپنی خاطر ناعاطر میں کوئی جگہ نہیں دی۔[90]

OOO

اہلِ وطن [اکبر آباد] میں سے کوئی میرا غمخوار نہیں ہے، گویا میرا حال اُس شخص کا سا ہے، جس کا دُنیا میں کوئی وطن ہی نہ ہو،[91] [چنانچہ مَیں] نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے اور آنے جانے والوں پر، وہ اپنے ہوں کہ بیگانے، اپنے گھر کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ اگرچہ مَیں زندانی نہیں، لیکن میرے خواب و خور کا انداز قیدیوں ہی جیسا ہے۔ میرے قرض خواہوں میں سے دو آدمیوں نے میرے خلاف عدالت سے ڈگری حاصل کر لی۔ اَب یا تو ڈگری میں مندرج زرِرقم حسبِ قاعدہ ادا کیا جائے یا پھر قرض دار قید و بند کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ سربر آوردہ لوگوں کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ کچہری کا سپاہی گھر پر جا کر انھیں گرفتار نہیں کر سکتا، جب تک کہ وہ کہیں راہ میں نہ ملیں، انھیں اسیر نہیں کیا جاتا۔[92] مجھ جیسے انسان کے لیے کہ جو (قرض خواہوں کے) تقاضوں کی کشمکش کا عادی ہے اور ایک طویل مدت قرض کے اضطراب میں گزاری ہے، اس ہنگامے سے دِل کو کوئی تنگی اور دکھ نہیں ہوتا اور جتنے روپے کی مجھ سے عدالت میں طلبی کی جارہی ہے، وہ اس لائق نہیں کہ میری طبیعت منغض کر سکے۔ چونکہ پانچ ہزار سے زائد نہیں، زیور اور گھر کے سامان کی قیمت سے پورا ہو جائے گا؛ (لیکن) جو (رقم) مجھے ملنی ہے، چالیس ہزار سے زائد ہے؛ محال ہے، جو کبھی اس رقم کے اجرا کی آرزو دِل کے پاس بھی پھٹکی ہو یا میرے حال سے اسے کچھ مناسبت رہی ہو، ہاں، اتنا مقدور ضرور ہو کہ بیٹھوں اور مٹھی مٹھی قرض خواہوں کے سر ماروں اور اس بلا سے کہ جسے دُنیا کہتے ہیں، کنارہ کر کے قلندر بن جاؤں اور ساری دُنیا میں گھومتا پھروں۔[93]

---

(90) تنویر احمد علوی 2016ء، ص199-200۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص538 **(91)** ⇦

○○○

یہ جو تھوڑی عمر مَیں نے ضائع کی اور شاہِ اودھ کی مدح نگاری کی، تمنا کی بزم کی آرائش اور ہوس کے سرمایے کی دریوزہ گری میں تھی۔ چونکہ کام نہیں بنا اور میرے نغمے نے شاہوں کے سنگین دلوں پر اثر نہیں کیا، مَیں نے مُنھ موڑ لیا اور اپنے آپ پر افسوس کیا؛ اب مَیں کہاں اور دکن کا سفر کہاں۔ تیس سال رنگینیوں اور شراب و نغمہ میں گزر گئے، اَب دِل میں ان چیزوں کی خواہش بھی نہیں رہی۔ اَب تو صرف یہ آرزو ہے کہ اس (ہستی) کا مزار دیکھوں کہ جس نے مجھے میرے اجداد کے مذہب سے نکالا اور والہانہ طور پر اپنے زمرے میں شامل کر لیا (اور) مستانہ وار جان دوں اور فنا کے تکیے پر سر رکھ دوں۔ سفر کا ارادہ قرض کی زنجیر کے ٹوٹے بغیر صورت پزیر نہیں ہو سکتا اور جب یہ زنجیر ٹوٹ گئی تو کیا مجال ہے، جو نجف کے علاوہ کسی دوسرے راستے پر چلوں۔[94]

○○○

کسی ظالم خدا ناترس نے ولیم فریزر صاحب بہادُر ریزیڈنٹ دہلی کو شبِ تاریک میں [گیارہ بجے کے قریب دریاگنج سے پہاڑی بنگلے پر واپس جاتے ہوئے ان کے مکان سے کچھ فاصلے پر[95]] بندوق کی گولی سے ہلاک کر دیا گیا اور میرے لیے باپ کی موت کا غم تازہ ہو گیا۔ دِل بے قابو ہو گیا اور میرے خیال و حال پر غم واندوہ کے بادل چھا گئے۔ قضارا جو نشان بتلائے گئے، اس بنیاد پر ایک سوار [نواب شمس الدین احمد کے داروغۂ شکار، کریم خاں] کو اس ستودہ صفات شخص کے قتل کے جرم میں پکڑ لیا۔ شہر کے صاحب مجسٹریٹ بہادُر کہ پہلے سے مجھ سے واقف تھا، جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس نے حقیقت حال تک پہنچنے اور اس پر پڑے ہوئے بہت سے اسرار کی پردہ کشائی کی غرض سے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا، یہاں تک کہ والیِ فیروز پور مجرم قرار پا گیا اور سرکار کے حکم سے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس کی گرفتاری عمل میں آئی اور سرکاری پولیس اس کی جاگیر پر جا کر بیٹھ گئی۔ چونکہ میرے اور اس کے مابین نااتفاقی چل رہی تھی، سب نے اس کافرِ نعمت کی گرفتاری کو میری

⇦ تنویر احمد علوی 2016ء، ص 186، 187۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 454 **(92)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 145-146۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 462 **(93)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 44-45۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 464-465 **(94)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 45۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 465

(95) بحوالہ مالک رام 1976ء، ص 77

طرف سے مخبری کا نتیجہ قرار دیا؛ یعنی خاص و عام یہ واہمہ رکھتے ہیں کہ شمس الدین بے گناہ ہے، فتح اللہ بیگ خاں اور اسد اللہ خاں نے چند جھوٹی سچی باتیں لگا کر اس بے چارے کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ طرفہ تر بات یہ کہ فتح اللہ بیگ خاں، والیِ فیروز پور کا برادرِ عم زاد ہے۔ مجھ پر لعنت ملامت دہلی کے یاوہ گویوں کا وظیفۂ لب بن گئی ہے۔ یزدانِ پاک سے مَیں یہ دعا کرتا ہوں کہ اس خیرہ سر بے آرزم کو جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچائے اور اس سربلندی طلب کرنے والے کو فرازیِ دار نصیب ہو۔ ہفدم ماہِ صفر کو الہ آباد کے حکامِ شہر میں سے ایک حاکم اس دیار تک پہنچا اور گورنر جنرل بہادُر کی طرف سے اس امر پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ حکامِ دہلی کی تحقیقات کے خلاصہ کو مزید گہری نظر سے دیکھے اور ثبوتِ جرم کے بعد سزا دہی کی قرارداد کو مرحلہ بہ مرحلہ بروے کار لائے۔[96]

OOO

[سبحان علی] خانِ والا شان نے ہم گمناموں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور خاک نشینوں کی جانب التفات کو اپنے لیے دُون مرتبت تصور کیا، ورنہ بہ ادنیٰ توجہ یہ بات معلوم کی جا سکتی تھی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ میرا قطعہ ملازمانِ فلک بارگاہ کی نظر سے گزر جائے اور میری خاکساری و بے اعتباری کے بارہ میں کچھ کلمات کہہ دیے جائیں۔[97]

OOO

[مہاراجا حیدرآباد] چندو لال بھلا میرا نغمہ کیا سمجھتا اور میری روِش کو کہاں پہنچتا۔ بوڑھا، سٹھیایا ہُوا، جاہل، بات کرنے کے سلیقے سے بے بہرہ۔ وہ، جو فارسی میں قتیل کو استاد سمجھتا ہے، غالب کو کیا کرے گا اور وہ، جو اردو میں نصیر کی تعریف کرتا ہے، ناسخ سے اسے کیا سروکار۔ اس کی اپنی عمر اسّی سے تجاوز کر چکی ہے۔ جب تک اس کے پاس پہنچوں گا، وہ جہنم واصل ہو چکا ہو گا۔[98]

OOO

میری ہمت ایک عجیب کام کی انجام دہی میں مصروف تھی اور میری نظر ایک منظر بلند کی دیدہ بانی کر رہی تھی، یہاں تک کہ وہ ہنگامہ ختم ہُوا اور اس کے ہر کردار کو اس کے عمل کی پاداش

(**96**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 146-148۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 462-463 (**97**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 148۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 463 (**98**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 45۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 465

مل گئی اور کریم خاں [کو 26/ اگست 1835ء کی صبح] تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ گورنر جنرل کی طرف سے عذرداری مسترد ہونے پر [8/ اکتوبر کی صبح] جاگیر دار فیروز پور [نواب شمس الدین احمد خاں] کو [بھی] پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور اس کی جاگیر اور متعلقاتِ جاگیر بحقِ سرکار ضبط ہوئے۔ مَیں کہ اس جاگیر میں انگریزی سرکار کے حکم سے وظیفہ پاتا ہوں، اَب مجھے اس کا انتظار ہے کہ یہ حکام میرے ساتھ کیا سلوک رَوا رکھتے ہیں۔[99] [بہر حال، اَب موقع تھا کہ مَیں ایک بار پھر قسمت آزمائی کرتا، چنانچہ مَیں نے گورنر آگرہ ولیم بلنٹ کی خدمت میں عرضداشت پیش کی کہ مجھے اور میرے متعلقین کے لیے دس ہزار روپے سالانہ کی رقم پنشن مقرر کی تھی، جب کہ نواب احمد بخش خاں اور پھر ان کے بیٹے شمس الدین خاں کُل تین ہزار روپے سالانہ دیتے رہے؛ گویا مجھے اور میرے متعلقین کے سات ہزار روپے سالانہ اس جاگیر پر واجب الادا ہیں، یعنی مئی 1806ء سے مئی 1835ء تک مبلغ دولاکھ تین ہزار روپے۔[100]]

○○○

صبح کے وقت میرا دِل تکلیفِ شانہ سے بُری طرح مبتلائے آزار ہوتا ہے، میرے ہاتھ میں درد کی اذیتوں کے باعث رعشہ ہوتا ہے۔[101] زمانے کے غم مجھ پر بے طرح مسلط ہو گئے ہیں اور زندگی کی سختیاں بڑھ گئی ہیں۔ اگر مَیں چاہوں کہ اس میں سے کوئی حصہ حوالۂ قلم کروں تو قلم میں حرکت باقی نہ رہے۔[102]

○○○

[اکتوبر میں دی ہوئی میری عرضداشت گورنر جنرل آگرہ ولیم بلنٹ نے ٹی ٹی مٹکاف، ایجنٹ برائے گورنر کو بھیجی، جنھوں نے 3 دسمبر 1835ء کو اس پر رپورٹ دی کہ] لارڈ لیک کے 6/ جون 1806ء کے حکم نامے کے مطالعے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسد اللہ خاں کا دعویٰ قابلِ اعتنا نہیں ہے۔ مرزا نوشہ نے پہلے تو یہ دعویٰ کیا کہ مذکورہ شقہ ہی سرے سے جعلی ہے، لیکن جب یہ باور کرایا گیا کہ سرجان میلکم نے مذکورہ شقہ کی صحت کی تصدیق کر دی تو انھوں نے دوسرا

(**99**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 149-150۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 463-464 (**100**) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص 120 (**101**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 176۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 440 (**102**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 126۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 499

دعویٰ یہ کیا کہ جنرل لارڈ لیک بہادُر کی مہر اور دستخط فریب کاری کے ذریعے حاصل کیے گئے تھے۔ ان بیانات سے مرزا نوشہ کی متنازع شخصیت ہونے کی حقیقت کھل جاتی ہے۔[103] [اسی طرح آر ایچ اسکاٹ سیکرٹری آگرہ نے دہلی کو اطلاع دی]: اسد اللّٰہ خاں کے دعوے کی مکمل جانچ پڑتال کر لی گئی ہے اور اسے سرکارِ عالیہ نے مسترد کر دیا ہے، اس لیے مزید احکامات کی ضرورت نہیں ہے۔ فیروز پور کے جاگیر دار کے ساتھ طے شدہ معاہدے پر اُن کا اعتراض بالکل نارَوا ہے۔[104]

[جارج ایڈن آکلینڈ 4/ مارچ 1836ء کو گورنر جنرل بنے اور 28/ اپریل 1836ء کو انھوں نے میری عرضداشت پر لکھ بھیجا]: 'کیا اس مقدمے کا بار بار فیصلہ نہیں ہُوا ہے'؟[105]

○○○

ایک زمانہ سے [وزیرِ شاہِ اودھ، امداد حسین خاں بہادُر] کے بارہ میں سنتا ہو اور یہ خیال میرے ذہن میں گشت کر تا رہا ہے کہ ایسا کیا کیا جائے کہ مَیں رُوشناسِ التفات ہو جاؤں۔ بارے، دِل سودا زدہ کی جیب میں غیب سے یہ زرِ اندیشہ ڈال دیا گیا کہ نگارشِ قلم کو دستاویز بنائے، تاکہ میرے سجدہ ہائے نیاز بصورتِ نقل و تحریر اس بار گاہِ ارم کار گاہ کے گوشۂ بساط کے تئیں نذر کر دیے جائیں۔ اس بنا پر مجھ نیاز مند نے [امداد حسین خاں بہادُر] کی انجمن سراپا شکوہ کی مدحِ دلکشا کے ساتھ راہِ سخن وا کی اور قصیدہ کے بجاے ایک قطعۂ ستائش کو زیادہ درخورِ فکر تصور کیا اور ایک دوسرا قطعہ کہ روانی میں زلال خضر (آبِ حیات) کی مثال ہے، قطعۂ مے کی طرح ٹپک پڑا، چنانچہ یہ دونوں قطعات [ان کی] نظر والا سے گزریں گے۔ مَیں ایک مورِ ضعیف ہوں، آصفِ دَوراں کی دستگیری سے عہدِ موجود کے سلیمان تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ مَیں ایک فقیر راہ ہوں اور اس کا آرزومند ہوں کہ ارسطو کی یامردی سے سکندر تک میری رسائی ہو جائے اور مورِ بے مایہ کو آصف، فقیر کو ارسطو اور اپنے آپ کو خداوند کے سپرد کرے۔[106]

نصیر الدین حیدر بادشاہِ اودھ کی تخت نشینی کے دَور [میں] میرا (ایک) قصیدہ رَوشن الدولہ [منیر الملک محمد حسین خاں وزیر دربارِ اودھ] کی وساطت سے بادشاہ کی حضور میں پیش ہُوا،[107] اُسی

(**103**) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص120 - 121 (**104**) بحوالہ خلیق انجم 2005ء، ص 121 (**105**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص160 (**106**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 61-62۔ فارسی متن: پرتو رہیلہ ⇦

دِن پانچ ہزار روپے کے بھیجنے کا حکم ہُوا، [لیکن] متوسط، یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے، انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا، 'خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا'۔ ناچار، مَیں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ 'تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری'؟ انھوں نے جواب میں لکھا کہ 'پانچ ہزار ملے؛ تین ہزار رَوشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو، غالب کو بھیج دو۔ کیا اُس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو'۔ مَیں نے لکھ بھیجا کہ 'مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے'۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ 'اَب تم مجھے خط لکھو، اس کا مضمون یہ ہو کہ مَیں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہُوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا، مگر یہ مَیں نے نہیں جانا کہ اُس کا صلہ کیا مرحمت ہُوا؟ مَیں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا، خط بادشاہ کو پڑھوا کر، ان کا کھایا ہُوا روپیہ اُن کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا'۔ یہ خط لکھ کر مَیں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہُوا، تیسرے دِن شہر میں خبر اُڑی کہ [8/ جولائی 1837ء کو] نصیر الدین حیدر مر گیا۔ اَب مَیں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے۔[108]

❍❍❍

آج کل کچھ ایسا معاملہ ہے کہ نہ میرا دِل قابو میں ہے، نہ زبان میرے قبضہ میں کہ اوقات بیماری میں ضائع، دِل چارہ گری کی کوشش میں پریشان اور قلم معاملہ نگاری کا مرہونِ منت۔[109]

❍❍❍

برادر بجان برابر مرزا علی بخش بہادُر رنجور رجے پور سے آئے ہوئے ہیں اور میرے گھر میں طرحِ اقامت ڈالی ہے۔ نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں شامل ان کی امدادِ معاش کے باب میں ایک گونہ الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔[110]

[میرے سسر نواب الٰہی بخش کی اَولاد (نواب علی بخش خاں، بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم) نے 20/ فروری 1838ء کو گورنر جنرل کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ] ان کے چچا احمد بخش

⇦ 2015ء، ص670 (**107**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص339۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص771 (**108**) خلیق انجم 2008ء، ص327-328 (**109**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص155۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص439

(**110**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص155۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص439

خاں نے انھیں مثل اپنی اَولاد کے سمجھتے ہوئے سرکارِ برطانیہ کی جانب سے مرحمت کی گئی جاگیر سے ان کی مالی اعانت کے لیے علیحدہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا، جو سامانِ خور و نوش و ملبوسات، نیز شادی بیاہ اور ان کے خاندانوں میں وقوع پذیر ہونے والی تقریبات کے اخراجات کے علاوہ تھا۔ یہ کہ حال ہی میں حکومت کی جانب سے جاگیر کی ضبطی کی بنا پر ان کے وظائف بند کر دیے گئے ہیں، اس صورتِ حال کی وجہ سے یہ لوگ غربت کے پست ترین درجہ پر پہنچ گئے ہیں اور روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی سے بھی بالکل تہی دست ہو گئی ہیں۔ اس کسمپرسی کے عالم میں حضورِ والا کے مساویانہ و بے لاگ انصاف کے پیشِ نظر امید رکھتے ہیں، آپ ان کے بدقسمت معاملہ پر غور فرمائیں گے اور ہمدردانہ معاونت کی کوئی سبیل پیدا فرمائیں گے۔[111]

[مئی میں دہلی کے ایک شراب فروش کی ڈگری کی رقم اڑھائی سو روپے ادا نہ کر سکنے پر گرفتار ہو کر ناظر کے مکان پر قید ہُوا تو نواب امین الدین احمد خاں نے رقم ادا کر کے رہا کرایا۔[112]]

OOO

[2/ جون 1838ء کو مَیں نے گورنر جنرل آکلینڈ کی خدمت میں عرضداشت پیش کی کہ]
مدعی کو یہ معلوم ہُوا ہے کہ شمس الدین خاں کے تمام قرض خواہوں کو فی روپیہ، آٹھ آنے چھ پائی بطور معاوضہ دیا جائے گا [اور] یہ کہ اس مدعی کو بھی اسی فیصلے کے مطابق ادائیگی ہو گی۔ اس بات سے سائل کے ذہن میں تو معمولی سا خلجان بھی نہیں ہے، تاہم فدوی کو احتمال ہے کہ اس حقیقتِ حال پر حضورِ والا ضرور حیران ہوں گے، اس لیے کہ یہ فدوی نہ تو مرحوم جاگیردار کا کوئی ملازم تھا، نہ ہی اس نے اپنی فروخت شدہ اشیا کی قیمت یا دیے گئے قرضہ کا مطالبہ کیا ہے۔ مذکورہ رقم تو بطور پنشن فدوی کو واجب الادا ہے، جو سرکارِ برطانیہ نے مقرر کی تھی، جس کے لیے احمد بخش خاں کو حکومت کو واجب الادا زرِ استمرار میں تخفیف کر دی گئی تھی، لہٰذا فدوی کے مطالبے کو شمس الدین خاں کے دیگر قرضوں کے مطالبے کے مساوی قرار نہیں جا سکتا۔ مدعی اپنے مؤقف کی حمایت میں ایک تازہ مثال پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔ امین الدین خاں اور ان کے بھائی کو فیروزپور کے مرحوم جاگیردار کی جائیداد سے مطالبے کی پوری رقم مبلغ چوالیس ہزار روپے لوہارو کی

(111) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص197 (112) بحوالہ کاظم علی خاں 1999ء، ص28

تحصیلات کی مد سے ادا کر دی گئی۔ اندریں حالات، فدوی بصد ادب امیدوار ہے کہ حضورِ والا اس کے مطالبے کو دیگر قرض خواہوں کے مطالبات پر فوقیت دیں گے اور حضورِ والا ازراہِ نوازش (در حقیقت مختلف نوعیت ہونے کی بِنا پر) گورنر جنرل صاحب بہادُر کے ایجنٹ مقیم دہلی کو یہ ہدایات صادر فرمائیں گے کہ وہ دیکھیں کہ فدوی کو اس کی پوری رقم ادا ہو۔[113]

OOO

[3/ جولائی 1838ء کو ٹی ٹی مٹکاف (ایجنٹ) نے ڈبلیو ایچ میکناٹن معتمد برائے گورنر جنرل شمال مغربی صوبہ جات کو رپورٹ دی کہ] یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ مدعیان کی اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بقایا رقم جمع ہوتی چلی گئی، جنھوں نے اپنے بے بنیاد دعویٰ کے منظور کیے جانے تک اپنے جائز واجبات بھی حاصل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خصوصی کمشنروں نے ان کے حق میں ایسا استغاثہ دینے سے انکار کر دیا، جو دوسرے قرض خواہوں سے ناانصافی پر منتج ہو۔[114]

OOO

[18/ جولائی 1838ء کو نائب معتمد برائے گورنر جنرل نے ایجنٹ دہلی کو اطلاع دی کہ جولائی کی] 3/ تاریخ کا مکتوب منسلکات، جو نواب فیروز پور کی ریاست کے خلاف مرزا اسد اللّٰہ خاں کے دعوے سے تعلق ہیں، عرض ہے کہ خصوصی کمشنروں نے اس کے اس مطالبے کو کہ 'دیگر قرض خواہوں کے ساتھ برتے گئے قانون سے اس کو مستثنیٰ قرار دیا جائے' خارج کر دیا ہے۔[115]

OOO

سید [امانت علی] اور [بدرالدین احمد کاشف] فقیر صاحب کے ذریعہ [میر سید علی خاں غمگین کی طرف سے] ارسال کردہ غزل ملی، اس کے ساتھ دوسرا پروانہ لے کر ایک اَور شخص بھی آ پہنچا۔ (مَیں) خوش ہو گیا اور رباعیات کے دیوان کے باعث تو یہ شادمانی اَور بھی بڑھ گئی۔ بھلا، میرے پاس وہ نقدِ علم کہاں کہ ان مطالبِ عالیہ کو سمجھ سکوں اور مَیں اس لائق کہاں کہ میری خاطر یہ موتی رشتۂ تحریر میں پروئے جائیں اور اس پر یہ کرم مستزاد کہ [غمگین] اپنے غلام سے استفسار کریں کہ اگر تُو اجازت دے تو دیباچے کو تیرے نام منسوب کر دوں۔ یہ پُرسش بجائے خود ایسا اندازِ کرم

(**113**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 200-201 (**114**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 199 (**115**) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 202

ہے کہ زبان کو اس کی سپاس گزاری کی تاب نہیں۔ مَیں یاوہ گوئی کر رہا ہوں، اگر حکم یہی ہے تو مَیں عرض کروں گا کہ اس تحریر میں میرے نام کی شمولیت نہ صرف میرے لیے، بلکہ میرے اجداد کے لیے بھی ابدی افتخار کا سرمایہ ہو گی، لیکن [ان کی طرف سے] اپنے اس غلام کی تعریف و توصیف اس تحریر میں حد سے زیادہ نہ کی جائے اور اپنا کم ترین خادم ظاہر کریں کہ اس صورت سے بھی خادموں کا مطلب ادا ہو جائے گا اور مجھ ننگِ وجود کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔[116]

○○○

ایک طویل مدت سے میری ہمت ایک مہم میں الجھی ہوئی ہے اور وہ بذاتِ خود (ایک) نازُک کام ہے اور دشوار مقصد ہے کہ جو اس سے پہلے کئی سال سے ریزیڈنسی دہلی میں کشمکش میں ہے اور ایک طویل مدت سے کلکتہ کی کونسل آف گورنر میں پڑا پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اَب دو سال ہوئے ہیں کہ وہ مقدمہ لندن گیا ہے اور وہاں عدالت میں زیرِ غور ہے۔ جب تک اُس دیار سے کوئی جواب اور اس عدالت سے کوئی حکم نامہ نہیں آ جاتا، اس جگہ سے حرکت کرنا اور دہلی سے باہر جانا ممکن نہیں؛ لیکن سمجھتا ہوں کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں اور مقصد کی گرہ کھلنے ہی والی ہے۔ جب ولایت سے نزاع کے اختتام کا حکم آ جائے تو اس کے بعد سوائے اس تھوڑے وقت کے کہ جو ضرورتِ سفر میں لگے، دہلی میں نہیں ٹھہروں گا۔[117]

○○○

مَیں سپاہی بچہ، بے علم و بے سواد (ہوں)۔ بس اتنا ہے کہ مَیں ایک دو مصرعے موزوں کر لیتا ہوں اور ہر صنف میں کچھ نغز گوئی کر لیتا ہوں، مجھے تصوف سے کیا واسطہ اور درویشی سے میرا کیا رشتہ، لیکن فی الوقت اس سے زیادہ (ہرگز) نہیں کہ واحدیت الوجود اور عدمیتِ اشیا کو (مشیت نے) میرے ضمیر میں ڈال دیا ہو اور 'الحق محسوس والحق معقول' کو میرا عقیدہ بنا دیا ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ وہی یکتا ہے اور اس کے علاوہ اَور کوئی نہیں۔ دوسرے میری حوصلہ مندی، کوشش، ریاضت، دولت و مال سب کا انحصار ایک دو پیمانہ ہائے شراب پر ہے کہ رات کو پی لیتا ہوں اور مست (ہو کر) سو جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ مَیں نہ دِین کو سمجھتا ہوں، نہ دُنیا کو۔[118]

(**116**) پرتو روہیلہ 2015ء ص829۔ فارسی متن: حوالہ مذکور ص921 (**117**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص837۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص929–930 (**118**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص836۔ فارسی متن: ص928

○○○

[13/ جنوری 1840ء کو مَیں نے ایک عرضداشت گورنر جنرل آکلینڈ کے نام پیش کی کہ]
درخواست گزار نے 18/ جولائی [1839ء] کے احکامات کی پوری طرح بجاآوری کرتے ہوئے ان بقایاجات کا، جو حقیقتاً واجب الادا ہیں، نصف وصول کر لیا ہے۔ اگرچہ اس مطالبے کو دیگر قرض داروں، جو فیروزپور کے مرحوم جاگیردار کو فروخت شدہ سامان کی ادائیگی اور بطور قرض دی ہوئی رقم کی واپسی کا تقاضا کر رہے ہیں، کے مساوی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عرض گزار نے اپنی سابقہ عرضداشت میں یہ گوش گزار کیا تھا کہ فدوی کے مطالبات پورے کرنے کے لیے جائداد موجود تھی اور یہ کہ سامان اور فیروزپور کے مسمار شدہ مکانات کی فروخت کی رقم، جو سرکاری خزانے میں جمع کرائی گئی، اس سے فدوی کو ادائیگی ہو سکتی تھی۔ فدوی بصد ادب التماس گزار ہے کہ ٹی ٹی مٹکاف صاحب بہادُر نے اس مقدمے کی بابت جو فیصلہ صادر کیا ہے، اس کے خلاف سائل نے اس نہایت ضروری نکتے کے حوالے سے اپیل کی ہے کہ اس کے دعویٰ کو مفادِ عامہ کی نوعیت کے پیشِ نظر قرض خواہوں کے نجی دعووں سے خلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔[119]

[اس پر ٹی ٹی مٹکاف نے 21/ جنوری کو ٹی ایچ میڈک (سیکرٹری قانون، عدالت و محاصل) کو یہ رپورٹ دی کہ] شمس الدین خاں کی زندگی میں مدعیان نے اس استدلال پر کہ وہ اس [1500/ روپے] سے زیادہ کے مستحق ہیں، پورے پانچ برس تک اپنی پنشن لینے سے انکار کر دیا اور اس کے لیے انھوں نے حکومت کے روبرو دعویٰ داخل کر دیا۔ جب حکومت کے احکامات میں اس کا دعویٰ مسترد کر دیا تھا تو نواب شمس الدین وہ بقایاجات، جو پنشن یافتہ افراد کی حکم عدولی کی وجہ سے جمع ہو گئے تھے، یکمشت ادا کرنے سے قاصر تھے۔ نواب کی وفات کے بعد ان کے مطالبوں کو اور مرحوم کی ریاست کے دیگر قرض خواہوں کے اسی قسم کے مطالبات کے ساتھ لفٹننٹ گورنر آگرہ کے حکم کے بموجب خصوصی کمشنروں کو بغرضِ تسویہ سپرد کر دیا گیا۔ تفتیش سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مدعیان 3750/ روپے کے حقدار ہیں اور مذکورہ رقم کے سلسلے میں ایک ڈگری ان کے حق میں جاری کر دی گئی۔ چونکہ ریاست کی آمدنی مطالبات کے مساوی نہ تھی، لہٰذا حکومت نے یہ

---

(119) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 223-224

فیصلہ کیا کہ قرض خواہ اثاثے کے پیشِ نظر منافع حاصل کریں گے، چنانچہ مذکورہ مدعیان نے بھی اسی اصول کے تحت اپنے حقوق حاصل کیے۔ مدعیان کے اس بیان کہ دہلی کے خزانے میں 3555/ روپے جمع ہیں، جو فیروزپور کے بعض مسمار شدہ مکانات سے حاصل شدہ رقم ہے، کے جواب میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ خزانے میں صرف 2248/ روپے جمع ہیں، جو بندوقوں اور کارتوسوں کی فروخت سے حاصل شدہ آمدنی ہے [اور] یہ رقم بلاشرکت غیر سرکار برطانیہ کی ملکیت ہے۔ مذکورہ بالا واقعات کے پیشِ نظر یہ رائے ہے کہ مدعیان کسی بھی خصوصی مراعت کے حقدار نہیں اور اگر ان کی درخواست کے مطابق عمل درآمد ہوتا ہے تو دیگر قرض خواہ بھی بالکل اسی طرح ملنے والے منافع کے بارے میں عدم اطمینان کا اظہار کریں گے۔[120]

[مٹکاف کی اس رائے سے 2/ مارچ 1840ء کو قائم مقام سیکرٹری نے اتفاق کرتے ہوئے مطلع کیا کہ] مرزا اسد اللہ خاں کے اس دعوے کے متعلق، جس کے تحت مدعی نے مرحوم شمس الدین خاں کی جائداد کی فروخت سے حاصل شدہ آمدنی سے اپنی پنشن کے بقایاجات کا تقاضا کیا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ متذکرہ رقوم دہلی کے سرکاری خزانے میں جمع ہیں، مطلع کیا جاتا ہے کہ عزت مآب لفٹننٹ گورنر صاحب بہادُر آپ کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں اور موصوف کی یہ رائے ہے کہ [اسد اللہ خاں کا] مذکورہ دعویٰ بالکل ناقابلِ پذیرائی ہے۔[121]

○○○

میرے پراگندہ خیالات کا مجموعہ، جسے 'دیوان' کہہ کر یاد کیا جاتا ہے، اسے ایک 'گلدستہ' کے طور پر [میجر جان جاکوب کی] اُس انجمن پیش کیا جائے، یہ ایک ایسی ہی بات ہے کہ کوئی شخص خاروخس کا مجموعہ اہلِ چمن کو پیش کرے۔ میرے کہے ہوئے کو وہ عزت وتوقیر کہاں حاصل ہے کہ اس پر پسندیدگی کی مہر ثبت کی جاسکے۔ مَیں [میجر جاکوب کو] بھیجوں تو شرمندگی، نہ بھیجوں تو ندامت، یعنی حد سے بڑھی ہوئی شرمندگی۔[122]

❑❑❑

---

(120) بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 225-226 **(121)** بحوالہ گوہر نوشاہی 1997ء، ص 127 **(122)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 212۔ فارسی متن: پرتوروہیلہ 2015ء، ص 618

(5)

سر گرانی اَور ہے

(1841ء-1850ء)

نجانے یہ بیوقوفی تھی یا کارِ آگہی کہ مَیں نے بزبانِ انگریزی ایک عرضداشت ملکۂ انگلستان کی سرکارِ دولت مدار میں روانہ کی اور یہ خواہش کی کہ اسے ملکۂ عالیہ کے حضور میں پیش کیا جائے۔ میری نیایش کو عزو قبول بخشا گیا اور امیر الاُمرا چیف سیکرٹری بہادُر کا والا نامہ، جو پنجم ماہ اگست کا لکھا ہُوا ہے، مجھے ملا اور اس میں مجھے یہ ہدایت کی گئی کہ اس عرضداشت کو کاغذاتِ ملکی میں شامل کر کے، جو آخرِ ماہ میں سفینہ ڈاک میں بھیجے جائیں گے، ولایت کو روانہ کیا جائے۔ اس کے بعد سر سودا زدہ پر کیا گزرے گی، یہ کون جانے؟[1]

ooo

اس گوشہ نشینی میں کہ میری جاں گدازی کا زاویۂ خلوت ہے، مَیں شاہِ اودھ [نواب محمد علی شاہ] کی ثناو ستائش کروں اور اس کے دستر خواں سے اپنے لیے صلہ و انعام کی توقع رکھوں، لیکن یہ کام نہیں ہو گا، جب تک کہ کوئی ایسا شخص درمیان میں نہ ہو، جو شاعر پر مہربان ہو اور اس بے چارے کے دردِ دل سے آگاہی رکھتا ہو اور اس کے فن کی قدر و قیمت کو جانتا ہو، تاکہ وہ صحیح طور پر اس بات میں گزارش کر سکے، سخنور کو سخن کے ذریعے متعارف کرا سکے اور 'باندازۂ بایست' اس کی تحسین کر سکے۔ اسی کے ساتھ شاہِ اودھ کی زبان اور دستِ گوہر فشاں سے جو کچھ ادا ہو، وہ اسے سُنے اور اس فقیر ستائش گزار تک اسے پہنچائے۔ یہ بھی شرط ہے کہ اس میں کسی طرح کی بیگانگی اور خود نگہداری نہ ہو اور سخن گزار کو اس گراں مایہ گوہر کی طرف سے سپاس قبول کرنے

(1) تنویر احمد علوی 2016ء، ص280۔ فارسی متن: پرتوروہیلہ 2015ء، ص658

میں کوئی تکلف نہ ہو۔ جوہر اندیشہ کہتا ہے کہ ایسا یگانۂ روز گار شخص اور جوہر ستائش کے راز سے آشنا اور پھر اس قدر استواری کے ساتھ پیوند یک دِلی رکھنے والا سوائے اس نشانِ مہر و مروّت [مولوی خلیل الدین] کے، اَور کوئی نظر نہیں آتا۔[2]

○○○

[اگست 1841ء میں **دہلی اردو اخبار** میں خبر شائع ہوئی کہ] اِن دِنوں گرز قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے، مثل ہاشم خاں وغیرہ کے، جو سابق بڑی علّتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے، بڑا قمار ہوتا تھا، لیکن بسبب رعب و کثرتِ مردان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانیدار درانداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اَب تھوڑے دِن ہوئے، یہ تھانیدار قوم سے سید مقرر ہوا ہے۔ یہ مرزا نوشہ، ایک شاعر، نامی رئیس زادہ، نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی، لیکن اس نے دریافت کا کام فرمایا، سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ اعلیٰ قدر مراتب ہُوا مرزا نوشہ پر سو روپے، نہ ادا کریں تو چار مہینا قید۔[3]

○○○

جب تک دِل اپنے قابو میں نہیں، زبان سے سخن سرائی ممکن نہیں۔ دیدہ ورانِ صاحبِ دل اس بات کو جانتے ہیں کہ دِل و دِماغ کی کس حد تک ہم آہنگی اور یکجائی ضروری ہے کہ ایسا کوئی نقش صورت پزیر ہو، جسے بالغ نظر پسند فرمائیں۔ اس دِل کے ساتھ کہ شکستہ اور میرے پہلو میں اس طرح ہے، جیسے میرا کوئی دیرینہ دشمن ہو، ہر گز ہر گز سخنوری و معنی آفرینی ممکن نہیں۔[4]

اندوہ و ملال کی فراوانی کی وجہ سے بے طرح ناسازگاریِ حالات کا شکار ہو گیا ہوں۔ خوش سوادیوں کے ساتھ سانس لینا اور ادائے خاص کے ساتھ باتیں کرنا مجھ پر اس حد تک گراں ہے کہ اگر میری آنکھیں [شیفتہ جیسے دوست کے] نامۂ عنایت کی دید سے اچانک رَوشن اور دِل نشاطِ تحریر سے زمزمہ سرا ہو جائے، تب بھی اپنے دِل کو اندوہ و ملال کے گرداب سے باہر لانا اور خود کو سخن

---

(2) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 208-281۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، 658-659 (3) بحوالہ محمد عتیق صدیقی 1957ء، ص 273 (4) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 297-298۔ ترجمۂ اشعار: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 278-279۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 707-708

سرائی پر آمادہ کرنا ممکن نہ ہو گا۔ درماندگی کی داستان اَب اسی طرح بیان ہو سکتی ہے کہ اسے بیان نہ کیا جائے۔ اس ہنگامے کی آشفتہ سری کو اسی طور پر سمجھایا جاسکتا ہے کہ وہ تحریر میں نہ آئے۔[5]

○○○

خان صاحب عظیم المناقب نوروز علی خاں بہادُر نے [منشی محمد حسن خاں کو] اس مقصد کے لیے روانہ کیا ہے کہ جب مَیں دوبارہ دہلی آؤں تو مَیں غالبِ ہرزہ سرا کی پراگندہ تحریروں کو جمع کروں اور اسے بہترین 'رہ آورد' سمجھوں۔ افسوس، مجھ جیسا ایک انسان، جس نے اندوہِ بے کسی کو اپنا لیا ہو اور خود کو ناکس و نامراد سمجھ لیا ہو؛ جو دِلوں کے دروازے سے نکال دیا گیا ہو اور گمنامی کے گوشہ میں بیٹھا ہو، وہ کہہ کیا سکتا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ آزادگی کی وجہ سے کہ مَیں کبھی اس فکر میں مبتلا نہیں ہُوا کہ مَیں نے جو کچھ لکھا ہے، مَیں اسے مکرر لکھوں؛ لیکن میرے [سبھی] بھائیوں میں ایک [ضیاء الدین احمد خاں] نے میری نثری تحریروں کو جمع کرنے میں عمر صَرف کی ہے۔ ان اَوراق کو مَیں نے اس برادرِ گرامی قدر سے مانگا اور ایک اچھے کاتب کو اس پر مقرر کیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کتاب کا کاغذ رنگین ہوتا اور ان اَوراق کے نقش و نگار سنہرے، لیکن چونکہ میرے مخدوم پابہ رکاب اور رُوبراہ تھے، اتنا وقت نہیں تھا کہ رنگ آمیزی اور نقش آرائی کے لیے وفا کر سکے؛ اسے [نواب نوروز علی خاں] کی خدمت میں اس طرح بھیج رہا ہوں، جیسے کوئی مشتِ خس سنبلستاں میں اور کاغذ کے پھول گلستان میں ہدیۃً روانہ کرے۔ یہ چوالیس برس تک چراغِ نفس جلانے کا صلہ اور اپنے سرمایۂ عمر کو مفت بیچ ڈالنا ہے، جو اُس دیدہ ور و صاحبِ دل کے قدموں پر نچھاور کر رہا ہوں۔[6]

مطبع [سلطانی] نَو بنو نقش صورت پذیر ہوتے ہیں اور یہی وہ 'نَو آئین کدہ' ہے، جس نے غالبِ بے نوا کے رشحاتِ قلم کو زیورِ طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ اس میں دیوانِ ریختہ بھی ہے کہ وہ ناتمامی کا 'نمونہ تام' ہے؛ ممکن ہے، اسی ماہ میں طباعت کا کام پورا ہو جائے؛ اسی طرح **پنج آہنگ** اور **دیوانِ فارسی** کا انطباع اس پر منحصر ہے کہ خریداروں کی درخواستیں کتنی موصول ہوئی ہیں۔[7]

○○○

---

(5) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 160۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 441-442 (6) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 290-291۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، 621-622 (7) تنویر احمد علوی 2016ء ⇦

مَیں نے جو قطعہ تہنیت شہزادۂ والا تبار کے تولّد سے متعلق لکھ کر بارگاہِ خسروی میں پیش کیا تھا، [میجر جان جاکوب] نے اسے **زُبدۃ الاخبار** کے اَوراق میں پڑھا اور اس کے حق میں کلماتِ تحسین نگارش فرمائے۔[8]

○○○

ہنوز صحیفۂ بہاریں کے ورُود کی شادمانیاں فضائے دِل سے رخصت نہ ہوئی تھیں کہ دوبارہ لطف و کرم کے ساتھ آموں کے آٹھ ٹوکرے پہنچے اور میری آرزو خرامی پر آٹھ بہشتوں کے دروازے کھول گئے۔ یہ پاکیزہ اور شیریں آم، اے سبحان اللہ! شکل دیکھو تو دودھ سے دُھلے ہوئے اور سیرت کا خیال کرو تو شہد میں گھلے ہوئے۔ اس میں آدھے کچے اور آدھے پکے ہیں۔ سبحان اللہ، شاخِ طوبیٰ کا میوہ اگر پختگی میں یہی خوش رنگی رکھتا ہے اور خامی میں یہی دِل آویز خوشبو تو مَیں ضامن کہ اہلِ بہشت ہرگز شرابِ طہور کی طرف مائل نہ ہوں گے اور باغِ بہشت کے سبز پوش کسی کا دِل نہ چرا سکیں گے۔ یہ ایزدی عنایت مجھ پر فراوانی کے ساتھ ہو اور جو وقت آنے سے پیشتر آ گئے، وہ گویا مژدۂ وصل لے کر آئے ہیں کہ مَیں اس کا آرزومند ہوں کہ میرا نام [میرے] دوست [نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ] کی زبان پر رہے۔[9]

○○○

منگل کا دِن اور فروری [1843ء] کی اٹھائیس تاریخ، ایک خط بذریعہ ڈاک [میجر جان جاکوب بہادُر] کی خدمت میں بھیجا گیا۔ قطعات اور تاریخ کو درست و صحیح کر کے، جو ٹھیک تھا، اس کو اسی طرح رہنے دیا ہے۔ غزلوں کو ابھی فکرِ تیزرَو کی پرکار پر نہیں ناپا۔[10]

[17/مارچ 1843ء] جمعہ کا دِن جب رات میں بدل گیا تو بزمِ سخن آراستہ کی گئی، اس لیے کہ [اس بزمِ سخن کے لیے زمینِ طرح پر] مَیں نے [کوئی غزل] نہیں کہی تھی، تہی دستی کی شرم کے باعث مَیں سر بگریباں تھا۔ محبت والا جاہ نے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے دو فرشتے میرے لیے مقرر کر دیے، یعنی زین العابدین عارف اور غلام حسن خاں محو۔ یہ دونوں میرے خلوت کدۂ تنہائی

⇦ ص 213۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 619 **(8)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 214۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 619 **(9)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 162-163۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 444 **(10)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 191۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 620

میں آئے اور مجھے انجمن میں لے گئے۔ میرے مخدوم و معزم اور صدر الصدورِ اعظم مولوی مفتی صدرالدین خاں بہادُر کی زیارت نے رنجِ راہ کی تلافی کر دی۔ لوگوں کی خواہش یہ ہوئی کہ مولانا صہبائی غزل پڑھیں، جو طرحی زمین میں تھی۔ اس میں دو تین شعر بہت دِل نشین تھے۔ جب غزل خوانی ختم ہوئی تو ایک نئی زمین، 'گریبانم نمی آید، دامانم نمی آید' بحر ہزج مثمن سالم میں طرح کی گئی۔ زین العابدین عارف اور جواہر سنگھ جوہر نے زمینِ طرح میں دو غزلیں پڑھیں اور دلوں پر اپنی نغز گوئی کا نقش بٹھا دیا۔ مَیں نے وہ غزل پڑھی، جو اُس دِن کہی تھی اور نغمہ سرا ہُوا :

صبح شد خیز کہ رُودادِ اثر بنمایم چہرہ آغشتہ بخوں نابِ جگر بنمایم[11]

OOO

[22/ مارچ 1843ء] کہ ستارۂ ناہید (بدھ) کا دِن تھا، بعد شام مَیں حضرت آزُردہ کی بزم میں باریاب ہُوا۔ اس سے پیشتر کہ حرفِ مدعا میری زبان پر آتا، مَیں نے رنجوری کے آثار کو اپنے مخدوم کی پیشانی میں آشکار پایا۔ نزلے زکام کی شکایت تھی اور اس کا اظہار ہو رہا تھا کہ کئی راتیں انھوں نے جاگتے ہوئے گزاری ہیں۔ مختصر یہ کہ مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے، [البتہ] مجھے جانے کی رخصت دی۔ مَیں نے ریختہ گویوں کی انجمن میں بہت سے شاعروں کا مجمع دیکھا، لمبی لمبی غزلیں ان لوگوں نے پڑھیں۔ غزل خوانی کے سلسلے میں جب مجھ تک نوبت پہنچی تو مَیں نے 'ملک نخواست فلک نخواست' زمین میں کہی ہوئی اپنی غزل سنائی۔ اس کے بعد انشا کی ہوئی غزل پڑھی:

چہ عیش از وعدہ جوں باور ز عنوانم نمی آید بنوعِ گفت می آیم کہ می دانم نمی آید[12]

یہاں تک کہ جب مَیں گھر واپس آیا اور بستر پر لیٹا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔[13]

محمد ضیاء الدین خاں بہادُر نے عرفی کے اس مصرعے کو بطور طرح تجویز کیا ہے، 'صد سال می تواں بہ تمنا گریستن'۔ اس زمین میں طالب آملی کا بھی ایک قصیدہ ہے اور عرفی شیرازی کی غزل۔ اَب دیکھنا یہ ہے کہ یہ شعراے پیشین غالبِ بے نوا کو کس طرح زمزمہ سنجی پر آمادہ کرتے ہیں۔[14]

---

(11) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 165-166۔ فارسی متن: پر تو روہیلہ 2015ء، ص 447 (12) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 166 فارسی متن: پر تو روہیلہ 2015ء، ص 448 (13) تنویر احمد علوی 2016ء ص 166 فارسی متن: پر تو روہیلہ 2015ء، ص 448 (14) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 167 فارسی متن: پر تو روہیلہ 2015ء، ص 448

[31/مارچ 1843ء] کا دِن تھا، جب بزمِ سخن کی نوید سامعہ افروز ہوئی۔ شام کے وقت وہی دو فرشتے [عارف اور محو] آئے اور مجھے اپنے ساتھ اس انجمن میں لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی کی طبیعت ناساز تھی، اس لیے وہ نہیں آ سکے۔ حضرتِ آزُردہ کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا گیا۔ اگرچہ دیر سے آئے، لیکن ان کی آمد نے میرے دِل کو صفا اور میری زبان کو نوا بخشی۔ اس بندۂ عاجز کو 'گریستن' والی زمین میں نگارشِ قصیدہ کا اتفاق ہُوا۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ اس ورق کو ناپسندیدہ متاع کی طرح واپس لے جاؤں اور ریختہ گویوں کو دردِ سر میں مبتلا نہ کروں۔ حضرتِ آزُردہ کے آنے سے میرا دِل بڑھ گیا اور میری زبان کو زمزمہ سنجی کی اجازت مل گئی۔ سحابی بھی بن بلائے وہاں حاضر تھا اور اس زمین 'گریستن' میں اس نے ایک غزل لکھی تھی۔ میرے قصیدے کو سنا تو شرمندہ ہُوا اور کہی ہوئی غزل کے چند اشعار سنا کے لوٹ گیا۔[15]

OOO

[مَیں] اس خیال میں تھا کہ قصیدہ ایک ورق پر لکھ لوں اور [شیفتہ] کے درِ دولت کے پرستاروں کی دید کے لیے اسے روانہ کروں؛ دوپہر تک فرصتِ نگارش نہ ملی اور نمازِ ظہر کا وقت تھا کہ شہابی اور فتاحی آ گئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوش رنگ گلدستہ تھا، یعنی [شیفتہ] کا نامۂ مبارک، جو ڈاک میں آیا تھا، فتاحی نے مجھے سپرد کیا۔ وہ چلے گئے اور بارش برسنا شروع ہوئی۔ بادل قطراتِ آب برسا رہے تھے اور مَیں والا نامہ کے موتی چن رہا تھا، یہاں تک کہ میرا گھر پانی سے اور میرا دامن آبدار موتیوں سے بھر گیا۔ سبحان اللہ! کیا غزل ہے اور کیا اندازِ بیان۔ [شیفتہ] نے سخن کے مرتبے کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا اور اس طرح سخن سرائی [ان] کا حق ہے۔[16] [شیفتہ کی] اس غزل کو دیکھ کر مَیں [اپنے قصیدے کو] بھول گیا اور وہ میری نظر سے گر گیا۔ اس کے مقطع کا کیا کہنا، ارے قیامت! اس مقطع کی ستائش کس زبان سے ہو۔ اس کے باوجود کہ مَیں سخن سرائی میں [شیفتہ] کا ہَوا خواہ اور ستائش گر ہوں، مجھے [ان] پر رشک آتا ہے۔[17]

OOO

(**15**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 169۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 448 -449 (**16**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 169-170۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 449 (**17**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 171۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 449

ایک صاحب، میرے نیم آشنا، خدا جانے، کہاں کے رہنے والے، کسی زمانے میں واردِ اکبر آباد ہوئے تھے؛ کبھی کہیں کے تحصیل دار بھی ہو گئے تھے، زبان آور اور چالاک۔ اکبر آباد میں نوکری کی جستجو کی، کہیں کچھ نہ ہُوا۔ میرے ہاں دو ایک بار آئے تھے؛ پھر وہ، خدا جانے، کہاں گئے، مَیں دِلّی آ رہا۔ امجد علی شاہ کے عہد میں اُن کا خط ناگاہ مجھ کو بسبیلِ ڈاک آیا:

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

آپ سے جدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا۔ جے پور میں نوکر ہو گیا، وہاں سے دو برس کے بعد کہاں گیا اور کیا کیا، اَب لکھنؤ آیا ہوں۔ وزیر سے ملا ہوں، بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت [ملاقات] انھی کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے۔ بادشاہ نے 'خانی' اور 'بہادُری' کا خطاب دیا ہے، مصاحبوں میں نام لکھا ہے، مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر کو مَیں نے آپ کا بہت مشتاق کیا ہے۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط، جو مناسب جانیے، وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجیے گا تو بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور وزیر کا خط مشعرِ فرمانِ طلب آپ کو پہنچے گا۔

مَیں نے اُس عرصے میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جس کا بیتِ اسم یہ ہے:

امجد علی شہ آنکہ بہ ذوقِ دعاے او   صد رہ نمازِ صبح قضا کرد روزگار

متردّد تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں، توکلت علی اللہ بھیج دیا۔ رسید آ گئی صرف، پھر دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا، وزیر پڑھ کر بہت خوش ہُوا، بہ آئینِ شائستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ مَیں متوقع ہوں کہ میاں بدالدین مہر کن سے میری مہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجیے۔ چاندی کا نگینہ مربع اور قلم جلی۔ فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دی، رسید آئی اور قصیدے کے بادشاہ تک گزرنے کی نوید، بس۔ پھر دو مہینے تک اُدھر سے کوئی خط نہ آیا۔ مَیں نے جو خط بھیجا، اُلٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقیع کہ 'مکتوب الیہ یہاں نہیں'۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہُوا کہ اُس بزرگ کا وزیر تک پہنچنا اور حاضر رہنا سچ، بادشاہ کی ملازمت [ملاقات] اور خطاب ملنا غلط۔ بہادُری کی مہر بفریب حاصل کر کے مرشد آباد کو چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیے تھے۔[18]

(18) خلیق انجم 1990ء، ص 998-1000

یہ نیاز مند [جیمس طامسن] کی ہنر پسندی کے ساتھ فرماں روائی و جاہ مندی کو خود اپنے بخت کی بلندی تصور کرتا ہے۔ گورنریِ اکبر آباد کی مسند نشینی اور اس عہدۂ جلیل کی وجودِ مسعود سے آرائش کو مَیں اپنی دعاے سحر گاہی کی قبولیت کا نتیجہ قرار دیتا ہوں۔ اس صورتِ حال نے میری آرزوؤں کے سامنے درِ دولت کھول دیا، نیز اس لیے کہ وہ شہر میرا مسقط الراس ہے اور اسی سر زمین میں میری جاگیر بھی تھی، میری امیدوں میں ہزار گنا اضافہ کر دیا۔[19]

○○○

اب کہ [مظفر حسین خاں] کلکتہ پہنچ گئے ہیں، کیا ہی اچھا ہو کہ دِل نوازی و کارسازی کے لیے کوئی مستحکم بنیاد قائم ہو جائے اور مکرمی امیر حسن خاں بسمل میرے ساتھ صلح و آشتی پر آمادہ ہو جائیں۔ منشی عاشق علی خاں کے ساتھ میری وفادارانہ روِش کے یہ معنی تو ہرگز نہیں کہ امیر حسن خاں کو جان سے زیادہ عزیز نہ رکھوں اور خود ان کے حق گزاروں میں شمار نہ کروں۔ دلِ حسرت منزل زخمِ کہنہ سے مجروح نہیں ہے اور میری طبیعت کا آئین دوستوں کے ساتھ بجز مہر و وفا کے اَور کچھ نہیں۔[20] [انھیں چاہیے کہ] فقیر سے صرفِ نظر [کریں]۔[21] مَیں خدا سے اپنی زندگی کی آرزو اس لیے رکھتا ہوں کہ شاید کبھی تو وہ وقت آئے کہ مَیں معذرت پیش کر کے اس کی تلافی کر سکوں۔[22] مَیں [ان] کی محبت کا دَم بھرتا ہوں، [وہ بھی] مجھ سے بھی خلوص اور اپنائیت کے ساتھ پیش آئیں گے۔ میری طرف سے میرے دوست کے دِل میں مہر و محبت کے جذبات کے سوا کچھ نہ ہونا چاہیے۔ [خدا کرے کہ ہماری] زبانیں باہم غزل سرا اور دِل باہم مائل بہ محبت ہوں۔[23]

ان ہی دنوں میں کہ مشفق و مہربان طالع یار خاں اور سعادت مند و اقبال آثار اصغر یار خاں اسلام آباد ٹونک سے [دہلی] آئے تو انھوں نے [ایک بڑا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال دیا[24] اور] مجھے اردو زبان میں لکھا ہُوا [بانک کے داؤ پیچ پر مشتمل[25]] ایک مسودہ دِکھایا اور فرمایا کہ

---

(19) تنویر احمد علوی2016ء، ص220-222۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص444-445 (20) تنویر احمد علوی2016ء، ص 243-245 ۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 656-657 (21) تنویر احمد علوی2016ء، ص273۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص662 (22) تنویر احمد علوی2016ء، ص276۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 663 (23) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 278۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء ص664 (24) پرتو روہیلہ 2015ء ص330 فارسی متن: حوالۂ مذکور ص761 (25) پرتو روہیلہ ⇦

خداوند [وزیر الدولہ وزیر محمد خاں، والی ٹونک] کی رضاے آسمان نسبت یہ چاہتی ہے کہ یہ عبارت فارسی میں ترجمہ کر دی جائے، تاکہ ایک دِل کش نسخہ تیار ہو جائے۔ چونکہ حق پرستی و حق گزاری (میرا) دستور اور خداوندانِ نعمت کے حقوق کی رعایت احکاماتِ دین میں سے ہے، مستقل اس فکر میں تھا کہ اگر موقع ملے تو [وزیر الدولہ کی] کوئی خدمت بجالاؤں، تاکہ جناب [وزیر الدولہ] کی نوازش اور بخشش کی اپنے حتی المقدور تلافی کر سکوں۔[26] چونکہ مَیں بلند مرتبت کے خوانِ نعمت کا ریزہ چین رہا ہوں اور شکرانہ (احسان) مجھ پر واجب تھا، اُس صحیفے کو کہ دیباچہ و خاتمہ دونوں رکھتا ہے، ترتیب دے کر کار فرما کے حوالے کر دیا۔[27] خدا تعالیٰ میری زبان کو شیخی سے محفوظ رکھے اور حق سے امیدوار ہوں کہ سواے حق کے میرے دِل میں کچھ نہ آئے،[28] (البتہ) اس میں ایک عرضداشت کا اضافہ کر دیا، تاکہ (نواب صاحب موصوف کی) میرے نام ایک سند توصیفی کی آرزو کی تکمیل کا سبب بن جائے۔ (مَیں نے) ممدوح کو اس دیباچے میں کس زبان سے (یاد کیا ہے) اور فنِ بانک کی تعریف میں بات کو کس مرتبے پر پہنچا دیا ہے اور ان ساری خوبیوں کے ساتھ کیا دیباچہ اور کیا نفسِ رسالہ، اسلوبِ تحریر کی جدت اور اظہار و بیان کے اچھوتے پن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نفسِ مضمون اپنی خاص روِش کے مطابق قائم رہا ہے۔[29] جب جناب [وزیر الدولہ] کی تعریفیں مشفقی طالع یار محمد سے خصوصاً اور دوسروں سے عموماً سنا کرتا ہوں اور اس محبت کے مشاہدے سے بھی کہ جو میرے ضمن میں ظہور پذیر ہوئی ہے (تو) افسوس کرتا ہوں کہ لارڈ ایلن برو کے عہدِ فرمانروائی میں اطرافِ شہر دہلی [وزیر الدولہ] کے جاہ و جلال کے شامیانوں کا (خیمہ گاہ) تھا تو اس بدبخت کو قدم بوسی کی توفیق نہیں ہوئی۔ اَب سوچتا ہوں کہ اگر موت نے مہلت دی اور تاب و توانائی نے ساتھ دیا تو اس شہر سے ہجرت کی نیت سے نقل مکانی کر کے اپنی مٹھی بھر ہڈیوں کو [ان کی] درگاہ میں پہنچا دوں اور باقی عمر حضرت امیر المومنین [وزیر الدولہ وزیر محمد خاں، والی ٹونک] کے حضور میں گزار دوں۔[30]

⇦ 2015ء، ص330 فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص761 (**26**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص864 فارسی متن: حوالۂ مذکور ص955 (**27**) پرتو روہیلہ 2015ء ص330 فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص761 (**28**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص864 فارسی متن: حوالۂ مذکور ص955 (**29**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص330-331۔ فارسی متن: ص761

○○○

مَیں بیمار ہوں، شانے میں درد اٹھا اور جسم پر (جگہ جگہ) زخم ہو گئے۔ معذوری کے ساتھ زخم کے دیر سے بھرنے کی تکلیف بھی تھی۔ تین ماہ تک صاحب فراش رہا، یہاں تک کہ نواب امین الدین احمد کے مکان اور اپنی حرم سرا تک نہیں جا سکتا تھا۔ اَب کہ وہ تکلیف رفع ہوئی اور وہ زخم ٹھیک ہُوا ہے تو اس بڑھاپے [13/مارچ 1845ء] میں میرے خون نے جوش مارا اور سارے جسم پر آسمان کے تاروں کی طرح دانے نکل آئے ہیں۔ سر سے پیر تک سرخ چکتے پڑ گئے ہیں، جن میں جلن ہے۔ حکیم امام الدین کی ہدایت پر فصد کھلوائی ہے اور شاہترہ سبز کا عرقِ مصفی پی رہا ہوں۔[31]

○○○

مَیں فقیر ضرور ہوں، لیکن فقیر بار گاہ اور رُوشناسِ بادشاہ۔ اگر مَیں نے تخت نشینِ دہلی کی مدح میں موتی پروئے ہیں تو اس نے (بھی میری سخن پروری کو سراہتے ہوئے) اپنی شفقت کا منشور مجھے دیا ہے اور اگر گورنر جنرل کا قصیدہ کہا ہے تو اس نے اپنی خوشنودی کے خط مجھے بھیجے ہیں، چنانچہ ایک سند توصیفی ابو ظفر سراج الدین بہادُر بادشاہ کی اور ایک خط جیمس طامس گورنر اکبر آباد کا (اِس وقت) میرے سامنے ہے۔ ہر چند کہ ان سلطان صفت حکام نے التفات نامے مدحیہ قصیدے کے وصول ہونے پر اظہارِ خوشنودی و نمائش مہربانی کے طور پر (بھیجے گئے) ہیں۔ افسوس کہ نواب عالی جناب (وزیر محمد خاں والی ٹونک) نے تحسین کا جواب تحسین سے نہیں دیا اور میری عرضداشت کے جواب میں خط نہیں لکھا۔ ایسا ہر گز نہیں کہ مَیں صلے، عطیے اور انعام کے نہ ملنے پر شاکی ہوں؛ البتہ خط کے نہ آنے پر رنجیدہ ہوں۔[32]

میرے ہمدموں نے میرے مجموعۂ گفتار کو، جس میں قصیدہ، غزل، قطعات اور مثنوی شامل ہیں، انطباع کی صورت بخشنے کا ارادہ کیا ہے،[33] [چنانچہ] میرا فارسی کلام کا دیوان، جو کم و بیش سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے، [منشی نورالدین احمد کے] (مطبع دارالسلام دہلی میں) چھپ رہا ہے[34] اور

⇦ (**30**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 864۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص955 (**31**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 308۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص738-739 (**32**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 331-332 فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص762 (**33**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص286۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص730 (**34**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص332۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص762

طباعت قصائد تک پہنچ چکی ہے،[35] ممکن ہے کہ دو ماہ کے اندر مکمل ہو جائے۔ مَیں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک جلد بطور عطیہ کے [وزیر محمد خاں کی] خدمتِ عالی میں بھی بھیجوں گا، تاکہ مجموعۂ نثر کے ساتھ دیوانِ نظم بھی ان کے پاس ہو۔ میرا ارادہ ہے کہ چونکہ نواب نے مجھے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور میری مدح کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا تو مَیں بھی کم ظرفی سے کام لوں اور اس قصیدے پر خطِ تنسیخ کھینچوں اور دیوان میں شامل نہ کروں۔ صد افسوس کہ میرا خونِ جگر پینا رائگاں گیا۔[36]

ooo

اب مَیں وہ غالب نہیں (ہوں)، جو متواتر سخن میں مشغول اور آرائشِ گفتار کے پیچ و تاب میں مصروف رہتا تھا؛ اَب مَیں وہ غالب بھی نہیں کہ اگر جرعہ نوشی کے لیے مجھے پانی سے بڑھ کر شراب نہیں ملتی تھی تو احساسِ غم کے باعث خون کے آنسو بہہ نکلتے تھے اور غصہ کے باعث لہو کے گھونٹ پیتا تھا؛ بلکہ وہ غالب ہوں، جس کا دِل زمانے کے غموں سے شکستہ اور جس کا جگر محبوبوں کی تیر باری سے چھلنی ہے۔ داغوں کی کثرت سے جس کا تنِ ناتواں سروِ چراغاں سے مشابہ ہے، درد کا جسم کے جوڑ جوڑ سے الگ الگ ایک رشتہ ہے، ہر پارۂ جگر میں خون جوش مار رہا ہے؛ غرض کہ اَب سر آغاز پائے انجام تک آ پہنچا ہے۔ شاید میرے دِن کی شام ہو گئی اور میرا وقت تمام ہو گیا۔[37]

ooo

ایک زمانے سے یہ آرزو گاہ گاہ میرے دِل میں سر اٹھاتی تھی کہ مَیں [نواب حشمت جنگ بہادُر] کی خدمتِ والا میں اپنی چالیس سال کی جگر کاوی کا 'رہ آورد' یعنی اپنا مجموعۂ فارسی نظر گاہِ عالی میں پیش کروں، لیکن شکوہِ سروری اس نوع کی جرأت و گستاخی کی رخصت نہ دیتا تھا۔ اب، جب کہ مَیں نے یہ سن لیا کہ یہ فقیر، بادشاہ کا رُوشناس ہے اور یہ کہ امرائے دولت پناہ فقرا کے غوغا سے ناخوش نہیں ہوتے، یہ عرضداشت خاں صاحب جمیل المناقب کو پیش کروں تو ایک درویش کا تحفہ بادشاہ کی خدمت میں نذر گزرانیں گے کہ دریوزہ گروں پر سلطانی نوازش کی صورت سامنے آئے اور ارمغانِ مرحبا کے عطیہ سے تلافی کی شکل نکل سکے۔[38]

---

(35) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 308۔ فارسی متن: ص 739 **(36)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص 332۔ فارسی متن: ص 762-763 **(37)** تنویر احمد علوی 2016ء ص 285-286۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 730
(38) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 283-284۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 665-666

کیا کروں، میرا (تو سارا) سرمایہ ہی شاعری ہے اور اس (جنس) کو اس قلمرو میں کوئی ایک جَو کے بدلے بھی نہیں خریدتا، گویا ساری زندگی جھک مارتا رہا۔ کاش، ابتدا ہی سے مَیں گانے بجانے کی طرف توجہ دیتا اور چنگ و چغانہ بجانا سیکھتا، (لیکن) اگر مَیں مثال کے طور پر پیشہ ور گانے بجانے والوں میں ہوتا، تب بھی اُس جماعت کے بد قسمتوں میں ہوتا اور میری عمر اِسی طرح ناکامی اور تیرہ بختی میں گزرتی۔ ایک دِن میرے ایک ہمدم کو میرے حالِ زار پر بڑا ترس آیا، بہت رنجیدہ ہو کر کہنے لگا، افسوس اس امر پر ہے کہ قدرت نے تجھے اکبر اور شاہجہان کے عہد میں دُنیا میں نہ بھیجا۔ مَیں نے کہا، خدا کی قسم، مَیں اگر اُس مبارک دَور میں بھی ہوتا، تب بھی اِسی طرح خستہ و خوار ہوتا اور زمانے کے دستر خوان پر میری خوراک خون (جگر) کے علاوہ اَور کچھ نہ ہوتی اور میری دسترس دو روپے روزینہ سے زیادہ نہ ہوتی۔[39]

OOO

رگِ قلم سے تراوش پائے ہوئے جگر پاروں کو [آغا علی خاں کی خدمت میں] فراہم کر رہا ہوں اور [اُن کی] حسین انجمن میں ارمغانِ لالہ و گُل کے طور پر بھیج رہا ہوں۔ سبحان اللہ، خریدار ایسا صاحبِ بصیرت کہ دیدہ وری اس کے اندازِ نظر کی قسم کھائے اور بیچنے والے کے کالائے بد کا یہ عالم کہ اگر اسے 'ہیچ' کے ہم پلہ قرار دیا جائے تو یہ خود 'ہیچ' کے رکھنے کے مترادف ہو۔ یہ گستاخی فرمانِ محبت کے زیرِ اثر ہے اور یہ بے ادبی بہ تقاضائے روزگار۔ ہاں، اہلِ روزگار کے واسطے اس طرح کا استعجاب بھی بہت ہے اور محبت کی اس نوع کی خود نمائی بھی۔ میری مثال ایسی ہے، جیسے کوئی کمزور چنیوٹی ٹڈی کی ٹانگ [حضرت] سلیمان کے پاس بطور ارمغان لے جائے اور کوئی صحرا نشین نمکین پانی کا آبخورہ امیر بغداد کو پیش کرے۔ اس زمانے میں خاں صاحب مہربان خوش وقت علی خاں کو کانپور پہنچنے کا اتفاق ہُوا۔ چونکہ وہ اُس محفل کے باریافتگاں میں ہیں اور میرے مخلص احباب میں ہیں، مَیں نے [امین الدولہ کے نام ایک] خط ان کو پیش کر دیا، تاکہ جب وہ وہاں پہنچیں تو اپنے پردۂ گفتار کے ساتھ مَیں بھی سراپردۂ قربت میں جگہ پاؤں اور حجاب بیگانگی کا درمیاں سے اٹھ جائے۔ [یہ ارادہ بھی ہے کہ] دیوانِ فارسی بھی [ان کی] نظر گاہِ التفات میں گزرانا جائے گا۔[40]

(**39**) پرتورہیلہ 2015ء ص195۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص624-625(**40**) تنویر احمد علوی 2016ء⇦

[سید احمد خاں] کے فرمانِ الفت آثار کے پہنچنے سے مجھے خوشی ہوئی، لیکن کسی (شاعر) کے ایک دو شعر لے کر اس کلام پر اپنی طرف سے دو چار اشعار کا اضافہ کر دینا (بھلا) کون سا اصولِ سخنوری اور اندازِ معنی پروری ہے، خاص طور پر یہ دو اشعار کہ جن میں سوائے عربی کے بھاری بھر کم الفاظ کے، کوئی نازک خیالی موجود نہیں اور مزید یہ کہ ایسی بحر میں کہے گئے ہیں کہ ایرانیوں میں سے بھی کسی نے اس بحر میں غزل نہیں کہی۔ یہ اس لائق ہیں کہ بھکاری ان کو یاد کر لیں اور دروازے دروازے پُر سوز لَے میں گاتے پھریں اور کوئی اپنا گریبان پھاڑ ڈالے، نہیں نہیں۔ [قتیل کے شاگرد] مخدومی مولوی غلام امام شہید سلمۃ اللّٰہ تعالیٰ نے جو کچھ کہا ہے، خوب کہا ہے اور اس سے بہتر نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ شاعری اور سخنوری نہیں؛ یہ کوئی دوسری چیز ہے۔[41]

○○○

اس مبارک زمانے میں امیر سلطان شکوہ نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خاں بہادُر حشمت جنگ کہ مسند نشین ریاست فرخ آباد ہیں، میری طرف توجہ فرما ہو کر یہ چاہا کہ مَیں فرخ آباد کا رُخ کروں۔ اگرچہ نامرادی و گوشہ نشینی میرا دستورِ زندگی بن گیا ہے، لیکن اس محبت کو دیکھتے ہوئے مَیں نے ارادہ کیا ہے کہ مَیں اپنے پائے خوابیدہ کو حرکت میں لاؤں اور دہلی سے فرخ آباد کا سفر اختیار کروں۔[42]

دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مِری زباں کے لیے
نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک — بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے
زمانہ، عہد میں اُس کے، ہے محوِ آرائش — بنیں گے اَور ستارے اَب آسماں کے لیے
ورق تمام ہُوا اور مدح باقی ہے — سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے[43]

○○○

⇦ ص265-267۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص626-627 (**41**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص855۔ فارسی متن: ص947-948 (**42**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص235۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص691

(**43**) غالب 1996ء، ص286

سرکارِ انگریز میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پایا تھا؛ [قمار خانہ چلانے کے الزام میں 25/ مئی 1847ء کی گرفتاری اور کئی مہینے جیل رہنے کی وجہ سے] اَب بدنام ہو گیا ہوں۔[44] کوتوال (فیض الحسن خاں) میرا دشمن تھا اور مجسٹریٹ (کنور وزیر علی خاں) ناواقف؛ فتنہ گھات میں تھا اور مقدر خراب۔ باوجود اس کے کہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہوتا ہے، لیکن مجھے خوار کرنے میں اس کا ماتحت بن گیا اور (اس نے) میری گرفتاری کے احکام جاری کر دیے اور سیشن جج نے، باوجود اس کے کہ میرا دوست تھا، ہمیشہ میرے ساتھ محبت سے پیش آیا اور مہربانی کرتا اور بارہا میرے ساتھ شراب نوشی میں شریک رہتا، آنکھیں بند کر لیں اور بے اعتنائی اختیار کر لی۔ مقدمہ صدر عدالت پہنچا، کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور وہی فرمانِ بیداد قائم ہُوا۔ پھر نہ معلوم، کیا ہُوا کہ صدر عدالت سے خود اپنے حکم کی تنسیخ اور میری رہائی کی درخواست کی۔ اس کی درخواست منظور ہوئی، بلکہ اس کی اس خواہش کی تعریف بھی کی گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ سر آوردگانِ قوم نے اس سر پھرے ناانصاف مجسٹریٹ کو ملامت کیا اور میری آزادہ روی اور خاکساری اس پر واضح کی (اور یہ سب) اس طور پر کہ (بالآخر) اس نے میری رہائی کی درخواست خود ہی کی، معذرت (بھی) کی اور اس کے علاوہ بھی معافی، تلافی اور دِل جوئیاں کرتا رہا اور مَیں چونکہ ہر صف، ہر فعل اور ہر

---

(44) خلیق انجم 2008ء، ص246۔ **دہلی اخبار اردو** کی اشاعت 26/ جون 1847ء کو درج ذیل خبر شائع ہوئی: مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دُشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ معظّم الدولہ کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے کہ یہ معززینِ شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہُوا ہے، محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالتِ فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے، ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ (بدر شکیب 1952ء، ص266) اس مقدمے کے بارے میں 2/ جولائی 1847ء کو **احسن الاخبار** میں درج ذیل خبر شائع ہوئی: مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالتِ فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا، اس کا فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اَور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ (بدر شکیب 1952ء، ص268) اس خبر میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر سیشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظرِ ثانی ہو تو نہ صرف سزا موقوف ہو جائے، بلکہ عدالتِ فوجداری سے مقدمہ اٹھالیا جائے۔ (ایضاً)

امر کو منجانب اللہ سمجھتا ہوں اور خدا سے جھگڑا جائز نہیں، اس لیے جو کچھ بھی ہُوا، اس سے بے غم ہُوا اور جو کچھ گزرا، اس پر خوش؛ [البتہ] اس کے بعد یہ خواہش ہے کہ دُنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے اور سب سے بڑھ کر کعبہ کہ خود آزاد منشوں کی پناہ اور رحمت للعالمین کا سنگِ آستانہ عاشقوں کی تکیہ گاہ ہی کافی ہے۔[45]

[ایک دِن مَیں مالک مکان، جنابِ محمد نصیر الدین عرف میاں کالے کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک دوست نے آ کر قید سے چھوٹنے کی مبارک دی، مَیں نے ازراہِ تفنن کہا کہ] کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؛ پہلے گورے کی قید میں تھا، اَب کالے کی قید میں ہوں۔[46]

○○○

اَب کہ طبیعت میں کشائش باقی نہیں (حسنِ بیان کہاں!)۔ اَب وہ دِل آویز نمائش کیسے آئے، کہاں سے آئے؟ نہیں نہیں، شباب ایک حسین رات تھی، جسے ضمیر شبستاں کہنا چاہیے، اس پر خیال ایک رندِ شب زندہ دار اور گرمیِ نظم و نثر ایک خوب صورت ہنگامہ۔ اَب کہ صبح پیری نمودار ہو رہی ہے، انجمن کے شمع و چراغ افسردہ و نیم مردہ اور شب زندہ داریوں کے حسین ہنگامے درہم برہم ہو چکے ہیں۔ اس ناخوشی کے وقت میں جو باتیں زبانِ قلم پر آئیں، وہ مرجھائے ہوئے پھولوں کو چن چن کر ان کا گلدستہ تیار کرنے کے مترادف ایک صورت ہے۔ وہ رنگ، جو افروزشِ نگاہ کا باعث ہے، وہ کہاں اور وہ جرعۂ انبساط، جو راحتِ رُوح کا سبب ہو، وہ کیسے میسر آئے۔ اس بزمِ دِل نشیں کے دوست اَب کہاں؟[47]

○○○

اَن دِنوں ایک دوست نے ایک کتاب [**آثار الصنادید**] تصنیف کی ہے، جس میں دہلی کی نئی اور پرانی عمارات کو ان کے نقشوں کے ساتھ (دِکھایا ہے)۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک چمن آراستہ کر دیا ہو

(**45**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 333۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 764 (**46**) بحوالہ حالی 1897ء، ص 31۔ حالی کا بیان ہے کہ جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے صاحب کے مکان میں آ کر رہے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے، کسی نے آ کر قید سے چھوٹنے کی مبارک باد دی۔ مرزا نے کہا، کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؛ پہلے گورے کی قید میں تھا، اَب کالے کی قید میں ہوں۔ حوالۂ مذکور (**47**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 253-254۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 639

اور اس شہر کے شعرا کے اشعار بھی دیے ہیں۔ اپنی جامعیت کے سبب یہ کتاب مجھے پسند آئی۔[48] [اس میں میرے متعلق لکھا کہ] فی الواقعہ یہ شاعر گرامی منزلت قلمروِ معنی پروری پر متصرف ہے، سخنوری کی ولایت کا فرمانروا ہے، نَو آئین نگاری کے جہاں کا مالک ہے، تازہ گفتاری کے جہاں کا سالار، سخن گستری کے وجود کو حیاتِ نَو بخشنے والا، دیدہ وری کی آنکھ کو بینائی بخشنے والا۔ جس کی وجہ سے قلم کی شان و شوکت بلند ہوئی اور دوات کے خانوادے کا چراغ رَوشن ہوا۔ ان اَوراق کے ایک ایک صفحہ کو ویدِ مقدس پڑھنے والا برہمن سمجھے۔ اس کتاب کا ہر ورق ایک معبد ہے، ایک جہان نما آئینہ خانہ، ایک مصفّا مقام، جس میں مریم کردار پردہ نشین خیموں میں بیٹھے ہُوئے ہیں، اس میں ایسے شوخ چشم بھی ہیں، جو شاہدانِ بازاری سے بھی زیادہ پردہ دری کرتے ہیں۔[49]

○○○

[21/ فروری 1848ء کو] تیموری شہزادوں میں سے ایک نے اپنے یہاں بزمِ سخن آراستہ کی اور اہلِ سخن کو دعوتِ غزل خوانی دی۔ مجھے کہ ریختہ گوئی سے کوئی واسطہ نہیں رہا، اس باب میں بہت تردّد تھا۔ سوچا کیا، لیکن جب اس بزم میں جانا تھا، خاص طور پر اُس وقت، جب مَیں (ہَوادار میں) سوار ہو کر راستہ طے کر رہا تھا، چند شعر بے اِرادہ اس غمزدہ وخوں شدہ دِل سے ٹپک پڑے۔[50]

○○○

میرے پاس بھیڑ کی پوستین سے بنی ایک کُلہ تھی، غالباً اسے کیڑوں نے کھالیا اور میرا سر بے کُلہ رہ گیا۔ اگرچہ مَیں کُلہ کا جویا ہوں اور اس کے ساتھ ابریشمی لنگی کی فکر میں ہوں، جو پشاور و ملتان میں بنتی ہے اور وہاں کے بڑے لوگ اسے اپنے سر سے باندھتے ہیں، لیکن وہ لنگی ایسے شوخ رنگ نہ رکھتی ہو، جو نوجوانوں ہی کو پھبتے ہیں۔ اس کا حاشیہ سرخ رنگ کا نہ ہو، اسی کے ساتھ اس کی پرداز اور اندازِ زیبائی بھی عمدہ ہو، تارہائے زر و سیم کو اس میں استعمال نہ کیا گیا ہو اور سیاہ، سبز، زرد اور نیلا ریشم اس کی بناوٹ میں صَرف کیا گیا ہو۔[51]

○○○

---

(48) پرتورہیلہ 2015ء، ص868۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص959-960 **(49)** سرسید احمد خاں 1847ء، ص118 **(50)** تنویر احمد علوی 2016ء ص227۔ فارسی متن: پرتورہیلہ 2015ء ص689 **(51)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص299-300۔ فارسی متن: پرتورہیلہ 2015ء، ص736

آج کل [27/ اپریل 1848ء] لکھنؤ کا حال دِگر گوں ہے، بادشاہ [امجد علی شاہ] کہ جس کی ثناگری مَیں کرتا تھا اور جس تک میرے دوست (اعتقاد الدولہ نوروز علی خاں) کی رسائی تھی، [13/ فروری 1847ء کو] فوت ہو گیا تھا۔ اس کا بیٹا [نواب واجد علی شاہ]، جو اس کی جگہ تخت نشین ہُوا،[52] [اگرچہ] ابتدا میں مجھے مایوسی ہوئی تھی، لیکن [اَب] معلوم ہُوا ہے کہ نوروز علی خاں کی رسم وراہ نئے بادشاہ [واجد علی شاہ] سے متوفی بادشاہ [امجد علی شاہ کی نسبت] زیادہ ہے۔ (نوروز علی خاں نے) مجھے لکھا ہے کہ مَیں طلب نامہ جلد ہی بھجوا دوں گا۔[53]

OOO

مَیں فقیری میں غنی اور تہی دستی میں دولت مند ہوں۔ مَیں شاہ و شاہزادوں کی خوشامد گوئی نہیں کرتا،[54] [لیکن] حضرت مولوی معنوی سید رجب علی خاں بہادُر یکتائے روزگار سخاوت و انسانیت میں خدا تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ [ان] کا مسلک حیدر پرستی اور حیدر ستائی ہے۔ مَیں علی ابن طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کا غلام ہوں اور جس کسی کے متعلق سنتا ہوں کہ اُن کا غلام ہے تو اس کو اپنا آقا تصور کرتا ہوں اور اپنے جسم کو اُس کی بندگی کے حوالے کر دیتا ہوں۔[55]

OOO

وہ روشِ ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کروں۔ میرے قصیدے دیکھے جا سکتے ہیں، تشبیب کے شعر بہت اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفی خاں کے تذکرے کی تقریظ، اُن کی مدح کتنی ہے؟ مرزا رحیم الدین بہادُر حیا کے دیوان کے دیباچے [کو دیکھا جا سکتا ہے]۔ جو تقریظ دیوانِ حافظ کی، بموجب فرمائش جان جاکوب بہادُر کے لکھی ہے، فقط ایک بیت میں اُن کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی نثر میں اَور ہی اَور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ، اگر کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی [تفتہ کی] مدح کی ہے۔ [ان کی] خاطر کی اور ایک فقرہ [ان کے] نام کا بدل کر، اس کے عوض ایک فقرہ اَور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھٹئی میری روش نہیں۔[56]

---

(52) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 310۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 741 (53) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 319۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 750-751 (54) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 311 ۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 742 (55) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 311۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 742 (56) خلیق انجم 2008ء ⇦

میر افارسی کا دیوان (مطبوعہ 1845ء) دہلی سے مدراس وحیدر آباد تک اور لاہور سے ہرات و شیر از تک پہنچ چکا ہے۔ اس میں [امجد علی] شاہ [والیِ اَودھ] کا مدحیہ قصیدہ دُنیا نے اس کو دیکھا ہے۔ (اَب) اس ننگ کو اپنے اوپر کس طرح جائز کر لوں کہ اس کو کسی دوسرے کے نام پر مشہور کر دوں۔ یہ چاندی، سونا اور لعل و گوہر نہیں کہ میری دسترس میں نہ ہوں، یہ تو اشعار ہیں اور مبدأفیاض سے مجھے اس کے خزانے کے خزانے عطا ہوئے ہیں۔ جیسے ہی کہ [قطب] شاہ کے خط کا جواب مجھے ملا، اُس وقت تک تازہ قصیدہ اور ایک تازہ قطعہ [میکش] تک پہنچ چکا ہو گا۔ [کاش] بادشاہ (اودھ) مجھے اپنے ہاں بلائے کہ صلہ حاصل ہو جائے۔ اس کے بعد اگر شاہ (اودھ) مجھے بلائے گا تو زادِ راہ کے لیے علیحدہ رقم دے گا، ورنہ مَیں اس صورت میں کہ قرض کا بھاری بوجھ نہ ہو، (اس ہی) گوشہ اور توشہ پر کہ جو رکھتا ہوں، قانع ہوں۔ میرا یہ عہد ہے کہ اِن شاء اللّٰہ ماسوا حق کے کچھ نہ کہوں گا، (یعنی) مرتبہ، اقتدار، نمائش اور خود آرائی نہیں چاہتا۔ صرف آرام اور فراغت چاہیے اور بس! اور اس آرام و فراغت کا حصول اس قرض کی ادائیگی پر منحصر ہے اور قرض کی ادائیگی اس رقم سے ہو جائے گی کہ جس کا مَیں شاہِ اودھ سے اپنے صلہ کے طور پر امیدوار ہوں۔[57]

❍❍❍

[منشی نبی بخش اکبر آبادی] نے مجھ سے غزل طلب کی ہے۔ [لیکن کیسے بتاؤں] کہ دِل ٹھکانے ہوتا ہے تو زبان بھی زمزمہ سنج ہوتی ہے۔ اَب تو دِل اتنا بجھ گیا ہے، گویا مر گیا؛ تو جوش کہاں سے آئے، جو لبوں کو جنبش ہو۔ [شاید انھیں بھی معلوم ہو کہ] انھی حکام کے ہاتھوں، جو مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے، مجھ پر کیا بیتی۔ شاعری کی طرف دِل کیا مائل ہو اور کیا بادپیمائی کروں۔ آلامِ جسمانی بھی اگرچہ بہت ہیں، لیکن اندوہِ رُوحانی اُن سے کہیں بڑھ گئے، جو دِل و جگر دونوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ أُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ اِنْ اللّٰه بَصِیْرٌ بِالْعِبَاد۔[58]

❍❍❍

[نواب] محمد علی شاہ کے دَورِ فرماں روائی میں مجھے کوئی وسیلہ میسر نہیں آیا اور حضرت امجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں ناسازگاریِ وقت کے سبب جو کچھ مجھ پر گزرا، [میکش] اس سے واقف

⇦ ص236-237 (57) پرتو روہیلہ 2015ء، ص265۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص693- 694 (58) پرتو روہیلہ 2015ء، ص853۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص945-946

ہیں۔ فی الوقت مَیں یہ سوچتا ہوں کہ اگر نواب صاحب والاصفات رفیع الشان قطب الدولہ نواب قطب علی خاں بہادُر دام اقبالہٗ میری سرپرستی فرمائیں (تو) مَیں قصیدہ برخوردار میر احمد حسین کو بھیج دوں۔ [خواہش ہے] کہ وہ سعادت منداس کو پہلے تو [نامی شاہ] کی نظر کیمیا سے گزرانے اور اس کے بعد خدمتِ عالیہ جناب نواب صاحب میں پہنچا دے اور (پھر) نواب صاحب پسندیدہ طریقے سے اس بادشاہ [واجد علی شاہ] کے سامنے پیش کر دیں اور میری مدح گوئی اور سخنوری کا احوال اور فردوس منزل (نصیر الدین حیدر کی نوازش و بخشش کی کیفیت) سپہر بار گاہ بادشاہ کے حضور میں پہنچا دیں۔ اگر قسمت یاوری نہ کرے اور صلہ بادشاہ کے مرتبے اور استعداد (عالی) کے مطابق نہ بھی ہو تو اُسی قدر بخشش پر کہ فردوس منزل کے عہد سے معمول ہے، قناعت کر لوں گا۔[59]

OOO

[نومبر 1848ء میں] قطب الدولہ (قطب علی خاں) کے نام خط بھیج رہا ہوں، جس کے ساتھ ستائیس اشعار پر مشتمل ایک قطعہ بھی ہے۔[60]

OOO

جی چاہتا تھا کہ خط اور قطعے کے پڑھے جانے کے وقت جو کچھ بھی اُس محفل میں ہُوا ہو اور ممدوح [شاہِ اودھ، واجد علی شاہ] اور اس کے مقربین کی زبان پر جو کچھ بھی آیا ہو، [میکش] وہ لکھتے، لیکن افسوس کہ [انھوں] نے نہیں لکھا، بلکہ اپنی طرف سے بھی (کچھ) نہیں لکھا۔[61]

OOO

قصیدہ کہنے کا ارادہ ہے اور کہنا شروع (بھی) کر دیا ہے۔ تین دِن سے بخار کی آگ میں جل رہا ہوں اور اس پریشانی نے فکرِ سخن سے روک رکھا ہے۔[62]

OOO

حسرت رہی کہ آیا ممدوح لطفِ کلام تک بھی پہنچا (یا نہیں) اور قطعے کو کہ جس میں مدح کے علاوہ ایک حصہ گزارشِ مدعا کا بھی تھا، کن الفاظ میں سراہا؟ افسوس دُنیا میں کوئی سخن فہم نہیں۔[63]

---

(59) پرتوروہیلہ 2015ء، ص339-340۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص771-772 **(60)** پرتوروہیلہ 2015ء ص266۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص694 **(61)** پرتوروہیلہ 2015ء، ص266۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص695 **(62)** پرتوروہیلہ 2015ء ص270 فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص698-699 **(63)** پرتوروہیلہ 2015ء، ص270۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص699

○○○

[22/ دسمبر 1848ء کو بھیجا گیا] قصیدہ [میر احمد حسین میکش تک] پہنچ رہا ہے، [خواہش یہ ہے کہ وہ] نواب صاحب [قطب الدولہ] کو پہنچا دیں اور اس امر کی کوشش کریں کہ بادشاہ (واجد علی شاہ) کی نظر سے گزرے اور صلہ حاصل ہو۔ مجھے یقین ہے کہ [میکش کی] حسن تدبیر اور نواب صاحب کی عنایت سے بادشاہ تک پہنچ جائے گا۔[64] خدا کی قسم، میری آخری عمر ہے اور مَیں سخت عاجز اور پریشان ہوں۔ اس معاملے میں تھوڑی امید بندھی ہے۔ [اگر] شاہِ اودھ کی جانب سے مجھے صلہ مل جائے تو میری جس قدر عمر بھی کہ باقی ہے، [میکش کے] احسان کے سایے تلے گزرے گی۔ اس وقت اس قرض سے کہ جس کا بوجھ میرے لیے ہوش فرسا ہے، سخت بیزار ہوں۔ جب یہ بھاری بوجھ کاندھوں سے گر جائے گا تو انگریزی پنشن پر قناعت کروں گا۔ نانِ خشک پر قناعت کر کے زندگیِ مستعار (کے باقی لمحے) گزاروں گا اور آئندہ قرض نہیں لوں گا، بلکہ اگر توفیق (الٰہی) شاملِ حال رہی اور زادِ راہ میں سے کچھ بچ گیا تو کعبے اور مدینے اور نجف کا عزم کروں گا۔[65]

○○○

مجھے کہ بندۂ مرتضیٰ علی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوں، جب اُن کی اَولاد کی ایک منتخب ہستی [مولانا سید رجب علی خاں کی طرف] سے کوئی سوغات [لنگی] ملے تو اپنے اوپر کیوں ناز نہ کروں۔[66] بہار دار چادر کہ جس پر سبز، سرخ رنگوں اور سنہرے کنارے کا ایک سبزہ زار ہے، جس کے سامنے چاروں طرف ارغوانی بیل بوٹے بنے ہیں اور اس کے گرد اگرد آفتابِ جہاں تاب کی کرنیں اور جَو نما (بوٹے) سر تا سر کڑھے ہیں۔[67] مجھے لنگی اس لیے چاہیے [تھی] کہ سر پر باندھوں اور سر پر باندھ کر گھوموں پھروں۔ مَیں (عام) دہلویوں کی طرح (لنگی) کاندھے پر نہیں ڈالتا۔[68] یہ بادشاہوں کی وہ خلعت نہیں ہے کہ آزاد منش لوگ جس کی پروانہ کریں اور صاحبِ عقل جس کو باعثِ افتخار نہ جانیں، (بلکہ) یہ تو خانۂ اہلِ عبا کی خلعت کے سبب وہ عزت افزائی ہے کہ جس سے ظاہری قدر

(**64**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص273-274۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص702-703 (**65**) پرتو روہیلہ 2015ء ص276۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص705 (**66**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص316۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص748 (**67**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص285۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص716 (**68**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 316۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص747

افزائی بھی ہوتی ہے اور باطنی سرخروئی بھی۔ (اس کے سبب) بیرونی خوشحالی بھی ہے اور اندرونی تازگی بھی۔ چونکہ مجھ سے صبر ممکن نہ تھا اور فوراً آدمی کو بازار بھیج کر سبز ریشم منگوایا اور ہدایت کی فوراً دونوں ٹکڑوں کو جوڑ کر سی دیں۔ (ملازمین بازار) گئے، (ریشم) لائے، (چادریں) سییں، (ان کو) تہہ کیا اور مجھے دے دیں۔ مَیں نے آئینہ سامنے رکھ کر دستار باندھی۔[69]

OOO

جس دِن سے [میر احمد حسین میکش] نے لکھنؤ میں قیام اختیار کیا، طرح طرح کی خواہشات (دل میں) رکھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میر احمد حسین کو، جو میرے لیے میرے بیٹے کی حیثیت رکھتا ہے اور خوش بختی کی پیشانی رکھتا ہے، مگر وارہ ری میری تقدیر کہ وہ ہنگامۂ خیال درہم برہم ہو گیا اور وہ ساری امیدواری مایوسی میں تبدیل ہو گئی۔[70] بادشاہ کی بیماری نے (اِس) فقیر کا دِل دُکھا دیا [اور] قصیدے کے لیے وہ ذوق و شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ اَب آئندہ کیا پیش آتا ہے اور بالآخر ہوتا کیا ہے؟ میری بدبختی کو سعی و کوشش سے اچھا نہیں کیا جاسکتا۔ مَیں اپنی بدقسمتی کو اچھی طرح پہچانتا ہوں اور تقریباً ترپن سال سے شومئ قسمت کا تماشائی ہوں،[71] [لیکن میر احمد حسین میکش کا] فرطِ محبت سے جی نہیں چاہتا [ہو گا] کہ مجھے ناامیدی کی خبر [ہو۔ شاید انھیں] معلوم نہیں کہ بلا، خوفِ بلا سے بہتر ہے۔ مَیں غمزدہ تو محرومِ ازل ہوں اور مَیں ناامیدی کا خوگر ہو گیا ہوں، مقصد کے فوت ہو جانے پر اتنا غمزدہ نہیں ہوتا کہ بات ہلاکت تک پہنچ جائے۔[72]

OOO

مَیں شعر کہتا ہوں، فکرِ شعر کرتا ہوں، لیکن جب تک مَیں نے اس برگزیدہ شخص [منشی نبی بخش حقیر] کو نہیں دیکھا، یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ سخن فہمی کیا ہے اور سخن فہم کسے کہتے ہیں۔ مَیں نے انسانوں میں دیکھا ہے کہ خداوند ہستی نے حسن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک حصہ یوسُفِ کنعان کو دیا اور باقی نصف سارے اہلِ جہاں کو؛ کیا تعجب ہے کہ فہم سخن اور ذوقِ معنی کو بھی اسی طرح دو حصوں میں بانٹ دیا ہو۔ اس کا ایک حصہ تو اس ستودہ صفات شخص کو بخشا گیا اور

(**69**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص 285-286۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص716 (**70**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص 271 فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص700 (**71**) پرتوروہیلہ 2015ء ص269۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص697-698 (**72**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص268۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص697

باقی دوسرا حصہ دُنیا جہاں کے لوگوں میں تقسیم ہُوا۔ اَب چاہے، آسمان میرے کامِ دل کے مطابق گردش نہ کرے اور میری سوئی ہوئی قسمت اپنے خوابِ گراں سے کبھی سر نہ اٹھائے، مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ مَیں اس مخلص دوست کی ہمدمی کے ساتھ زمانہ کی دشمنی کے خیال کو خاطر میں نہیں لاؤں گا اور مَیں نے دُنیا اور اہلِ دُنیا میں سے اس دولت پر قناعت کر لی ہے۔[73]

OOO

[ملتان میں انگریزوں کی فتح کے بعد سکھ] مفسدوں کا ہنگامہ ختم ہُوا اور خلقِ خدا کو نصرت نصیب ہوئی۔ جو خار و خس باقی ہے، جلد ہی صاف ہو جائے گا اور ملک پاک و صاف ہو جائے گا۔[74]

OOO

[11/ جنوری 1849ء کے دِن] شہزادہ دارا بخت ولی عہد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اَب شاہِ دہلی چاہتے ہیں کہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے [مرزا جواں بخت] کو، جو صمصام الدولہ احمد قلی خاں کی بیٹی زینت محل بیگم کے بطن سے ہے، ولی عہد بنا دیں۔ فتح الملک عرف مرزا فخرو اس دلیل پر کہ وہ بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا ہے، خود ولی عہدی کا دعویدار ہے۔ ابھی تک اس معاملے کا فیصلہ نہیں ہُوا ہے اور خصوصاً اس ضمن میں گورنمنٹ کی طرف سے کوئی فرمان نہیں پہنچا۔[75]

OOO

[چاہتا ہوں کہ] جیسے ہی ملتان کا راستہ کھلے اور (ملتانی) لنگیاں لاہور آنا شروع ہوں، ایک لنگی کہ جس کے تانے بانے میں ہرگز کوئی ریشمی یا زرّیں تار نہ ہو اور ساری کی ساری رلسیمان کی بنی ہو، [منشی جواہر سنگھ] میرے لیے خرید کر بھیج دیں، لیکن کنارے اطراف میں کالے اور اودے ہوں اور باریک دھاریاں بھی سیاہ اودی اور زرد ہونی چاہئیں۔ باریک، نرم اور ہلکا ہونا چاہیے، ایسا کہ پیروں اور قلندروں کو زیب دے، لیکن ایسی جلدی بھی نہیں۔ فی الحال میرے پاس مولانا (رجب علی) کی عطا کردہ لنگیوں میں سے ایک اور کالے صاحب کی عطا کردہ (دو لنگیاں) ہیں، جنھیں سر پر باندھتا ہوں اور مولانا کی دو لنگیوں میں سے ایک سنہری لنگی مَیں نے حرم سرا میں دے دی ہے۔[76]

(**73**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 249-250۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 679 (**74**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 314۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 745 (**75**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 314۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 745-746 (**76**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 315۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 746

بادشاہ[واجد علی شاہ] دیوانہ، سلطنت درہم برہم، معاملات تباہ؛ اگر ولی عہد (محمد جاوید علی بہادُر شہزادۂ دوم) نہ بھی مرتا، کام پھر بھی نہیں بنتا۔ کوئی دیوانے کے پاس قصیدہ کس طرح لے جائے اور (پھر) اس سے کیا کہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ مان لیا کہ یہ بھی ہو گیا اور قصیدہ اس کے سامنے پیش بھی کر دیا گیا اور اس کو پڑھنا (بھی) شروع کر دیا گیا (اور) اس نے ہنسنا اور سر مٹکانا شروع کر دیا اور پڑھنے والے کے ہاتھ سے کاغذ لے کے دانتوں میں چبایا اور زمین پر پھینک دیا؛ یا سنا، لیکن دوسرے کسی کام کی طرف متوجہ ہو گیا اور سائل کے مقصد کی بابت کوئی بات نہیں کی (تو کیا فائدہ ہُوا) اور (اگر) مان لیں، 'جنون میں بڑے گن ہیں' کی حکیمانہ ضرب المثل کے مصداق خلعت بھیجنے یا ہزار اشرفیاں دینے کا حکم دے دیا (تو ان حالات میں) اس کا حکم کون پہنچائے گا، خلعت کون بھیجے گا، رقم کون دے گا اور حکومت کے اہلکار دیوانے کے حکم پر (بھلا) رقم کیوں دینے لگے اور خلعت کیوں بھیجنے لگے۔ اگر بادشاہ دیوانہ ہے تو وزیر (مدار الدولہ علی نقی خاں بہادُر) تو دیوانہ نہیں۔ مختصر یہ کہ فریب کاریِ تقدیر سے عاجز ہوں۔ ان توقعات سے مَیں نے (یکسر) قطع نظر کر لیا ہے اور اَب [5/ جولائی 1849ء] کسی امید کا کوئی شائبہ بھی باقی نہیں رہا ہے، (البتہ) [میکش کی] طرف سے فکر مند ہوں اور قطب الدولہ کے لیے بھی غمگین ہوں۔[77]

OOO

[اگست 1849ء میں نواب علی بہادُر کو حاکم باندہ ہونے پر]

غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمند ناز　　دیکھوں علی بہادُرِ عالی گہر کو مَیں[78]

نواب معلی القاب [نواب علی بہادُر] نے مسند دولت [باندہ] کی اپنے مبارک وجود سے رونق بڑھائی ہے، چونکہ مَیں اس خاندان کا رُوشناس ہوں اور اگر فروتنی اختیار نہ کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ مَیں یگانوں میں سے ہوں اور مجھے چاہیے تھا کہ مَیں نامۂ تہنیت لکھتا، مجھ سے وہ نہیں ہُوا۔ خدا جانتا ہے کہ یہ ناموافقت ولا پرواہی کی وجہ سے نہیں ہُوا، بلکہ مَیں نے اپنے آپ کو ناچیز تصور کیا اور بزمِ انس کے ندیموں کے لیے بارِ خاطر ہونا رَوا نہیں رکھا۔ اَب کہ بحرِ عطوفت موجزن ہُوا اور اتنے بہت سے بیش بہا موتی میری گود میں ڈال دیے، حیرت میں ہوں کہ مَیں اپنی کم ہمتی کے عذر

---

(77) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 267-268۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 696 (78) غالب 1996ء، ص 301

میں درِ سخن وا کروں یا پھر اس خداوندِ مہر و محبت کے ان ہاتھوں کی سپاس گزاری کروں، جو دُور دستوں کو اپنی بخشش و عطا کی ثمر فشانیوں سے نوازتے ہیں۔ انھوں نے دِل سے غبارِ الم کو بھی دُور کیا، میرا دِل مجھ سے چھین لیا، غم واندو کو گھٹا دیا اور امیدوں کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔[79]

OOO

ایک طویل مدت گزری کہ قصیدہ اور عرضداشت [قطب الدولہ نواب قطب الدین خاں بہادُر] کی خدمتِ عالی میں روانہ کی تھی، لیکن [میری] ناسازیِ قسمت پر افسوس ہوتا ہے کہ اس بہار کا کوئی رنگ تاحال دِکھائی نہ دیا۔ [غالباً نواب قطب الدین] نے اس زخمی دِل درویش کی طرف توجہ نہیں دی اور قصیدہ و عرضداشت کو سلطان کی نگاہِ التفات سے رُوشناس نہیں کرایا۔ وقت گزر رہا ہے، قافلہ [نجف] روانہ ہو رہا ہے۔ فقیر کے ساتھی سفر کے لیے کمربستہ اور روانگی کے لیے عجلت میں ہیں اور مَیں [6/ اکتوبر 1849ء] اُسی طرح تہی دستی اور بے نوائی کی بناپر پابہ گِل (ہوں)۔[80]

OOO

سخت غمزدہ اور ملول رہتا ہوں۔ مجھ کو اَب [10/ جنوری 1850ء] اس شہر کی اقامت ناگوار ہے اور موانع و عوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا۔ خلاصہ میرے رنج والم کا یہ ہے کہ مَیں اَب صرف مرنے کی توقع پر جیتا ہوں۔ ہیہات:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　　نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے[81]

ایک مدت سے میرا پاؤں پھل رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دانے بطریق دائرہ کف پا کے محیط تھے۔ ناگاہ ایک دانہ اُن دانوں میں سے بڑھ گیا اور پک گیا اور پھوڑا ہو گیا اور وہ قریب ٹخنے کی ہڈی کے تھا۔ بادشاہ کے ساتھ عید گاہ نہ جا سکا۔ دوسرے دِن لنگ لنگاں قلعے گیا اور عید کی نذر دی۔ آخر کار تپ چڑھی اور صُداعِ شدید عارض ہُوا۔ وہ پھوڑا پکا اور پھوٹا۔ کھولن، سوزش، دس بارہ دِن برابر یہ حال رہا۔ مرہم لگائے گئے، آخر کار پھوڑا پھوٹا۔ اُس میں سے مادۂ منجمد، جس کو کیل کہتے ہیں، وہ نکلا۔ دو انگل کا زخم پڑ گیا، اَب وہ زخم بھر گیا ہے، دو ہفتوں میں اچھا ہو جائے گا۔ تپ، جو عارضی تھی، جاتی رہی؛ مگر صُداع شاید مادّی اور بجائے خود ایک مرضِ حقیقی تھا کہ ہنوز باقی ہے۔[82]

(**79**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 268۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 721 (**80**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 341 فارسی متن: ص 773 (**81**) خلیق انجم 1990ء، ص 1090 (**82**) خلیق انجم 1990ء، ص 1091

کل کی گرمی میں، جس سے رَگوں میں خون جل رہا تھا اور ہڈیوں میں مغز پگھلا جاتا تھا، پیاس تھی کہ سمندر نے جب تک اپنے تئیں آگ سے نکال کر پانی میں نہ ڈال دیا ہو گا، چین نہ پایا ہو گا۔ چونکہ میری عادت ہے کہ ایک ایک گھونٹ پانی پیتا رہتا ہوں، [شیفتہ] کو ہر وقت یاد کرتا رہا۔ پیاس سے دِل اگر ایک بار تڑپا تو [ان] کی یاد سے سو بار تلملایا۔[83]

❑❑❑

(**83**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص849۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص941

(6)

غالب وظیفہ خوار

(1850ء-1857ء)

[جمعرات 4/ جولائی 1850ء] کہ بھی روزِ سعد اکبر ہے، مجھے شہنشاہ کے دربار میں بلایا اور خلعت و خطاب و فرمان سے سر فراز کیا۔ کل [اگر] کوتوالِ شہر نے مجھے 'بدمعاش' اور 'سرغنہ' لکھا تھا تو میرا کچھ نہ گھٹا تھا؛ آج بادشاہِ دہلی نے 'نجم الدولہ'، [نظام جنگ] اور 'دبیر الملک' کا خطاب دیا ہے تو کچھ بڑھ نہیں گیا۔ اَب فرواے قیامت میں دیکھنا ہے کہ مجھے کیا لکھا جاتا ہے، کس نام سے پکارا جاتا ہے اور وہاں میری کیا ارزش ہوتی ہے۔[1]

غالب! وظیفہ خوار ہو ، دو شاہ کو دعا
وہ دِن گئے کہ کہتے تھے ، 'نوکر نہیں ہوں مَیں'[2]

[15/ جولائی 1850ء کو **اسعد الاخبار** دہلی میں خبر شائع ہوئی کہ] اِن دِنوں شاہِ دیں پناہ نے جنابِ معلّٰی القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب بفرطِ عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتابِ تواریخ کے لکھنے پر، جو تیموریہ کے زمانے سے سلطنتِ حال تک ہو، مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواعِ پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادُر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور متین عبارت میں لکھی جائے گی کہ ہر ایک اس کے لطفِ عبارت سے فیض یاب ہو گا۔[3]

---

(1) پرتورہیلہ 2015ء، ص 851۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص 943 (2) غالب 1996ء، ص 302 (3) بحوالہ بدر شکیب (1952ء)، ص 268-269

OOO

اس گوشہ نشینی کے باوجود، بادشاہ (بہادُر شاہ ظفر) نے اپنے اجداد کی تاریخِ فرمانروائی لکھنے پر [مجھے] مامور کیا۔ مَیں نے دِل میں کہا، 'ہاں غالبِ آشفتہ سر! سخنوری کی آبرو رکھنا اور ہر چند کہ داستان سرائی آزاد منشوں کا طور طریق نہیں ہے، طعنہ زنوں کو زبان درازی کا موقع نہ دینا'۔[4]

تاریخ سلاطین تیموری (**مہر نیم روز**) محض کتاب کا لکھنا نہیں ہے، یہ جگر خوں کرنا اور لہو چھاننا ہے۔ سست قلم ہوں، بیمار ہوں، بے حوصلہ و بے دِماغ ہوں۔ دیر میں لکھتا ہوں، تھوڑا تھوڑا لکھتا ہوں، کبھی کبھی لکھتا ہوں۔[5] غم سے اجیرن اور زندگی سے بیزار ہوں، [چنانچہ] یہ کام بہت ہی بے دِلی اور افسردگی کے ساتھ کر رہا ہوں؛ گویا توسنِ قلم کی باگیں میرے قبضے میں نہیں ہیں، وہ خود جدھر اور جیسے چاہتا ہے، چلتا رہتا ہے۔[6] تین ماہ سے (اس کام میں) میرا قلم دِن رات متحرک ہے۔ تاریخی کتابوں اور اسلاف کے سوانح کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور منتشر اَوراق کے دفتر کے دفتر ہر جگہ پڑے ہیں۔ تاریخ کے گزشتہ واقعات میں انتخاب کر کے ان کو ترتیب سے لکھنا اور پھر اس مسودے سے دو مسودے تیار کرنا؛ ایک کو آقاے گرامی کو ارسال کرنا اور دوسرا اپنے پاس محفوظ رکھنا اور یہ سارے تن تنہا کرنا! ان سارے کاموں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔[7] دو تین دِن ہوئے کہ امیر تیمور گورگان کی رُوداد لکھ کر نمٹا ہوں۔ اَب دو ہفتے تک آرام کروں گا، پھر ذرا دَم لے کر بابر بادشاہ کا حال لکھا جائے گا۔ بخدا اس نثر میں نظم سے کچھ زیادہ ہی جاں گداز کاوش کرنا پڑتی ہے۔ عید کے دِن مولانا کی قدم بوسی نصیب ہوئی، انھوں نے نوازش فرمائی اور نثر کی تعریف کی۔ [چاہتا ہوں کہ] جو کچھ مَیں نے لکھا ہے، وہ [نواب مصطفی خاں شیفتہ] تک پہنچ جائے اور آگے جو کچھ لکھتا رہوں، وہ ایک ایک کر کے [ان] کی نظر سے گزرتا رہے۔[8]

OOO

(**4**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 334۔ فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص 764 (**5**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 313۔ فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص 744 (**6**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 851۔ فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص 942 (**7**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 869۔ فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص 961 (**8**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 851۔ فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص 944

حضرت ظہیر الدین بابر و جناب نصیر الدین ہمایوں کے حالات، اسلاف کی روایت کے بموجب لکھے جا چکے ہیں اور سارے (عنوانات) آٹھ جزو کاغذ میں سمائے ہیں اور حسینانِ معنی کا دِلکش مرقع ہیں۔ اَب اکبر بادشاہ کی اکیاون سالہ حکومت کے حالات لکھنے ہیں۔ ان دنوں یہ جنون سوار تھا کہ رات دِن اس کتاب (**پرتوستان**) کی تحریر میں اور اس کے اسلوبِ تحریر میں منہمک تھا اور تمام قویٰ کتاب کی ترتیب پر کہ حمد و نعت و مدح سے عبارت ہے، مرکوز تھے۔[9]

OOO

جانی بانکے لال کو مَیں نے جوزف جارج کے گھر کہ میرا پرانا دوست ہے، دیکھا ہے اور پہلی ملاقات ہی میں رُوشناسی محبت تک پہنچ گئی (اور) آج تک وہ حسنِ صورت، حسنِ خصلت و حسنِ گفتار ذہن سے محو نہیں ہوئی، اس شفقت کے سبب کہ جو انھوں نے [تفتہ] سے کی ہے اور [تفتہ کی] قدر شناسی کے سبب انھوں نے مجھے اپنا ممنون و احسان مند بنالیا ہے۔ وہ برہمن ہیں اور دانشور (بھی) اور مَیں ہر فرقے کے بزرگ زادوں اور ہر جماعت کے اہلِ دانش کو عزیز رکھتا ہوں۔[10]

حکیم وارث علی خاں، غالبِ آوارہ و بے نام و نشاں کے لیے حقیقی بھائی کی طرح ہے اور جان کے برابر، بلکہ جان سے بھی زیادہ عزیز۔ ہم نے ایک ہی استاد سے کسبِ فیض کیا ہے اور ایک ہی مدرسے سے سبق پڑھا ہے۔ اگر ہزار سال بھی گزر جائیں اور ہماری ایک دوسرے سے ملاقات نہ ہو اور باہم خط کتابت بھی نہ کریں، (پھر بھی) بیگانگی، فراموش اور دِل محبت سے لبریز ہو گا۔[11]

نواب محمد حسین خاں بہادُر، جو جرنیل صاحب [کے نام] سے معروف ہیں، ڈاک سے اس شہر (دہلی) میں آئے ہیں اور چونکہ اپنے پیر و مرشد (غلام نصیر الدین) کالے صاحب سے ملاقات کے لیے آئے، مجھے بھی اپنے دیدار سے شادمان کیا۔ چونکہ چھاؤنی میں قیام پذیر تھے اور راستہ طویل تھا اور مَیں بیمار (تھا، اس لیے) اس مبارک خاندان سے دو بار سے زائد ملاقات نصیب نہ ہو پائی اور ان کے ساتھ بات چیت کرنے اور ان کے ساتھ بیٹھنے کی حسرت دِل (ہی) میں رہ گئی۔[12]

OOO

---

(9) پرتو روہیلہ 2015ء، ص334۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص765-766 (10) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 254۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص682 (11) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 254۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص682 (12) پرتو روہیلہ 2015ء، ص254۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص682

سچ کہتا ہوں کہ مَیں فنِ تاریخ و معما سے بیگانہ ہوں۔ دیوان میں جو تاریخیں ہیں، بیشتر مادّے اَوروں کے اور قطعے فقیر کے ہیں، کبھی کوئی مادّہ بھی عامیانہ کہہ دیا ہو گا۔ ہاں، حضرت مبدا اَفیاض نے گنجینہ معنی سے بہت کچھ دیا، مَیں نے سراسر قصیدہ و غزل و مثنوی و رباعی میں صَرف کیا۔[13]

○○○

[منشی نبی بخش حقیر کی طرف سے] منجن پہنچا۔ درد سے مر رہا تھا، واللہ بے تکلف کہتا ہوں، مَیں نے اس پچپن برس کی عمر میں ایسی سریع التاثیر دوا نہیں دیکھی۔ ایک بار کے لگانے سے درد تو فوراً جاتا رہا، صبح کو ورم بالکل نہ تھا، داڑھ کے درد کی اکسیر ہے؛ لیکن باوجود اس کے تکلیف نہ گئی، یہ درد از قسم اوجاعِ نزلہ و رطوبت نہیں۔ داڑھ گرنے کو ہے، جگہ چھوڑ دی ہے، اوپر کو اُٹھ آئی ہے؛ ہنوز کچھ علاقہ مسوڑھے سے باقی ہے، جب وہ علاقہ جا چکے اور داڑھ گر چکے، تب فرصت ہو۔ چار داڑھیں گر چکی ہیں، یہ پانچویں گرا چاہتی ہے۔ چونکہ ہے انتہا میں، اس کو اُکھڑوا نہیں سکتا۔ پاؤں اَب اچھا ہے، زخم تھوڑا سا باقی رہا ہے، زحمت و تکلیف و رنج و آشوب نہیں ہے۔[14]

○○○

بابر بادشاہ کا حال تمام لکھ چکا ہوں۔ اَب چھ مہینے پورے ہو چکے، جولائی سے دسمبر 1850ء تک۔ اگر آئندہ ماہ بہ ماہ کر دیں گے تو مَیں لکھوں گا، ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے۔ ابھی بابر کا حال حضور میں نہیں بھیجا، اَب صاف کر کر دے دوں گا اور ماہ بہ ماہ کی استدعا کروں گا۔[15]

○○○

اِن دِنوں حضور والا [بہادُر شاہ ظفر] حضرت خواجہ صاحب [قطب الدین بختیار کاکیؒ] کی بارگاہ گئے ہوئے تھے اور احقر العباد [غالب] بھی ساتھ گیا تھا۔ چار دِن ہوئے کہ مَیں درگاہ سے شہر میں آیا۔ مجھ کو بسبب فصلِ بہار کے ہیجانِ خون ہے۔ احتراق کے شدائد بہ نسبت اَور دِنوں کے زیادہ ہیں۔ لازم یوں تھا کہ شاہترہ پیتا اور مسہل لیتا، مگر کچھ نہ کر سکا، صرف فصد باسلیق پر قناعت کی اور آدھ سیر خون لے لیا۔ اَب آئندہ جو ہو، سو ہو۔[16]

○○○

---

(13) خلیق انجم 1990ء، ص 822 (14) خلیق انجم 1989ء، ص 1093 (15) خلیق انجم 1989ء، ص 1094
(16) خلیق انجم 1989ء، ص 1094-1095

منشی [نبی بخش حقیر] چاہتے ہیں کہ [غالب] کول [علی گڑھ] آوے۔ مَیں نے کہا، 'یہ دِن جانے کے نہیں، اگر خدا چاہے گا تو انبہ کے موسم میں کول اور مارہرے جاؤں گا'۔[17]

○○○

امیر تیمور، چار پشتیں بعد ان کے بابر تک ایسی گزریں کہ جس میں کشور کشائی و لشکر کشی نہیں ہوئی۔ بابر، ہمایوں، تین بادشاہِ اولوالعزم کا حال ببسبیلِ اجمال لکھ چکا ہوں۔ نوروز کا ہنگامہ تھا اور قصیدے کی فکر تھی، اس واسطے ابھی نثر کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور ابھی دو چار دِن دَم لے لوں تو اَب پھر سر گرمِ کار ہو کر اکبر بادشاہ کا حال لکھنا شروع کروں۔[18]

○○○

جب [بہادُر شاہ ظفر کے] حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں، سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں، نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ آج دوپہر کو ایک غزل [کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے] لکھی ہے، کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا۔[19]

○○○

[زین العابدین کو] ناگاہ رُعاف ہُوا۔ رُعاف میں ناک سے لہو آتا ہے، مگر اس کو مُنھ سے لہو آیا۔ ناک سے تھوڑا تھوڑا اور مُنھ کا کیا حال تھا، گویا مشک کا دہانہ کھول دیا ہے۔ ایک ہفتے میں، خدا جھوٹ نہ بلوائے، آٹھ دس سیر خون نکلا، سیاہ اور بدبودار۔ توقع جینے کی باقی نہ رہی اور سب ناامید ہو گئے۔ بارے خدا نے بچا لیا، بچ گیا۔ [وہ] تھا [ہی] کیا، استخوان و پوست رکھتا تھا، اَب سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ اگرچہ ہنوز صاحبِ فراش ہے اور چلنا پھرنا تو کہاں، پلنگ پر سے اُٹھ بھی نہیں سکتا، مگر بیم ہلاک نہیں ہے۔ اس کی بی بی تین مہینے سے تپ اور کھانسی میں گرفتار ہے۔ خدا اس پر اور اس کے بچوں پر رحم کرے اور اس کو بچالے۔ مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر یوں کہ اگر بچ جائے تو گویا مردہ جیا۔[20]

○○○

زین العابدین خاں اچھا ہے، بی بی بھی اس کی [تپ اور کھانسی سے] فرصت پاتی چلی ہے۔ مرض کی صورت خطرناک نہیں رہی، خدا چاہے تو صحت ہو جائے۔[21]

○○○

---

(17) خلیق انجم 1989ء، ص1096 **(18)** خلیق انجم 1989ء، ص1096-1097 **(19)** خلیق انجم 1989ء، ص1098 **(20)** خلیق انجم 1989ء، ص1100-1101 **(21)** خلیق انجم 1989ء، ص1102

تقریبِ عید قریب آگئی تھی، قصیدے کی فکر میں سر گراں تھا؛ بارے عید ہو چکی، قصیدہ پڑھ چکا، تہتر شعر ہیں،[22] [البتہ] اکبر بادشاہ کا احوال شروع بھی نہیں ہُوا، مجھ سے یہ دردِ سر ہو ہی نہیں سکتا۔ بس، یہ اتنا ہی رہا۔[23]

OOO

اخبار میں اکبر آباد اور عظیم آباد کی وبا کی دھوم سنی جاتی ہے۔ حق تعالیٰ اپنے سب بندوں کو امن و امان میں رکھے۔ [دلّی] شہر میں امن ہے، مگر ہاں، جیسا کہ شروعِ فصل میں تغیر ہو جاتا ہے اور تپ ولرزہ وزکام پھیل جاتا ہے، وہ ہے۔ گرمی بہت پڑتی ہے، دو دِن سے ہَوا سرد ہو گئی ہے۔ ابر آنے لگا ہے، بارش نہیں ہوئی۔ اِن شاء اللّٰہ تعالیٰ، آج کل میں مینہ برسے گا۔[24]

OOO

اُس دریاے فضل و کرم کے کہ جن کا نام نامی بابو جانی بانکے لال ہے، التفات اور مہربانی کا [تفتہ] نے کچھ ذکر کر کے محبت کے پردے میں مجھ پر بہت بڑا ستم رَوا رکھا ہے۔ یہ ساری دوست نوازیاں اور سخت کوشیاں [تفتہ کی] ہی ہیں۔ ہر چند کہ مَیں اس قبیل سے ہوں کہ لین دین میں مجھے کوئی باک نہیں ہوتا؛ نہ لینے میں مجھے شرم ہوئی ہے اور نہ دینے میں (کسی پر) احسان کرتا ہوں، لیکن ناکردہ خدمتوں کا صلہ لینے میں مجھے خجالت کیوں نہ ہو! کاش! بابو صاحب بھی یہ طریقہ میرے ساتھ نہ کریں اور جو کچھ ہو چکا، اس ہی پر اکتفا کریں۔ ان پچپن سال میں میرا اس قسم کا معاملہ کسی سے نہیں پڑا اور اس قسم کے پَے درپَے احسانات مَیں نے کسی کے قبول نہیں کیے۔[25]

OOO

سالِ گزشتہ کے سرِ آغاز میں اس نیاز مند نے حضرت سلطانِ عالم [واجد علی شاہ] کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور ایک عرضداشت نثر میں تحریر کی تھی۔ اس قصیدے اور اس عرضداشت کو قطب الدولہ کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ قطب الدولہ نے شانِ مردمی سے کام لیتے ہوئے اسے سلطانِ دارادربان کی نظر گاہ تک پہنچایا۔ بادشاہ کی طبع والا نے ان کو پسند کیا اور قطب الدولہ کو حکم فرمایا کہ 'کسی دوسرے وقت عرضداشت کو دوبارہ پیش کیا جائے، تاکہ سائل کی امیدوں پر ہم

---

(22) خلیق انجم 1989ء، ص1103-1104 **(23)** خلیق انجم 1989ء، ص1105 **(24)** خلیق انجم 1989ء، ص1104-1105 **(25)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص253۔ فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص681

احسان فرمائیں اور ان کے جائزہ کے واسطے حکم صادر کریں'۔ اس بِنا پر کہ چشم بد گھات میں تھی، ناگاہ وہ محفل درہم برہم ہو گئی اور قطب الدولہ کی جاہ مندی کا سورج ڈوب گیا۔ اس غریب نے عرضداشت اور قصیدہ مجھے واپس کر دیا۔ سر دست ان دونوں اَوراق کو [نواب محمد علی خاں] کی خدمتِ ہمایوں میں روانہ کر رہاہوں۔ خواہش یہ ہے کہ [وہ] اس قصیدے اور عرضداشت کو [واجد علی شاہ کی] نظر گاہِ خاقانی میں لے جائیں اور اس امر کی سعی فرمائیں کہ یہ دونوں اَوراق اسی وقت نظر سلطانی سے گزر جائیں۔[26]

OOO

ہمارا یہ منصب نہیں کہ معترض کو جواب نہ دیں یا سائل سے بات نہ کریں۔ اس سے ہمیں کام نہیں کہ وہ مانیں یا نہ مانیں۔ جو زبان دان ہو گا، وہ سمجھ لے گا؛ غلط فہم و کج اندیش لوگ نہ سمجھیں، نہ سمجھیں؛ ہم کو تمام خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ؟ تعلیم و تلقین واسطے دوستوں کے اور یاروں کے ہے، نہ واسطے اغیار کے۔ خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو۔[27] 'خطاے بزرگاں گرفتن خطاست'، چاہیے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم موردِ اعتراض نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ کریں۔[28]

OOO

بادشاہ [بہادُر شاہ ظفر] نے فرمان جاری کیا [تھا] اور [نظارت جنگ خاں حسین مرزا] ناظر بار گاہ نے سخنوروں کو ایوانِ نظارت میں اس امر کی اطلاع دی [تھی] کہ جمعہ کے دِن ماہِ فروری کی پچیس تاریخ کو اس خجستہ نشیمن میں آئیں اور جامِ سخن سے ایک دوسرے کے ساتھ بادہ پیمائی کریں۔ شہزادگانِ بابریہ کی ایک جماعت اور آزادگانِ شہر میں سے کچھ اشخاص جمع ہوئے، لوگوں کا کچھ ایسا اژدہام ہُوا کہ جگہ تنگ ہو گئی اور لوگ ٹھسا ٹھس بھر گئے۔ سب سے پہلے سلطان الشعرا شیخ ابراہیم ذوق نے حضرت والا [بہادُر شاہ ظفر] کی غزل اس خوش آوازی کے ساتھ پڑھی کہ زُہرہ آسمان سے نیچے اُتر آئی۔ بعد ازاں مرزا خضر سلطان بہادُر نے اس طرح تازہ میں اپنی غزل پیش کی، گویا اپنے اشعارِ گوہر نثار کی صورت میں بساطِ بزم پر ستاروں کی بارش کر دی۔ اس کے بعد مرزا حیدر شکوہ مرزا

---

(26) تنویر احمد علوی 2016ء، ص256-257۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص613-614 **(27)** خلیق انجم 2008ء، ص240 **(28)** خلیق انجم 2008ء، ص243-244

نور الدین اور مرزا عالی بخت [عالی] نے سازِ سخن چھیڑا اور نغماتِ شعر کو بلند آہنگ کیا۔ غالب آشفتہ نوا نے اپنی طرف سے دس شعر اس بزمِ سخن میں پیش کیے،[29] [غزل کا مطلع درج ذیل ہے]:

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے[30]

محوی نام ایک امرد نے کہ خم کدہ صہبائی کے مے نوشوں میں ہے، اپنی صدائے طفلانہ کے ساتھ اہلِ محفل کو متوجہ کیا۔ مرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعروں پر مشتمل اپنی غزل طرح میں پڑھی اور سامعِ اہلِ انجمن کو اپنا یہ شاعرانہ تحفہ پیش کیا۔ مَیں آب گزاری کا بہانہ کر کے محفل سخن سے باہر آیا اور اپنے غم کدہ کی راہ لی۔ ابھی نصف شب کا وقت گزرا نہیں تھا، مَیں نے بوریاے بے ریائی پر اپنی محفل سجالی، دو چار جام چلے اور بادۂ ناب کی جُرعہ چشی کی۔ بعد صبح پھر ارکِ سلطانی میں گیا۔ چاروں مغل شہزادوں نے زمزمۂ شبانہ کو تازہ کیا۔ مَیں نے بھی دوبارہ غزل پڑھی۔ بعض ہمدموں سے معلوم ہُوا کہ تمام رات ہنگامہ شعر و سخن رہا، صبح ہونے کے قریب محفل برخاست ہوئی۔ کہتے ہیں کہ سلطان الشعرا نے مشاعرہ کے اختتام پر اپنی دو غزلیں پڑھیں، لیکن وہ طرح میں نہ تھیں۔ آج کے بعد اکیس دِن نور روز میں باقی ہیں، دیکھنا ہے کہ میرے عندلیبِ طبع کو کس نوا کے ساتھ آمادۂ زمزمہ سنجی کیا جائے گا۔[31]

OOO

[شہزادہ جواں بخت کی شادی پر لکھا گیا سہرا۔ پہلا اور آخری شعر]

خوش ہو ، اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

ہم سخن فہم ہیں ، غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں ، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا[32]

(**29**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 223 فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 725-726 (**30**) غالب 1996ء، ص 313 (**31**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 223-224۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 726 (**32**) غالب 1996ء، ص 309

[اس سہرے کے مقطع سے شیخ ذوق کو غلط فہمی ہوئی تو انھوں نے بہادُر شاہ سے میری شکایت کی، جس پر مجھے وضاحت کرنا پڑی]:

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رَو ہوں اور مِرا مسلک ہے صلحِ کُل — ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پُرخاش کا خیال — یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
مَیں کون اور ریختہ؟ ہاں اس سے مدعا — جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
رُوے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ — سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں، غالب! خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے[33]

○○○

کالے صاحب کی رحلت کے بعد اس حویلی کے در و دیوار مجھے راس نہیں رہے،[34] وہاں کا میرا رہنا، تخفیفِ کرایہ کے واسطے نہ تھا، صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ [اَب] بَلّی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرایے کو لے کر رہتا ہوں،[35] امید ہے کہ اس سے میری لاش ہی نکلے گی۔[36]

○○○

پیر کا دِن ہے، مارچ [1852ء] کی 22/ تاریخ۔ اس وقت بارش ہو رہی ہے اور بے باک ہَوا چل رہی ہے اور مجھے دِن رات سواے شراب پینے کے اَور کوئی کام نہیں ہے۔[37]

---

(33) غالب 1996ء، ص309 **(34)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص255۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص684 **(35)** خلیق انجم 2008ء، ص244 **(36)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص255۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص684 **(37)** ⇦

○○○

[مولوی رجب علی خاں کی طرف سے] نورانی رِدا، جس سے دِل و نظر کی تیرگی دُور ہوتی ہے، گویا خود آلِ عبا کا پرتو ہے۔ (اللّٰہ اللّٰہ) اِدھر سے ایک دو وَرق بطورِ ارمغاں پہنچتا ہے تو اُدھر سے ایک نُور آگیں رِدا بطور تحفہ روانہ فرمائی جاتی ہے۔ مَیں اپنے خداوند کی اَولاد کا احسان کیوں نہ لوں [اور] انھیں کی طرف رُخ کیوں نہ کروں۔ اگر وہ مجھے زرِ خطیر عطا کرنے میں دریغ نہ فرمائے تو مجھے اس کی ثنا و ستائش میں تکلف کیوں ہو۔ سپاس گزاری اگر مبنی بر حقیقت ہو تو اس میں آخر قباحت کیا ہے۔[38]

○○○

[جمادی الثانی 1268ھ، اپریل 1852ء میں میری اہلیہ کا بھانجا زین العابدین خاں عارف، جو مجھے بیٹوں کی طرح عزیز تھا، جواں عمری میں فوت ہو گیا:]

لازم تھا کہ دیکھو مِرا رَستا کوئی دِن اَور
تنہا گئے کیوں ، اَب رہو تنہا کوئی دِن اَور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ 'جاؤں'؟
مانا کہ ہمیشہ نہیں ، اچھا ، کوئی دِن اَور

جاتے ہوئے کہتے ہو ، 'قیامت کو ملیں گے'
کیا خوب! قیامت کا ہے کوئی دِن اَور

ہاں اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا ، جو نہ مرتا کوئی دِن اَور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مِرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دِن اَور

⇦ پرتوروہیلہ 2015ء، ص255۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص683 (**38**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص227–228۔ فارسی متن: پرتوروہیلہ 2015ء، ص714

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد دستد کے؟
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دِن اَور

مجھ سے تمھیں نفرت سی ، نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دِن اَور

گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش؟
کرنا تھا ، جواں مرگ! گزارا کوئی دِن اَور

ناداں ہو ، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دِن اَور[39]

OOO

اجزائے تواریخ تیموریہ لکھے جاتے ہیں اور جو کوئی جُز لکھا جاتا ہے، وہ میرے پاس آتا ہے۔ مَیں اُس کے حاشیے پر معنیِ لغات لکھتا جاتا ہوں۔ چھوٹی تقطیع خوش آئندہ پر گیارہ سطر کے مسطر سے لکھے جاتے ہیں۔ یقین ہے کہ گیارہ بارہ جُز ہوں گے۔[40]

OOO

یہاں عجیب اتفاق ہے کہ جیٹھ کا مہینا ہے اور روز مینہ برستا ہے اور جاڑا پڑتا ہے۔ لوگ شب کو رضائیاں اوڑھتے ہیں اور مَیں لحاف۔ نوروز سے یہی صورت دیکھتا ہوں کہ دو دِن گرمی پڑی اور تیسرے دِن مینہ آیا اور دو چار دِن بارش رہی۔[41]

OOO

مومن خاں مر گئے۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے، یعنی چودہ چودہ، پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں، اُس میں ربط پیدا ہُوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا، دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا، طبیعت اُس کی معنی آفریں تھی۔[42]

(**39**)غالب1862ء، ص58-59(**40**)خلیق انجم1989ء، ص1110(**41**)ایضاً، ص1111(**42**)ایضاً

عجب طرح سے زندگی بسر کر رہا ہوں، میرے حالات سراسر میرے خلافِ طبیعت ہیں۔ مَیں تو یہ چاہتا ہوں کہ چلتا پھرتا رہوں، مہینا بھر وہاں اور دو مہینے وہاں اور صورت یہ کہ گویا مشکیں بندھا ہُوا پڑا ہوں کہ ہرگز جنبش نہیں کر سکتا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔[43]

○○○

زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اَب اُس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میری پاس آرہے ہیں اور دَم بہ دَم مجھ کو ستاتے ہیں اور مَیں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مَیں [تفتہ] کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں، بس [تفتہ کے] نتائجِ طبع [اشعار] میرے پوتے ہیں۔ جب اُن عالمِ صورت کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اُڑاتے ہیں؛ مَیں نہیں تنگ آتا تو اُن معنوی پوتوں سے کہ اُن میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا؟ حق تعالیٰ [تفتہ کے] عالمِ صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور اُن کو دولت و اقبال دے اور [اس] کو اُن کے سر پر سلامت رکھے اور معنوی بچوں، یعنی نتائجِ طبع کو فروغِ شہرت اور حسنِ قبول عطا فرماوے۔[44]

○○○

اگر یہ [غزل: سب کہاں، کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں] ریختہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟ صورت اس کی یہ ہے کہ شاہزادگانِ تیموریہ میں سے [صاحبِ عالم مرزا نورالدین بہادُر] لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔ حضور [بہادُر شاہ ظفر] نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا، سو مَیں حکم بجالایا اور غزل لکھی۔[45]

○○○

مَیں جو تواریخِ تیموریہ لکھتا ہوں تو صرف حالات و واقعات لکھا ہوں۔ فنِ تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازانِ دفترِ شاہی خلاصۂ حالات ازرُوے کتب، اردو میں لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے ہیں، مَیں اس کو فارسی کر کر حوالے کرتا ہوں۔ مَیں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں، مؤرخ نہیں۔[46]

---

(43) خلیق انجم 1989ء، ص 1111 **(44)** خلیق انجم 2008ء، ص 245 **(45)** خلیق انجم 1989ء، ص 1113-1115 **(46)** خلیق انجم 1989ء، ص 1115-1116

○○○

میرے ایک ہم مشرب دوست نے جے پور سے یہ لکھا ہے کہ راجا (سوائی رام سنگھ) 'تیرا سارا کلام کہ جو **اخبار سلطانی** (سراج الاخبار دہلی، مطبوع مطبع سلطانی قلعہ معلی دہلی) کے ذریعے اس کی نظر سے گزرا ہے، پسند کرتا ہے اور تیرا شائق ہے'۔ مَیں نے دِل میں کہا کہ مَیں اس ضمن میں دوستوں اور اجنبیوں میں مضائقہ نہیں کرتا، (لہٰذا) والیِ جے پور سے کیوں انکار کیا جائے، (چنانچہ) مَیں نے پہلے بابو صاحب (بانکے لال) کو لکھا کہ 'مَیں ایک عرضداشتِ شوق کے ساتھ اپنا دیوانِ ریختہ بطور تحفے کے راجا سلطان صفت کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر [تفتہ] وکیلِ ریاست جے پور کو اس بات پر آمادہ کر لیں کہ میرے تحفے کو مہاراجا تک پہنچا دے تو مَیں (دیوانِ ریختہ کے) چند جزو بھیج دوں'۔ چونکہ بابو صاحب (بانکے لال) نے کو مان لیا،[47] وہ دیوانِ ریختہ عرضداشت کے ساتھ بابو صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا۔ اس دیوان کی آرائش میں مَیں نے کنجوسی سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ مٹھی بھر زر لگایا ہے۔ کتاب بھی زر نگار اور جزدان بھی دِلکش۔[48]

○○○

برادرِ گرامی [منشی نبی بخش] کی بصارت کم ہو جانے (کی خبر پر) دِل کا دُکھ بڑھ گیا۔ وہ (کارکنانِ قدرت) کہ جنھوں نے جمشید سے اس کا جام اور سلیمان سے اس کی انگوٹھی چھین لی، یقیناً قزاقی میں مشّاق ہیں۔ ہمارے قافلہ (زیست) کی (ساری) راس ہی سماعت، بصارت، گویائی اور رفتار ہے؛ بھلا کیوں نہ لُٹے۔ ایک [غالب] اونچا سنتا ہے تو ہم نشین کیا بات کرے اور ایک [منشی نبی بخش] کی آنکھ (کم نظری کے باعث) کھلی ہوئی ہے کہ نجانے کون آ رہا ہے، ایک [تفتہ] کے پاؤں چلنے پھرنے سے رہ گئے ہیں تو ایک میں چلنے پھرنے کی سکت نہیں رہی۔ (غرض) ہم تو روزگار کے تباہ کیے ہوئے ہیں، کس سے دادرَسی مانگیں اور منصفی کے لیے کس در پر جائیں۔ [منشی نبی بخش کو چاہیے کہ] صبر کریں اور مقویِ دِماغ کوئی دوا کھائیں اور ایسا سرمہ لگائیں کہ آنکھوں کا دھند دُور ہو اور غم (ہرگز) نہ کریں، کیونکہ غم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ درُونی اور بیرونی قویٰ ہم نے رقم دے کر نہیں خریدے، یہ تو ہمیں مفت میں ملے ہیں، سو اگر واپس بھی لے لیں تو ظلم نہیں ہے۔[49]

---

(47) پرتو روہیلہ 2015ء، ص257۔ فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص685 **(48)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص258۔ فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص686 **(49)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص262۔ فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص690

OOO

ایک زمانہ ہو گیا کہ مَیں داستان سرائی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ یہ (ظفر) کی رضاجوئی کے باعث ہے کہ مَیں گاہ گاہ ریختہ گوئی کی طرف مائل ہوتا ہوں، خاص طور پر یہ ملکہ عالیہ کی فرمائش کی تعمیل کے سبب (صورت پزیر) ہوتا ہے۔[50]

OOO

افسوس ہے کہ مجھے زیاں زدہ و سوختہ ساماں بنا کر پیدا کیا گیا۔ نہ مجھے کلاہ و کمر سے نوازا گیا اور نہ دولتِ علم و ہنر عطا کی گئی۔ مَیں تو فقیر ہوں اور آزادانہ رہِ زیست طے کر رہا ہوں۔ ذوقِ سخن نے میری رہزنی کی اور مجھے اس پر فریفتہ کیا کہ صورتِ معنی کو جلوہ گر کر کے دِکھانا بھی ایک بڑا کام ہے۔ لشکر آرائی و دانشوری تو خیر مجھ میں ہے ہی نہیں، صوفی گری چھوڑ اور سخن آرائی اختیار کر؛ ناچار مَیں نے یہی کیا اور بحرِ سخن میں سفینہ رانی کی۔ میرا قلم میرا عَلَم بن گیا اور آبا و اجداد کے تیر شکستہ سے مَیں نے اپنا خامۂ سخنِ ہنگامہ تراش لیا۔ اپنی زندگی میں تیرہ روزی کے سبب جو مَیں نے کارہائے عجیب کیے، کسی نے ان کی قدر و معیار کو نہیں پہچانا۔ اَب اختتامِ سفر کی منزل ہے، دانت گر رہے ہیں، کان بہرے ہوتے جا رہے ہیں، تمام سر سفید ہو گیا ہے اور چہرے پر جھریاں بکھر گئی ہیں، ہاتھوں میں کپکپی پیدا ہو گئی ہے اور پیر گویا رکاب میں ہیں۔ سر میں جو سودا سمایا تھا، اس میں اَب 'جان کندنی' اور 'نان خوردنی' کا شغل باقی ہے اور دِل سودا زدہ، اندوہ و ملال سے گھرا ہُوا ہے۔[51]

OOO

پسندیدہ خصلت، جوانمرد (بابو بانکے لال)[52] نے مجھے لکھا ہے کہ ایک خط راول شیو سنگھ (والیِ ریاست جے پور) کو لکھنا چاہیے۔ مَیں نے دِل میں کہا، (ان کو) کیا لکھوں اور اس کا مقصود کیا ہو گا۔ مَیں نے اپنے نام کی مہر خط میں رکھی اور دوست کو بھیج دی، تا کہ وہ جو چاہے، لکھے اور مہر لگا دے اور (اس طرح) کام کو چلتا کرے اور خط ارسال کر دے۔[53]

OOO

(**50**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص304 فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص673 (**51**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص304-305۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص673-674 (**52**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص259۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص687 (**53**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص260۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص688

میرے امراض بیشتر دَورے ہیں۔ آگے ایک قولنج کا دَورہ تھا، اَب وجع الصدر کا دَورہ شروع ہو گیا ہے۔ جب یہ درد اُٹھ کھڑا ہوتا ہے؛ چار پہر، چھ پہر، دو پہر رہتا ہے، پھر رفع ہو جاتا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے فرمایا کہ آمدِ فصلِ نَو ہے، تُو مسہل لے ڈال؛ چنانچہ دس بارہ منضج اور تین مسہل ہوئے،[54] اس واسطے کہ میرے اعضا میں درد رہتا تھا اور فضول معدے میں جمع ہو گئے تھے، سو عنایتِ ایزدی سے مقصود حاصل ہو گیا۔ اَب مَیں سبکسار اور تندرست ہوں۔[55]

OOO

کئی دِن سے راجا بھر تپور [مہاراجا بلونت سنگھ] کی بیماری کی خبر سنی جاتی تھی، کل شام کو مَیں نے سنا [کہ 27/مارچ 1853ء کو راجا انتقال کر گئے ہیں، سو] آج صبح قلعے نہیں گیا، پریشان ہوں۔ راجا کا مجھ کو غم نہیں، مجھ کو فکر جانی جی [بانکے لال] کی ہے۔ صاحبانِ انگریز نے ریاستوں کے باب میں ایک قانون وضع کیا ہے، یعنی جو رئیس مر جاتا ہے، سرکار اس ریاست پر قابض و متصرف ہو کر رئیس زادے کے بالغ ہونے تک بندوبست ریاست کا اپنے طور پر رکھتی ہے۔ سرکاری بندوبست میں کوئی قدیم الخدمت موقوف نہیں ہوتا، اس صورت میں یقین ہے کہ جانی صاحب کا علاقہ بدستور قائم رہے۔ یہ وکیل ہیں، معلوم نہیں، مختار کون ہے اور ہمارے بابو صاحب اور اس مختار میں صحبت کیسی ہے؟ رانی سے ان کی کیا صورت ہے؟ مجھ پر خواب و خور حرام ہے۔[56]

OOO

جانی جی کا خط پڑھا [تو معلوم ہُوا کہ] عرضی گزری، دیوان گزرا، راول جی کے نام کا خط گزرا۔ راجا صاحب دیوان دیکھنے سے خوش ہوئے۔ جانی جی نے جو ایک معتمد اپنا سعد اللہ خاں وکیل کے ساتھ کر دیا ہے، وہ منتظر جواب کا ہے۔ راول جی نئے ایجنٹ کے استقبال کو گئے۔ اُن کے آئے پر عرضی کا جواب ملے گا اور اس میں دیوان کی رسید بھی ہو گی۔[57]

OOO

ہمایوں کے حال تک پہنچا تو ازراہِ عذر و حیلہ، بلکہ بسبیلِ اظہارِ حقیقت واقعی حکیم صاحب کارفرما سے کہا کہ مجھ سے انتخابِ حالات ممکن نہیں، آپ مدعا کتبِ سیر سے نکال کر زبانِ اردو میں

---

(54) خلیق انجم 1989ء، ص1119-1120 **(55)** خلیق انجم 1989ء، ص1120 **(56)** خلیق انجم 2008ء، ص252-253 **(57)** خلیق انجم 2008ء، ص253

ایک مسودہ اُس کا لکھوا کر میرے پاس بھیج دیا کیجیے، مَیں اس کو فارسی کر کر تم کو دے دیا کروں گا۔ انھوں نے اس کو قبول کر کر ابتداے عالَم و آدم سے میرے پاس مسودۂ اردو بھیجا تو اَب گویا ایک اَور کتاب لکھنی پڑی۔ مَیں نے اس کا چھوٹا سا دیباچہ ایک اَور ہی انداز میں اپنے طور پر لکھا اور مسودہ حوالے کیا۔ رمضان کے مہینے سے کہ آج اس کو دس مہینے ہوئے، وہ مسودہ آنا موقوف ہو گیا۔ چار جُز ہوں گے۔ دو چار بار مَیں نے اُن سے تقاضا کیا، یہی جواب سنا کہ اَب رمضان ہے، پھر کہا کہ عید کا ہنگامہ ہے۔ مَیں نے سوچا کہ مجھ کو کیا، مَیں کیوں طالبِ مشقت ہوں، تقاضا موقوف کیا۔ اَب کہاں اُن سے مانگوں اور کیوں مانگوں۔ جو بِنا اُٹھی ہی نہیں، اُس سے غرض کیا۔[58]

بادشاہ نے قلعے میں مشاعرہ مقرر کیا ہے۔ ہر مہینے میں دو بار مشاعرہ ہوتا ہے۔ پندرھویں کو اور انتیسویں کو۔ حضور [بہادُر شاہ ظفر] فارسی کا ایک مصرع اور ریختہ کا ایک مصرع طرح کرتے ہیں۔ اَب کے جمادی الثانی کی تیسویں کو جو مشاعرہ ہُوا، اُس میں مصرع فارسی یہ تھا: زیں تماشا گاہ گریاں می رود۔ ریختہ کا مصرع تھا: خمارِ عشق ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے۔ نظر ہے، کیا کہیے؛ خبر ہے، کیا کہیے۔ مَیں نے [گیارہ اشعار پر مشتمل] ایک غزل فارسی اور [نو اشعار کا] ایک ریختہ موافق طرح کے اور [گیارہ اشعار پر مشتمل] دوسرا ریختہ اسی طرح میں سے ایک اَور صورت نکال کر لکھا:

دیا ہے دِل اگر اس کو ، بشر ہے ، کیا کہیے
ہُوا رقیب تو ہو ، نامہ بر ہے ، کیا کہیے
کہا یہ کس نے کہ غالب بُرا نہیں ، لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے ، کیا کہیے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے — تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا، غالب! — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے[59]

OOO

---

(58) خلیق انجم 1989ء، ص 1123-1124 (59) خلیق انجم 1989ء، ص 1124-1128

جے پور کا مقدمہ [مئی 1853ء میں] لائق اس کے نہیں ہے کہ ہم اس کا خیال کریں۔ ایک بِناڈالی تھی[60] [اور] ایک گدائی کی طرح نکالی تھی۔ ایک دوست مدد گار ہُوا اور اس طرح کو اس نے کمال کو پہنچایا۔ راول مختارِ راج اور سعد اللّٰہ خاں وکیلِ راج، یہ دونوں ذریعۂ حصولِ مدعا ٹھہرے۔ وہاں کا رنگ یہ ہو گیا کہ راول بھاگتا پھرتا ہے اور وکیل استعفا بغل میں دابے رہتا ہے۔ بس اَب اس امر خاص کو بھی ہم نے فہرستِ حسرت ہاے دیرینہ میں لکھ دیا۔ و اللہ علیٰ کل شئٍ قدیر۔[61] یہ جو [تفتہ] لکھتے ہیں کہ 'راجا تیرے دیوان کو پڑھا کرتا تھا اور پیش نظر رکھتا تھا'، یہ بھی تو از رُوے تحریرِ منشی ہر دیو سنگھ کہتے ہیں۔ اُن کا بیان کیونکر دِل نشیں ہو؟ وہ بھی، جو بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ پانسو روپے نقد اور خلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے، ہولی ہو چکی اور مَیں لے کر چلا۔ پھاگن، چیت، بیساکھ؛ نہیں معلوم، ہولی کس مہینے ہوتی ہے؟ آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی۔[62]

OOO

گرمی [میں] میرا تو بعینہٖ وہ حال ہوتا ہے، جو زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا ہوتا ہے، بقولِ ظہوری: حالِ سگ، حالِ گربہ، حالِ شغال۔[63]

OOO

وکیلِ کمپنی نے سنینِ ماضیہ کے کاغذ دیکھ کر رسومِ سرکاری [انکم ٹیکس] جس شخص پر نکلتی تھیں، اُس کا مطالبہ کیا ہے اور مطالبہ کیا، مواخذہ، یعنی بہت شدت۔ ازاں جملہ مجھ پر بھی بابت رسومِ سرکاری پانسو روپے آٹھ آنے نکلے اور اس کی طلب بقیدِ حکمِ قید ہوئی۔ مَیں آٹھ آنے کو محتاج، پانسو کہاں سے لاؤں۔ بارے، انگریزی تنخواہ میں سے پانچ روپے مہینا بطریقِ قسط مقرر کر دیا۔ باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا پاتا تھا، ستاون روپے آٹھ آنے رہ گئے۔ پانچ روپے مہینے کا ساٹھ روپے سالیانہ ہُوا۔ اَب یہ توقع کہاں کہ پوری تنخواہ پاؤں گا، [گویا] ستاون روپے کا پنشن دار ہوں۔ بارے، کل فیصلہ ہُوا۔[64] ابتداے جون 1853ء، یعنی ماہِ آئندہ سے یہ قسط جاری ہو گی۔[65]

OOO

---

(60) خلیق انجم 2008ء، ص 255 **(61)** خلیق انجم 1989ء، ص 1124 **(62)** خلیق انجم 2008ء، ص 255-256 **(63)** خلیق انجم 1989ء، ص 1129 **(64)** خلیق انجم 1989ء، ص 1129-1130 **(65)** خلیق انجم 2008ء، ص 257

[غالب] اگرچہ اَور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا، مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے، سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ جے پور سے مجھ کو اگر دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اَور مل جاتا۔[66] بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ 'ہر دیو سنگھ آگیا اور پانسو روپے کی ہنڈوی لایا، مگر اس کے مصارف کی بابت انیتس روپے کئی آنے اُس ہنڈوی میں محسوب ہو گئے ہیں، سو مَیں اپنے پاس سے ملا کر پورے پانسو کی ہنڈوی تجھ کو بھیجتا ہوں'۔ مَیں نے اُن کو لکھا کہ 'مصارف ہر دیو سنگھ کے مَیں مجرا دوں گا، تکلیف نہ کرو؛ پچیس یہ میری طرف سے ہر دیو سنگھ کو اَور دے دو اور باقی کچھ کم ساڑھے چار سو کی ہنڈوی جلد روانہ کرو'۔[67] [غرض] ہر دیو سنگھ کی عرضی اور پچیس کی رسید اور پانسو کی ہنڈوی پہنچی۔ بابو صاحب نے پچیس ہر دیو سنگھ کو دیے اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہر حال، مجھ کو صبر کہاں؟ متی کاٹ کر روپے لے لیے۔[68] یہ پانسو متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے، وہ بقدر پندرہ سے سولہ سو کے باقی رہے گا اور وہ، جو سو بابو صاحب سے منگوائے گئے تھے، وہ صرف انگریز سوداگر کے دینے تھے، سو وہ دے دیے گئے۔[69] قرض متفرق سب ادا ہُوا، بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس میں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علی احسانہٗ۔[70]

○○○

اس ساٹھ برس میں یہ لُو اور یہ دھوپ اور یہ تپش نہیں دیکھی۔ چھٹی ساتویں رمضان کو مینہ خوب برسا۔ ایسا مینہ جیٹھ کے مہینے میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اَب مینہ کھل گیا ہے، ابر گِھرا رہتا ہے، ہَوا اگر چلتی ہے تو گرم نہیں ہوتی اور اگر رُک جاتی ہے تو قیامت آتی ہے۔ روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں؛ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طُرفہ روِش رکھتے ہیں۔ مَیں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تُو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اَور چیز ہے اور روزہ بہلانا اَور بات ہے۔[71]

○○○

(66) خلیق انجم 2008ء، ص258 **(67)** خلیق انجم 2008ء، ص257 **(68)** خلیق انجم 2008ء، ص259 **(69)** ایضاً **(70)** ایضاً **(71)** خلیق انجم 1989ء، ص1130

اردو اخبار دہلی میں تھا کہ راہیں چوڑی کرنے پر اور حویلیاں اور دُکانیں ڈھانے پر بلوہ ہُوا اور رعایا نے پتّھر مارے اور مجسٹریٹ زخمی ہُوا۔[72]

OOO

ہائے یہ عید کہ مجھ پر محرم سے زیادہ سوگوار گزری۔ اِس سے دو دِن پیشتر کہ لوگ شام کو ماہِ نَو دیکھیں اور صبح عید منائیں، (بہادُر شاہ) کی طبیعت خراب ہو گئی اور شدید بخار اور خطرناک اسہال میں مبتلا ہو گئے۔ آج 10/ شوال اور 18/ جولائی [1853ء] ہے، امید و بیم کی وہی کشمکش ہے اور بہی خواہوں کی جان پر اسی طرح بنی ہوئی ہے۔ خون کی حدت رفع نہیں ہوتی اور دست بند ہونے میں نہیں آتے۔ روزانہ صبح قلعے جاتا ہوں، کھانا کبھی شاہ زادوں کے گھر سے مانگ کر کھاتا ہوں اور شام کے وقت اپنے غم کدے میں آجاتا ہوں اور کبھی دوپہر اپنے گھر کھانا کھاتا ہوں تو دِن ڈھلے (واپس قلعے) چلا جاتا ہوں۔[73] [خدا جانے،] کیا ہوتا ہے اور مَیں، جو بادشاہِ بیمار کے سایۂ عاطفت میں بیٹھا ہوں، مجھ پر کیا گزرتی ہے۔ قصیدۂ تہنیتِ عید بھی نہیں پڑھا جا سکتا۔[74]

بادشاہ کا ہَوادار پلنگ کے برابر لگا دیتے ہیں اور پلنگ پر سے ہَوادار پر بٹھا دیتے ہیں۔ قلعے ہی قلعے میں پھر کر، پھر محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے۔ جب تک سلامت رہیں، غنیمت ہے؛ لیکن میرا مدعا کہ غسلِ صحت کریں، مَیں رخصت لوں اور باندے کو جاؤں۔[75] میر اماموں کا بیٹا، وہ نواب ذوالفقار کی حقیقی خالہ کا بیٹا اور مسند نشینِ حال کا چچا، باعث ہُوا تھا میرے باندہ بندیل کھنڈ آنے کا۔ مَیں نے سب سامانِ سفر کر لیا، ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا۔ قصد یہ تھا فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا، وہاں سے نواب علی بہادُر کے ہاں کی سواری میں باندے جا کر، ہفتہ بھر رہ کر، کالپی ہوتا ہُوا، [نواب شفق] کے قدم دیکھتا ہُوا، بسبیلِ ڈاک دلّی چلا آؤں گا۔ ناگاہ، حضورِ والا [بہادُر شاہ] بیمار ہو گئے اور مرض نے طول کھینچا۔[76]

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر دیکھیے، کب دِن پھریں حمّام کے[77]

(**72**) خلیق انجم 1989ء، ص1130-1131 (**73**) پر تو روہیلہ 2015ء، ص256۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص684 (**74**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 301۔ فارسی متن: پر تو روہیلہ 2015ء، ص737 (**75**) خلیق انجم 1989ء، ص1132 (**76**) خلیق انجم 1989ء، ص980 (**77**) غالب 1996ء، ص327

[ارادہ تھا کہ جس وقت] بادشاہ اچھے ہوگئے، غسلِ صحت کرنے کی دیر ہے اور مَیں نے مبارک باد کا قصیدہ یا قطعہ پڑھا اور [اُسی وقت] رخصت لی اور ڈاک گاڑی میں بیٹھا اور کول پہنچا،[78] [لیکن] مَیں وہ قسمت لایا ہوں کہ جو چاہوں، وہ نہ ہو۔ ڈاک کے سفر کی خوشی، کول پہنچنے کی مسرت، بھائی سے ملنے کی فرحت، فرزندوں کے دیکھنے کا لطف، راہ میں جا بجا آم خریدنے کا ذوق؛ کیا کہوں کہ کیسی حسرت رہ گئی۔ روپیہ فتوح کا آیا ہُوا تھا، چاہتا تھا کہ اُس کو اس سفر میں خرچ کروں، یہاں یہ رنگ درپیش آیا۔ اَب سنتا ہوں کہ حضور بعد محرم جشنِ غسلِ صحت کریں گے۔ عزم میرا بدستور، مگر روپیہ کہاں۔ بہر حال، رخصت کے مانگنے کا موقع تو آئے، قرض دام کرکے بھی قصد کروں گا۔[79]

OOO

حضرت امیر المومنین [وزیر الدولہ وزیر محمد خاں، والیِ ٹونک] کی خدمت میں اس دعا کی بنا پر کہ جو مرید کر سکتے ہیں اور اس (قدر) ستائش کے ضمن میں کہ جو شاعروں کے تخیل میں آسکتی ہے، بے شک مَیں نے خود کو اس دولتِ جاوید طراز کے دامن سے وابستہ کر رکھا ہے اور وہ اس سبب کہ کسی دوسرے کام کا اہل نہیں اور کوئی عمدہ خدمت انجام نہیں دے سکتا، اس لیے ثناخوانی اور دعاگوئی پر قناعت کرکے اس کا التزام کیا ہے کہ ہر سال عیدِ اضحیٰ کی تہنیت کی تقریب پر ایک تحریر توصیفی میرے طرف سے [اُن] کی نگاہِ التفات سے رُوشناس ہوتی رہے۔[80]

OOO

لفٹننٹ گورنر بریلی میں مر گئے۔ اس قوم کا کیا انتظام ہے! ہندوستان کا اگر کوئی اتنا بڑا امیر مرا ہوتا تو کیا انقلاب ہو جاتا۔ یہاں کسی کے کان پر جُوں بھی نہیں [رینگی] کہ کیا ہُوا اور کون مر گیا۔[81]

OOO

کل [5/ اکتوبر 1853ء کے] دِن بھر گرمی ہَوا ایسی رہی کہ جیسی جیٹھ اساڑھ میں ہوتی ہے۔ شام ہوتے ہوتے وہ سردی ہو گئی کہ اغنیا نے دوشالے توشہ خانے میں سے نکلوائے اور غربا نے گٹھڑیاں کھول کھول کر رضائی اور پٹّو نکالے۔ ابرِ سیاہ تمام رات محیط آسمان پر رہا، مگر مینہ نہ برسا۔ اَب صبح ہوتے وہ پانی پڑا کہ جل تھل بھر گئے۔[82]

(**78**) خلیق انجم 1989ء، ص1133 (**79**) خلیق انجم 1989ء، ص1134 (**80**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص865 فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص956 (**81**) خلیق انجم 1989ء، ص1134 (**82**) خلیق انجم 1989ء، ص1136

حضورِ والا بادشاہ اگرچہ صحت و تندرستی و فرہ مندی کے ساتھ ہیں، لیکن سراپردۂ خلوت سے باہر کم ہی آتے ہیں اور بیشتر تکیہ گاہِ عز و ناز میں آرام فرما رہتے ہیں۔ بندگانِ بارگاہ کو اَب شرفِ باریابی عطا نہیں فرماتے اور دوسروں کے سخن و گفتار کی طرف توجہ فرما نہیں ہوتے۔ روزانہ صبح کے وقت درِ دولت پر حاضری دینا میرے معمولات میں سے ہے۔[83] جشنِ غسلِ صحت کا کچھ پتا نہیں۔ قصیدہ کہہ رکھا ہے، اگر ہُوا تو پڑھ دوں گا اور وہ **سراج الاخبار** میں چھاپا جائے گا۔ قصد یہ ہے کہ اسی محفل میں باندہ کے جانے کی رخصت بھی لے لوں۔[84]

○○○

ٹامس مٹکاف صاحب ایجنٹ و کمشنر دہلی مر گئے۔ ہم لوگوں کے جاننے والے ایک یہی صاحب رہ گئے تھے۔ جنازہ، کشمیری دروازے سے ان کی کوٹھی تک لاکھ آدمی کی بھیڑ تھی۔[85]

○○○

منگل کے دِن 18/ ربیع الاوّل کو شام کے وقت وہ پھوپی کہ مَیں نے بچپن سے آج تک اُس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھیں، مر گئی۔ تین پھوپیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا، اس مرحومہ کے ہونے سے مَیں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے مَیں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج یک بار مر گئے۔ اناللّٰہ و انا الیہ راجعون۔[86] میرے اوپر ان کی وفات سے وہ کچھ گزری کہ جو جگر پر خنجر سے اور گھاس پر آگ سے نہیں گزرتی۔[87]

○○○

ایک سمندر نہیں، بلکہ جہانِ علم و فن کے سات سمندر؛ ایک ستارہ نہیں، بلکہ آسمانِ فضل و کمال کے سات ستارے؛ بلکہ نہ سات سمندر اور نہ سات ستارے، جو کچھ بھی مَیں کہہ رہا ہوں، روانی اور رَوشنی میں اس سے بڑھ کر ہمارے آقا، مالک اور فضل میں ہمارے درمیان سب سے بڑھ کر مولوی حافظ فضل حق المخاطب بہ امیر الدولہ بہادُر کا دہلی آنا ہُو، (لیکن) میرے خیال میں یہ تجلیِ حق بجلی کی شکل میں تھی کہ آقاے گرامی نے دو ہفتے سے زیادہ شہر میں قیام نہیں کیا، چنانچہ کل منگل [3/ جنوری 1854ء] کے دِن رامپور جا رہے ہیں۔[88]

(**83**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 313 فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 678 (**84**) خلیق انجم 1989ء، ص 1138 (**85**) ایضاً (**86**) ایضاً (**87**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 335 فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص 766 (**88**) ایضاً

کاش! وہ غم، جو مجھے لاحق ہے، اتنا گراں نہ ہوتا، تاکہ یہی قلم داستان سرائی کے اُن (پرانے) راستوں پر چل سکتا، لیکن افسوس! اِس ناتوانی کے عارضے کے سبب قدم اٹھانے سے ایسا لاچار ہے اور اس طرح سرمہ بہ گلو ہو گیا ہے کہ اگر کبھی دو تین سطریں لکھی بھی جائیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلم نہیں ہے، اُنھی (کہے گئے) الفاظ کا قطرہ قطرہ نچڑ رہا ہے۔[89]

OOO

[کول علی گڑھ کے بعد] یہاں بھی چیچک کا زور شروع ہُوا۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ انجام بخیر ہے۔ جس زمانے میں کول میں شدت [تھی]، اُس زمانے میں یہاں کچھ ذکر نہ تھا، اَب ہنگامہ گرم ہے۔ ظاہرا کول کی راہ سے تشریف لائی ہیں۔[90]

OOO

چار دِن [یعنی 26/ فروری 1854ء] سے لرزے میں مبتلا ہوں اور جس دِن سے لرزہ چڑھا ہے، کھانا مطلق نہیں کھایا۔ آج پانچواں دِن ہے کہ نہ کھانا دِن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب۔ حرارت مزاج میں بہت زیادہ ہے، ناچار احتراز کرتا ہوں۔[91] اَب [2/ مارچ 1854ء کو] اگرچہ تپ نہ رہی، لیکن اَور عوارض پیدا ہو گئے؛ چنانچہ کل پانچواں مسہل تھا اور کل پھر ہو گا۔[92]

OOO

[جون 1854ء کو] گرمی کی وہ شدت ہے کہ عیاذاً باللہ۔ مَیں آپ احتراق کا مارا، ایک وقت کا کھانا کھانے والا، سو وہ اَب موقوف؛ غذا منحصر دہی پر۔ کہاں تک دہی کھاؤں؟ تاب مجھ میں روزہ رکھنے کی کہاں، مگر بدتر روزہ داروں سے ہوں۔ میرے خدمت گزار چاروں روزہ دار۔ آخرِ روز یوں نظر آتا ہے کہ چار مُردے۔ یہ پریشانی اور یہ بے سروسامانی؛ نہ خس خانہ، نہ برفِ آب:

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں — سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
روزہ مِرا ایمان ہے، غالب! لیکن — خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں
افطارِ صوم کی جسے کچھ دست گاہ ہو — اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

(**89**) پرتوروہیلہ 2015ء، ص336۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص767 (**90**) خلیق انجم 1989ء، ص1140
(**91**) خلیق انجم 2008ء، ص263 (**92**) خلیق انجم 1989ء، ص1141

یہ رباعی اور یہ قطعہ [3/ جون 1854ء کو ظفر کے] حضور میں پڑھا، بہت ہنسے اور خوش ہوئے۔[93]

OOO

مَیں گرمی کے سبب مصیبت میں گرفتار،[94] چار مہینے سے تپِ لرزہ میں گرفتار؛ دَم لینے کی طاقت نہیں۔[95] احتراق میں مر رہاہوں، مگر آموں کو تاکتاہوں کہ کب نکلیں۔ بنگالے میں آم چل نکلے ہوں گے۔ دو برس کلکتے میں رہاہوں، جون کے مہینے میں آم پکتے ہیں۔ دِن تین ایک ہوئے، ایک میوہ فروش پانچ آم لایا تھا؛ مزہ نہ تھا، لُو کے پکے ہوئے تھے۔[96]

OOO

میرا دِل اَب شعر و سخن و امارت و ریاست و دِین و دُنیا و مرگ و زیست و کفر و اسلام سے سرد ہو گیاہے۔[97] میرے اس درد سے زیادہ کوئی جاں گداز غم کیاہو گا کہ جب تک میری دُکانِ فکر کا در کشادہ تھا اور رنگارنگ متاعِ سخن فراوانی کے ساتھ اس میں موجود تھی، کسی نے دروازے پر دستک نہ دی اور خریداری کا سودا کسی سر میں نہ پیدا ہُوا۔ جب دُکان میں سامان نہ رہا اور حرف ہائے جگر گداز زبان سے غائب ہو گئے تو ایک بلند پایہ و گرانمایہ خریدار پیدا ہُوا، جو اپنے سخن کے نقدِ رائج کو میری گفتارِ ناسرہ کے بدلے میں بطور قیمت ادا کرتا ہے اور موتیوں کو خزفِ بے مایہ کے برابر تولتا ہے۔ [شیفتہ] سے کہ دُکانِ بے رونق کے خریدار ہیں، ہمایوں نامہ کے ورُودِ مسعود اور اس کی بخشی ہوئی مسرتِ فراواں کے بارے میں خود اپنے اوپر رشک آنے لگا۔ اپنے احباب کو مَیں کس حد تک قدر ناشناس تصور کر تا رہاہوں، اَب [شیفتہ] ایسے کسی قدر شناس کی مدح جب اپنے بارے میں سنتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ چالیس سال کی جگر کاوی کا حاصل یہ ہے کہ مَیں نے جو کچھ کہا تھا، اس کو اکٹھا کیا اور ایک ایسے آدمی کے سر پر نچھاور کر دیا، جس کے فرقدان کی بلندی ستاروں سے باتیں کرتی ہے۔ اَب کہ میری طبیعت میں وہ روانی اور فکر میں وہ گرمی باقی نہیں، یہ کہاجاسکتاہے کہ خزانہ فراہم کرنے کے بعد صاحبِ خزانہ خود خفیف ہو گیا۔ جو گزر چکاہے، وہی نظر سے گزر رہاہے اور جو کچھ لکھاجاچکاہے، وہی دوبارہ بھی نذرِ قرطاس ہو رہاہے۔[98]

---

(93) خلیق انجم 1989ء، ص1142 **(94)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص258۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص686

(95) خلیق انجم 2008ء، ص264 **(96)** خلیق انجم 1989ء، ص1142 **(97)** خلیق انجم 2008ء، ص264

(98) تنویر احمد علوی 2016ء، ص179-180۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص436-437

[جولائی 1854ء میں] اگرچہ گرمی رفع ہو گئی، مینہ برسنے لگے، ہَوائے سرد چلنے لگی؛ مگر دِل مکدّر رہے اور حواس ٹھکانے نہیں۔[99]

OOO

بادشاہ کا قصیدہ سارا اور ولی عہد کا قصیدہ بے خاتمہ آگے سے کہہ رکھا تھا، اس کا خاتمہ بہ ہزار مشقت رمضان میں کہہ لیا اور عید کو دونوں پڑھ دیے۔[100] اِن دِنوں میں دو غزلیں لکھیں ہیں؛ ایک تو 'دریانہ ہُوا'، 'صحرا نہ ہُوا'؛ دوسری غزل 'رواں کیوں ہو' اور 'گماں کیوں ہو':[101]

درخُورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہُوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہُوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے ، پہ تماشا نہ ہُوا[102]

کسی کو دے کے دِل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دِل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تُو غالب!
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو[103]

[تاریخ کی] وہ صورت، جو پہلے تھی، وہ نہیں رہی۔ آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا، اَب شروعِ تحریر آفرینشِ عالَم و ظہورِ آدم سے ہے۔ مَیں نے کتاب کا نام **پرتوستان** رکھا اور دو مجلّد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلّد ابتدائے عالَم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک، اس کا نام **مہرِ نیم روز** رکھا؛ دوسرا مجلّد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والیِ عصر تک، اس کا نام **ماہِ نیم ماہ**۔[104] چودھویں رات کے چاند کو ماہِ چہاردہ اور ماہِ دوہفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ہے؛ مگر جہاں تک مجھے معلوم

---

(99) خلیق انجم 2008ء، ص 265 **(100)** ایضاً **(101)** خلیق انجم 1989ء، ص 1148 **(102)** غالب 1862ء، ص 26، 27 **(103)** خلیق انجم 1989ء، ص 1148، 1149 **(104)** خلیق انجم 1989ء، ص 1152

ہے، 'ماہِ نیم ماہ' کسی نے نہیں باندھا۔ یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ہے۔[105] وہ **مہرِ نیم روز** تمام ہُوا اور نذرِ حضور کیا، اَب اگر زیست وفا کرے گی تو **ماہِ نیم ماہ** لکھا جائے گا۔ توقیعِ خوشنودی مجھ کو مل گیا، یعنی شقہ مشتملِ تحسین و اظہارِ عنایت پر؛ اسی کو خلعتِ فاخرہ اور جاگیر تصور کرتا ہوں۔ مجھ میں کہیں جانے کا دَم نہیں۔ اگر بادشاہ کا توسّل نہ ہو تا تو بھی یہیں پڑا رہتا۔ میر اقدر داں کون کہ مَیں اس پر ناز کروں؛ بقول ڈوم کے، 'جو سمجھے، وہ ہمارا غلام؛ جو نہ سمجھے، ہم اُس کے غلام'۔[106]

○○○

یہاں کی عید [اضحیٰ ستمبر 1854ء]، یہی ذکر رہا کہ کول میں بڑی خانہ جنگی ہوئی اور ہندو مسلمانوں میں تلوار چلی، دس بیس آدمی طرفین کے مارے گئے۔ ایسا ہی [کول میں] مشہور ہو گا کہ دلّی میں تلوار چلی؛ سو نہ تلوار چلی، نہ خانہ جنگی ہوئی۔ دو دِن ہندو دُکانداروں نے دُکانیں بند کر دی تھیں؛ سو، صاحب مجسٹریٹ بہادُر اور کوتوال نے سارے شہر کا گشت کیا۔ بہ ملاطفت و ملائمت و بہ تاکید و تہدید دُکانیں کھلوائیں؛ بکریاں بھی قربان ہوئیں، گائیں بھی۔[107]

○○○

یہاں ایک تپ پھیلی ہے کہ کوئی گھر نہ ہو گا، جس کے آدھے آدمی تپ میں مبتلا نہ ہوں۔ باری کی تپ نوبت کلو داروغہ، اُس کی ماں، مداری کی گھر والی، اُس کے بچے سب بیمار۔ میری بی بی اور [مرزا] حسین علی خاں [شاداں دہلوی] کی پالنے والی بیمار۔ مزہ یہ کہ اِن دونوں کا روزِ نوبت ایک ہے۔[108] غم نداری بُز بخر، کہاں زین العابدین اور اس کی بیوی مَرے اور دو بچے چھوڑ جائے اور اُن میں سے ایک مَیں لے لوں۔ آج [3/ اکتوبر 1854ء] تیرھواں دِن ہے کہ حسین علی نے آنکھ نہیں کھولی، دِن رات تپ اور غفلت اور بے خودی۔ کل بارھویں دِن مسہل دیا تھا، چار دست آئے۔ مدار دو چار بار دَوا اور ایک دو بار آشِ جَو پر ہے۔ دادی اُس کی بیمار، روز دوپہر کو لرزہ چڑھتا ہے، آخرِ روز فرصت ہو جاتی ہے۔ ظہر قضا اور عصر وقت پر پڑھ لیتی ہے۔ تماشا یہ کہ تاریخ دونوں کے تپ کی ایک ہے۔ بی بی کی تو اتنی فکر نہیں، لیکن حسین علی کی بیماری نے مار ڈالا۔ مَیں اُس کو بہت چاہتا ہوں، خدا اس کو بچا لے اور مَیں اُس کو دُنیا میں چھوڑ جاؤں۔ سو کھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔

(**105**) حالی 1897ء، ص 34 (**106**) خلیق انجم 1989ء، ص 1152 (**107**) خلیق انجم 1989ء، ص 1151-1152 (**108**) خلیق انجم 1989ء، ص 1152

یہاں بڑی بیماری پھیل رہی ہے۔ تپیں ہیں رنگا رنگ، بیشتر باری کی، یعنی اگر گھر میں دس آدمی ہیں تو چھ بیمار ہوں گے۔ آج تک انجام بخیر تھا، اَب لوگ مرنے لگے۔ ہَوا میں سمیّت پیدا ہو گئی۔[109]

ООО

یہ ڈاک کا سر رشتہ کیسا بگڑا، مَیں نے اپنے نزدیک از رُوے احتیاط بیرنگ خط بھیجنا اختیار کیا تھا، گو مقتضاے وہم ہو۔ خط جب ڈاک گھر میں جاتا تھا، رسید ملتی تھی؛ پوسٹ پیڈ کی لال مہر، بیرنگ کی سیاہ مہر۔ خاطر جمع ہو جاتی تھی۔ ڈاک کتاب کو دیکھ کر یاد آ جاتا تھا کہ فلانا خط کس دِن بھیجا ہے اور کس طرح بھیجا ہے۔ اَب ڈاک گھر میں ایک صندوق مُنھ کھلا ہُوا [letter box] دھر دیا ہے؛ جو جائے، خط کو اس میں پھینکے اور چلا آئے۔ نہ رسید، نہ مہر، نہ مشاہدہ؛ خدا جانے، وہ خط روانہ ہو گا یا نہ ہو گا؛ اگر روانہ بھی ہُوا تو وہاں پہنچنے پر ڈاک کے ہرکارے کو نہ انعام کا لچ، نہ سرکار کو محصول کی طمع؛ نہ دیا ہرکارے کو، یا دیا [اور] ہرکارے نے نہ پہنچایا۔ اگر خط نہ پہنچا تو بھیجنے والا کس دستاویز سے دعویٰ کرے گا، مگر ہاں، چار آنے دے کر رجسٹری کروائے۔ ہم دوسرے تیسرے دِن جا بجا خط بھیجنے والے روپیہ آٹھ آنے رجسٹری کو کہاں سے لائیں۔[110]

ООО

آج [6/ اکتوبر 1854ء] سولھواں دِن ہے [حسین علی کے] تپ کو اور نواں دِن ہے کہ دانہ نہیں کھایا، سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ آج حُقنہ ہو رہا ہے، مجھ میں دیکھنے کی تاب نہیں، مَیں دیوان خانے میں بیٹھا ہوں۔[111]

[مرزا حسین علی خاں] کا حقیقی دادا، یعنی زین العابدین خاں کے والد اور میرے ہم زُلف نواب غلام حسین خاں [اکتوبر میں] مر گئے۔ یہ بہت صاحب مروّت اور صاحبِ مہر و محبت تھا۔[112]

ООО

نہ کان میں آواز آتی ہے، نہ ناک میں بُو۔ حکما میرے دوست ہیں، [اس کے باوجود] میری تدبیر نہیں ہو سکتی۔ فرصت چاہیے، مشقت چاہیے، مسہل لیے جائیں، معجونیں کھائی جائیں، عرق پیے جائیں؛ آئندہ فائدہ ہو یا نہ ہو۔ ہر چند حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے از راہِ عنایت چاہا کہ

(**109**) خلیق انجم 1989ء، ص 1153 (**110**) خلیق انجم 1989ء، ص 1154 (**111**) خلیق انجم 1989ء، ص 1155 (**112**) خلیق انجم 1989ء، ص 1157

معالجہ کریں، مَیں نے جبر اُٹھانا گوارانہ کیا۔ بات یہی ہے کہ ان امراض کا علاج منحصر کثرتِ تنقیہ میں ہے اور اس کو حضورِ طبیب و فراغِ خاطر شرط ہے۔[113]

OOO

حسین علی اَب اچھا ہے، [مگر] پیشاب میں ریگ آتی ہے۔ معدے میں صلابت ہے، ضعف کی کچھ حد نہیں۔[114] کئی دِن کے بعد [4/ نومبر 1854ء کو] پھر تپ چڑھ آئی، آخرِ شب تپ اُتری۔[115]

OOO

[15/ نومبر 1854 کو] میاں [شیخ محمد ابراہیم] ذوق مر گئے۔ حضور والا [بہادُر شاہ ظفر] نے ذوقِ شعر و سخن ترک کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع کا ایک اور اس عصر میں غنیمت تھا۔[116]

OOO

مشاعرہ یہاں [دلّی] شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ مَیں کبھی اُس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے، ابھی نہ ہو؛ اَب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔[117]

OOO

کچھ دِنوں بادشاہ [بہادُر شاہ] کا مصاحب رہا، پھر [شیخ محمد ابراہیم ذوق کے انتقال کے بعد اُن کا] استاد کہلایا۔[118]

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب[119]

OOO

فارسی غزل تو شاید [مدت سے] ایک بھی نہیں کہی، ہاں ہندی غزلیں قلعے کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں۔ سو وہ یا حسین مرزا صاحب کے پاس ہوں گی یا ضیاء الدین خاں صاحب پاس۔[120] ان دِنوں [مارچ 1855ء] میں دو رباعیاں اردو میں لکھی ہیں:

(**113**) خلیق انجم 1989ء، ص 1156 (**114**) خلیق انجم 1989ء، ص 1155 (**115**) خلیق انجم 1989ء، ص 1157-1156 (**116**) خلیق انجم 1989ء، ص 1157 (**117**) خلیق انجم 1995ء، ص 1490 (**118**) خلیق انجم 1990ء، ص 808 (**119**) حالی 1897ء، ص 77 (**120**) خلیق انجم 1989ء، ص 1042

کہتے ہیں کہ وہ مردمِ آزار نہیں عشاق کی پُرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہو گا کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں
ہم گرچہ ہوئے سلام کرنے والے کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے[121]

○○○

کل[18/مئی1855ء]سے رمضان المبارک تشریف لائے ہیں۔کل دِن بھر تو گرمی رہی اور شام سے پانی تو برف ہو گیا ہے اور ہَوا کا یہ عالم ہے کہ رات کو مَیں نے رضائی اوڑھی تھی، [لیکن]اس ہَوا کا اعتبار نہیں۔[122]

ہم نے اپنے گھروں میں یہ رسم دیکھی ہے کہ جہاں لڑکا آٹھ سات برس کا ہُوا اور رمضان آیا تو اس کو روزہ رکھواتے اور نماز پڑھواتے ہیں۔[123]

○○○

اس امر کا تشکر حد سے زیادہ ہے کہ ذرّے کو آفتاب سے شناسائی اور قطرے کی دریا سے قرابت کے طور پر فقیر کی بادشاہ (نواب یوسُف علی خاں، والیِ رامپور) سے کوئی اجنبیت نہیں۔ [انھوں نے بچپن میں مجھ سے فارسی پڑھی تھی۔]اُس زمانے میں، جو نوبہار سے زیادہ رنگین تھا، جب ذاتِ بابرکات کی سعادت کے دبدبے سے (میرا) تکیہ بھی بے نقش آسمان سے برابری کا دَم بھرتا تھا، [نواب محمد یوسُف علی] کی [1855ء میں] تخت نشینی پر ایک [فارسی] قطعہ تاریخ اسی شناسائی کی توانائی اور رُوح پروری کی بدولت تشکیل پذیر ہو کر ارسالِ خدمت ہُوا۔[124]

○○○

الحمدللہ کہ حرارتِ صومی اور حرارتِ یومی باہم رفع ہو گئیں۔ستائیس تاریخ کی رات، جس کو شبِ قدر کہتے ہیں، عیاذاًاللہ، وہ ہَوائے گرم اور وہ تاریکی! بارے، اَب لُو نہیں چلتی۔پُروا ہَوا اگرچہ پانی کو بگاڑتی ہے، لیکن سرد تو ہے۔دو ایک دِن کچھ بوندیں بھی پڑیں، ابر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔[125]

(**121**) خلیق انجم 1989ء، ص 1159 (**122**) خلیق انجم 1989ء، ص 1160 (**123**) خلیق انجم 1989ء، ص 1160 (**124**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 844 فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص 937 (**125**) خلیق انجم 1989ء، ص 1163

تفتہ مجھ سے خفا ہیں۔ حکم تھا کہ 'اس دیوان کا دیباچہ لکھ'۔ مَیں نے کہا، 'صاحب! تم ہر سال ایک دیوان لکھو گے، مَیں دیباچہ کہاں تک لکھا کروں گا'۔ دیباچہ لکھنا کیا آسان ہے، کلیجہ کھر چنا پڑتا ہے۔ نثر کی فکر، نظم سے کم نہیں۔ ایک بار اُن کی خاطر کر دی اور ایک دیباچہ لکھ دیا، سو اس بار بھی اس کا صلہ مجھ کو یہ ملا تھا کہ مجھ کو لکھا کہ 'تُو نے میری ہجوِ ملیح کی ہے'۔ جب مَیں نے لکھا کہ 'بھائی! تم میرے یار ہو، شاگرد کہلاتے ہو۔ لعنت اُس یار پر کہ یار کی ہجوِ ملیح لکھے اور ہزار لعنت اس استاد پر کہ اپنے شاگرد پر چشمک کرے اور اس کی ہجوِ ملیح لکھے'۔ تب کچھ شرمندہ ہو کر چپ ہو رہے تھے۔[126] تفتہ کو مَیں اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو ناز ہے کہ خدا نے مجھ کو ایسا قابل فرزند عطا کیا ہے۔ خدا نے مجھ پر روزہ نماز معاف کر دیا ہے، کیا تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ [کرے گا]۔[127] خدا جانے، مَیں جیتا کیونکر ہوں۔ عید، بقر عید، نوروز کے قصائد دو دو تین تین برس سے بالکل موقوف ہیں۔[128] اَب کے عید میں مَیں نے قصد قصیدے کا نہ کیا، بلکہ قطعہ و رباعی بھی نہیں، اُسی وقت دو تین شعر وہیں لکھ کر پڑھ دیے اور اُن کا مسودہ بھی نہ رکھا۔[129]

OOO

زین العابدین کی ماں [بنیادی بیگم]، یعنی دادی حسین علی خاں کی، 28/ رمضان [1271ھ بمطابق 14/ جون 1855ء] کو مر گئی۔ زین العابدین کا بڑا بیٹا باقر علی خاں [کامل] بھی میرے پاس آ گیا۔ چرخِ ستم گر کیا شعبدہ بازی کر رہا ہے؟ بوجھ پر بوجھ، زخم پر زخم، کچھ بن نہیں آتی۔ آمد وہی، مصارف بڑھ گئے، اگر مثلاً بے مروّتی اور خدا ناترسی کروں تو ان لڑکوں کو کس سے کہوں کہ تُو اپنے لڑکوں کو سنبھال، مجھ میں مقدور نہیں۔ چپ ہوں اور متحیر ہوں، خدا میری شرم رکھے۔[130]

OOO

یکم جولائی سے آج [5/ جولائی 1855ء] تک جھڑی کی صورت ہے۔[131] جدھر دیکھیے، اُدھر دریا ہے۔ شہر میں مکان بہت گرتے ہیں۔ آم اَب کے سال ایسے تباہ ہیں کہ اگر بہ مثل کوئی شخص درخت پر چڑھے اور ٹہنی سے توڑ کر وہیں بیٹھ کر کھائے تو بھی سڑا ہُوا اور گلا ہُوا پائے۔[132]

---

(126) خلیق انجم 1989ء، ص 1161 **(127)** خلیق انجم 1989ء، ص 1162 **(128)** خلیق انجم 1989ء، ص 1161 **(129)** خلیق انجم 1989ء، ص 1163 **(130)** خلیق انجم 1989ء، ص 1163-1164 **(131)** خلیق انجم 1989ء، ص 1164-1165 **(132)** خلیق انجم 1989ء، ص 1165

❍❍❍

قصیدہ لکھنا موقوف؛ موقوف کیا، مجھ سے لکھا ہی نہیں جاتا۔ قطعہ یا رباعی عیدین کو لکھ کر نذر کر دیتا تھا، اَب کے [عید الاضحیٰ پر] حکیم صاحب نے بہت شدت کی اور کہا کہ 'صاحب! یہ تو نذرِ عید نہ ہوئی۔ جیسے معلم لڑکوں کو عیدی کے دو شعر لکھ دیتے ہیں، یہ تو ویسی عیدی ہے'۔ ناچار، مَیں نے مثنوی کی روِش پر چالیس بیالیس بیت لکھ کر نذر کر دی، [ورنہ] کوئی دَم ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو دمِ واپسیں کا خیال نہ ہو۔ زندگی بُری بھلی، جس طرح بنی، کاٹی۔ اَب فکر یہ ہے کہ موت کیسے ہوتی ہے اور بعد موت کے کیا در پیش آتا ہے:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ　　مر گئے پر ، دیکھیے ، دِکھلائیں کیا[133]

عید کی مثنوی صرف روپے بچانے کی تھی، اگر وہ نہ ہوتی تو مجھ کو چار روپے نذر دینے پڑتے۔[134]

❍❍❍

مجھ کو آج دسواں منضج ہے،[135] کل تیسرا مسہل ہو گا۔[136]

سہل تھا مسہل ، ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بِن ہوئے
تین دِن مسہل سے پہلے ، تین دِن مسہل کے بعد
تین مسہل ، تین تبریدیں ، یہ سب کَے دِن ہوئے[137]

❍❍❍

[منظوم تقریظ آئینِ اکبری مصححہٗ (مدوّنہ) سید احمد خاں صدر الصدور مراد آباد]

[چند اشعار کا ترجمہ: آئینِ اکبری کی نسبت سید احمد خاں کی جو رائے ہے، وہ اس کی بلند ہمتی کے لیے باعثِ شرم و عار ہے۔ جس کام کی بنیاد ہی ایسی ہو، ایسے کام کی تعریف وہی کرے گا، جو ریاکار ہو۔ اس کے اس کام پر مَیں آفرین نہیں کہتا، بجائے اس کے کہ اس سے آفرین چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں اس متاع کا خریدار کون ہو سکتا ہے؟ سید احمد خاں کو اس سے کس قسم کے نفع کی امید ہے؟ اگر مجھ سے **آئین**

(**133**) خلیق انجم 1989ء، ص1167 (**134**) خلیق انجم 1989ء، ص1168 (**135**) خلیق انجم 1989ء، ص 981 (**136**) خلیق انجم 1989ء، ص982 (**137**) غالب 1996ء، ص335

کے بارے میں پوچھتے تو مَیں کہتا کہ اس کہن سال دُنیا میں آنکھیں کھول کر دیکھو۔ انگلستان والوں کو دیکھو، ان کا طریقہ اور ان کا انداز سمجھو۔ وہ کیسے کیسے آئین کے موجد ہیں اور کیسی چیزیں لائے ہیں، جن کو پہلے کسی نے نہیں دیکھا۔ ان صاحبانِ ہنر سے زیادہ سے زیادہ ہُنر حاصل کرنا چاہیے اور ان پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ صاحبِ آئین ہونا اس (انگریز) قوم کا حق ہے، کسی اَور کو ان سے بہتر حکومت کرنے کا سلیقہ نہیں۔ انھوں نے عدل اور عقل کو باہم ملا دیا ہے اور ہندوستان کو سیکڑوں طرح کے قوانین سے مالامال کر دیا ہے۔ لوگ تو پتّھر سے آگ نکالتے ہیں، لیکن یہ ہُنر مند تنکے (ماچس کی تیلی) سے آگ پیدا کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے پانی پر ایسا جادُو پڑھا ہے کہ کشتی (سٹیمر) دھویں سے پانی پر چلتی ہے۔ کبھی دھویں سے دریا میں کشتی چلاتے ہیں، کبھی اسی دھویں کی طاقت سے ریل کا انجن چلاتے ہیں۔ دھویں سے کشتی بھی برق رفتاری سے چلتی ہے۔ ہَوا اور لہروں کی طاقت کو انھوں نے بے کار کر دیا ہے۔ تار کو چھیڑے بغیر یہ نغمہ سازی کرتے ہیں اور حروف پرندے کی طرح پرواز کرتے ہیں (گراموفون)۔ تم نے نہیں دیکھا کہ یہ عقل مند لوگ دو لمحوں میں بات سو کوس پر پہنچا دیتے ہیں (ٹیلی گراف)۔ لندن جا کر دیکھو کہ اُس چمکتے باغ جیسے شہر میں رات بھی بغیر کسی چراغ کے کس طرح رَوشن ہے (بجلی کے بلب)۔ ذرا اُن لوگوں کے کاروبار تو دیکھو، ان کے ہر آئین میں سو نئے آئین مضمر ہیں۔ ان کے موجودہ آئین کے سامنے دیگر آئین پرانی جنتریوں کی طرح محض بے کار ہیں۔ جب اس قسم کے علوم و فنون کے خزانے موجود ہوں تو آئینِ اکبری کے بوسیدہ خرمن کی خوشہ چینی کیوں کی جائے؟ خود ہی بتاؤ کہ وہ اَب صرف ایک کہانی کے سوا اَور کیا ہے۔ غالب! خاموش رہنے کا طریقہ خوب صورت ہے، اگر اچھا کہہ رہے ہو، لیکن نہ کہنا بھی بہت اچھا ہے۔] [138]

ooo

[جون 1856ء میں] نہ آگ کی سی گرمی پڑی، نہ لُو چلی اور اَب پانچ چار دِن سے تو خاصی سردی پڑتی ہے کہ اقویارات کو رضائی اور ضعفا لحاف اوڑھتے ہیں۔ ظاہرا کہیں اولے پڑے ہیں،

(138) خاک نشین جوگی (اویس قرنی): بحوالہ www.mukaalma.com/6740

ورنہ اس موسم میں یہ سردی کہاں۔ ابھی جوزا کا آفتاب ہے، دِن بڑھتا جاتا ہے، اس عارضی سردی کے بعد گرمی پڑے گا۔ ان دِنوں میں یہاں شدت امراض کی نہیں، شہر میں امن و امان ہے۔[139]

OOO

باقر علی خاں و حسین علی خاں دِن بھر میں تین چار بار روزہ کھولتے ہیں اور افطار کے وقت روزہ داروں کے حلق کے دربان بن جاتے ہیں۔[140] لڑکے خوش ہیں۔ آم آم کرتے پھرتے ہیں، کوئی اُن کو نہیں دیتا۔ ان کی دادی کو یہ وہم ہے کہ پیٹ بھر روٹی اُن کو کھانے کو نہیں دیتی۔[141]

OOO

[10/ جولائی 1856ء کو بہادُر شاہ کے] ولی عہد [اور میرے شاگرد مرزا فتح الملک غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو رمز دہلوی] کے مرنے سے مجھ پر بڑی مصیبت آئی۔ بس اَب مجھ کو اس سلطنت سے تعلق بادشاہ کے دَم تک ہے۔ خدا جانے، کون ولی عہد ہو گا۔ سرِ دست یہ نقصان کہ وہ زین العابدین کے دونوں بیٹوں کو میوہ کھانے کو دس روپے مہینا دیتے تھے، اَب کون دے گا۔[142]

OOO

ہَوائے وبائی بدستور ہے، لوگ مرتے ہیں، مگر وہ شدت نہیں۔ یک شنبے کے دِن ابر آیا، دِن بھر بوندا باندی رہی، آدھی رات سے زور کا مینہ برسا۔ پیر کے دِن دوپہر تک برابر موسلا دھار پانی پڑا۔[143] دونوں لڑکوں کو تپ آتی ہے۔ بڑے کو اتوار سے کہ آج بدھ، چوتھا دِن ہے؛ چھوٹے کو پیر سے کہ آج تیسرا دِن ہے۔ مغلانی متوفیہ کی جگہ جو مغلانی رکھی تھی، وہ تپ زدہ ہو کر سراسیمہ اپنے گھر گئی۔ میرا ایک خدمت گار غلام حسین نام، تپ میں بے خود پڑا ہے۔[144]

OOO

میرن صاحب نے انتقال کیا۔ یہ چھوٹے بھائی تھے مجتہد العصر کے، نام اُن کا [مولانا] سید حسین اور خطاب سید العلما، نقش نگیں، میر حسین ابنِ علی۔ مَیں نے ان کی رحلت کی ایک تاریخ پائی۔ اُس میں پانچ بڑھتے تھے، یعنی [بجاے 1273ھ کے] 1278ھ ہوتے تھے۔ تخرجہ نئی روِش کا میرے خیال میں آیا:

---

(139) خلیق انجم 1989ء، ص1172 **(140)** ایضاً **(141)** خلیق انجم 1989ء، ص1172-1173 **(142)** خلیق انجم 1989ء، ص1173 **(143)** خلیق انجم 1989ء، ص1174 **(144)** خلیق انجم 1989ء، ص1173-1174

حسین ابنِ علی آبروے علم و عمل　　　　که سید العلما نقش خاتمش بودے
نماند و ماندے اگر زندہ پنج سالِ دگر　　　　'غمِ حسین علی' سالِ ماتمش بودے[145]

OOO

بیس بائیس دِن سے حضور والا [بہادُر شاہ ظفر] روز دربار کرتے ہیں۔ آٹھ نو بجے جاتا ہوں، بارہ بجے آتا ہوں۔ یا روٹی کھانے میں ظہر کی اذان ہوتی ہے یا ہاتھ دھونے میں۔ سب ملازمین کا حال یہی ہے اور کوئی روٹی کھا کر جاتا ہو گا، مجھ سے بعد کھانا کھانے کے چلا نہیں جاتا۔ یہ تو جو کچھ تھا، سو تھا، پرسوں سے ازراہِ عنایت حکم دیا ہے کہ شام کو رہتے میں لبِ دریا پتنگ بازی ہوتی ہے، تُو بھی سلیم گڑھ پر آیا کر، [چنانچہ مَیں] صبح کو جاتا ہوں، دوپہر کو آتا ہوں؛ کھانا کھا کر پانچ چار گھڑی دَم لے کر جاتا ہوں، چراغ جلے آتا ہوں، رات کو مزدوروں کی طرح تھک کر پڑ رہتا ہوں۔[146]

OOO

خداوندِ سلطنت دانش [نواب محمد یوسُف علی خاں ناظم، والی رامپور] نے امیر الدولہ مولوی حافظ محمد فضل حق خاں بہادُر کے ذریعے اس فرماں بردار کو حکم بھیجا کہ 'اے غالب! عبودیت کے لیے کمر کس لے اور محبوبانِ افکار کی آرائش میں حقِ خدمت کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ ہو جا' (تو) اس اندیشۂ محبت کیش [غالب] نے (تعمیل میں) کوئی تامل نہیں کیا۔ توقع ہے کہ مَیں [نواب صاحب] کے پیش خدمتوں اور ریاستوں کے دعا گوؤں میں شمار کیا جاؤں گا۔[147]

OOO

بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ [ہجری تقویم کے مطابق] باسٹھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس اسی شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اَب جسم و جاں میں تاب و تواں نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف؛ اردو، سو اس میں بھی عبارت آرائی متروک؛ جو زبان پر آوے، وہ قلم سے نکلے۔ پاؤں رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر۔ ہم کس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں، کسی فیض رسانی اور قدر دانی کو کیا روئیں؟ اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں۔[148]

OOO

(**145**) خلیق انجم 1989ء، ص985 (**146**) خلیق انجم 1989ء، ص1175 (**147**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص 844-845۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص937-938 (**148**) خلیق انجم 1995ء، ص1415-1416

تباہیِ اودھ نے مجھ کو اَور بھی افسردہ دِل کر دیا، بلکہ مَیں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہلِ ہند، جو افسردہ دِل نہ ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔[149]

○○○

کل کہ 11/ فروری 1857ء، شام کے وقت ڈاک کا ہرکارہ [نواب رامپور] کا نوازش نامہ لے آیا۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے لگایا، لختِ ہائے جان اس پر نچھاور کیے۔ اَب جو لفافہ کھولا تو اس میں [ان] کے اشعارِ آبدار پر مبنی دو اَوراق کے ساتھ دو سو پچاس روپے کی ایک ہنڈوی بھی نکلی۔ یہ اشعار میرے لیے ایک دستاویز قرار پائے اور ہنڈوی کی وصول عمل میں لائی گئی۔ (یوں تو) اہلِ کرم نمک سے بندہ پروری کرتے ہیں، لیکن [نواب رامپور] جیسے منعم کا دستور شکر سے پرورش کرنے کا ہے۔[150] [اصلاح کے بعد] غزلوں کے مسودات کو صاف کر کر حضور [نواب سید محمد یوسُف علی خاں] میں بھیجتا ہوں۔ مسودات اپنے پاس رہنے دیے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جائے تو مَیں پھر اس کو صاف کر کر بھیج دوں، ورنہ موقع حک و اصلاح مجھے کیا یاد رہے گا۔[151]

○○○

مَیں بوڑھا اور کمزور، نیز گوشہ تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کا عادی، اس کے ساتھ ساتھ بہرے پن کی وجہ سے بارِ خاطرِ حاضرین۔ کوئی بات کر رہا ہے اور مَیں اس کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر جمائے ہوئے ہُوں۔ مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا۔ اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تو کچھ دیر حاضرِ خدمت رہتا، ورنہ دیوانِ خاص میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آتا۔[152]

❑❑❑

---

(149) خلیق انجم 1995ء، ص1416 **(150)** پرتو روہیلہ 2015ء، ص845 فارسی متن: حوالہ مذکورہ، ص938

(151) خلیق انجم 1989ء، ص1179 **(152)** غالب 2000ء، ص19-20۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص5

(7)

نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا

(1857ء-1858ء)

16/رمضان 1273ھ کو پیر کے دِن دوپہر کے وقت مطابق 11/مئی 1857ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اُٹھیں، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا۔ اُس دِن، میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے۔ نہایت ظالم و مفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے۔ شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ، جو اِن فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے، کچھ تعجب نہیں کہ پہلے ہی سے ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہو گئی ہو، شہر کی حفاظت کی ذمہ داری اور حقِ نمک [سمیت] ہر چیز کو بھول گئے۔ ان بن بلائے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ ان مدہوش سواروں اور اَکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہیں، دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دَوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے، جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا، اُدھر سے رُخ نہیں پھرا۔ کچھ مسکین، گوشہ نشین، جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان و نمک میسر تھا، جن کے ہاتھ تیر و تلوار سے خالی تھے، اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر ہر شخص غمگین و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا۔ انھی غمزدوں میں سے ایک مَیں بھی تھا۔ مَیں اپنے گھر میں بیٹھا ہُوا تھا کہ شور و غوغا سنا۔ چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرونِ قلعہ صاحب ایجنٹ بہادُر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے۔ ہر طرف پیادوں اور سواروں کے دَوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گُل اندام (انگریزوں) کے خون

سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہَ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔ افسوس! وہ پیکرِ علم و حکمت، انصاف سکھانے والے، خوش اخلاق و نیک نام حاکم اور صد افسوس! وہ پری چہرہ نازُک بدن خاتونیں، حیف! وہ بچے، سب ایک دَم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحر فنا میں) ڈوب گئے۔ (فنا کی) چنگاریاں برسانے والی موت اگر ان مقتولین کے سرھانے آہ و زاری کرے اور اس غم میں سیاہ پوش ہو جائے تو رَوا ہے۔ اگر آسمان (اس غم میں) غبار کی طرح منتشر ہو جائے اور زمین گردباد کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دے تو بجا ہے۔[1]

OOO

خدا خدا کر کے وہ منحوس دِن ختم ہُوا، ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان سیاہ باطنوں اور بے رحم قاتلوں نے شہر میں جابجا پڑاو ڈالا، اندرونِ قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمنِ سلطانی کو خواب گاہ۔ رفتہ رفتہ دُور دُور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہر چھاؤنی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے۔ گروہ کے گروہ، خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار، سب یک دِل ہو گئے اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر دُور و نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لیے کمربستہ ہو گئے۔[2] توپیں، گولہ بارُود، چھرّے، غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا، لڑائی کے سارے طریقے انگریزوں سے سیکھے اور انھی سکھانے والوں اور مالکوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دِل لوہے یا پتّھر کا ٹکڑا نہیں ہے، کیسے نہ بھر آئے؟ آنکھیں رخنہَ دیوار نہیں ہیں کہ آنسو نہ بہائیں۔ حکمرانوں کی موت کا غم منانا چاہیے اور ہندوستان کی ویرانی پر رونا چاہیے۔[3] (زمانے کی اس) بے نیازی و بے امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم رُتبہ لوگ، جو سارا دِن مٹّی بیچنے کے لیے زمین کھودتے تھے، ان کو مَٹّی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں آتشِ گُل سے چراغ رَوشن رہتے تھے، اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں۔[4] بڑے بڑے عالموں اور ناموروں کی آبرو مَٹّی میں ملا دی گئی ہے اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی، نہ عزت، وہ بے اندازہ زر و جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں؛ جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا، وہ

---

(1) غالب 2000ء، ص 23۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 5-7 (2) غالب 2000ء، ص 23-24۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 7 (3) غالب 2000ء، ص 25۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 8 (4) ایضاً

ہَوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے؛ جن کی ماں پڑوس سے آگ مانگ کر لاتی تھی، وہ آگ پر حکم چلانے کا مدعی ہے [اور] کمین آگ اور ہَوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہم اُن پریشان حال لوگوں میں سے ہیں، جو صرف سکون و آسائش کے چند لمحوں اور انصاف کے خواہش مند ہیں۔[5]

OOO

اگرچہ 11/ مئی سے 14/ ستمبر تک چار مہینے چار دِن کا وقفہ ہے، لیکن اس بنا پر کہ پیر کے دِن شہر (انگریزوں کے) ہاتھ سے نکلا تھا اور پیر ہی کے دِن قبضے میں آیا، کہہ سکتے ہیں کہ شہر کا ہاتھ سے نکل جانا اور پھر قبضے میں آ جانا، یہ دونوں کام ایک ہی دِن ہوئے۔ [انگریز] فاتحین نے راستے میں جس شخص کو پایا، قتل کر دیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحبِ عزت افراد عزت و آبرو کی دولت کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔ شہر میں بدباطن (باغیوں) کی فوج میں سے کچھ لوگوں نے بھاگ جانے کی ٹھان لی اور کچھ لوگوں نے غرور میں آ کر لڑنے کی تیاری کی۔ خبیث اور آوارہ لوگوں کا یہ گروہ، شیر دِل فاتحین سے الجھ پڑا۔ یہ [باغی] لوگ اپنے خیال میں تو [انگریز] دشمنوں کو قتل کر رہے تھے، لیکن میرے خیال میں وہ شہر کی عزت و آبرو کو برباد کر رہے تھے۔ دو تین دِن تک کشمیری دروازے سے لے کر چوک تک تمام راستے میدانِ جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ، ترکمان دروازہ، اجمیری دروازہ، یہ اس فوج کے قبضے میں رہ گئے۔ مجھ مُردہ دِل کا غم کدہ وسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں دروازوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگرچہ گلی کا دروازہ بند کر لیا گیا تھا، لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔[6]

غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سر و ساماں لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ اس غصے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے مُنھ فق ہو گئے، [چنانچہ] بے شمار مرد عورتوں کے گروہ، جن میں لوگ بھی تھے اور صاحبِ حیثیت بھی، ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے [اور] شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے، ان میں پناہ گزیں ہو

---

(5) غالب 2000ء، ص26-27۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص9 (6) غالب 2000ء، ص36-37۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص14-15

گئے۔ میرے دِل پر نہ خوف و دہشت کا اثر ہُوا اور نہ پائے استقلال کو جنبش ہوئی۔ مَیں نے کہا کہ مَیں گنہگار تو ہوں نہیں کہ سزا پاؤں۔ انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے اور شہر کی آب و ہَوا ناساز گار نہیں ہے، مجھے کیا پڑی ہے کہ ان بدخیالیوں کو دِل میں جگہ دوں اور اِدھر اُدھر بھاگتا پھروں۔ مکان کے ایک گوشے میں بے سروسامانی کے ساتھ بیٹھا ہُوا ہوں۔ (اس تنہائی میں) قلم میرا رفیق ہے، آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم سے دردناک الفاظ ٹپکتے ہیں۔[7]

OOO

ازل کا لکھا ہُوا بدل نہیں سکتا۔ ازل میں قسمتیں لکھی جا چکی ہیں، ہر ایک کو نوشتۂ قسمت کے مطابق سروساماں عطا کیا گیا ہے، مصیبتیں اور راحتیں اسی حکمِ ازل کا نتیجہ ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بے دِلی و بے جگری کو چھوڑ کر، جس طرح بچے ہر تماشے کو خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں، ہر لحہ تغیر پذیر زمانے کی حیرت فزا نیرنگیوں کو اس بڑھاپے میں خوشی کے ساتھ دیکھتا رہوں۔ جمعہ کے دن، محرم کی چھبیس تھی اور ستمبر کی اٹھارہ، گمراہ باغی اندرون و بیرونِ شہر سے خنزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ کشت و خون اور پکڑ دھکڑ [ہماری] اس گلی تک آ گئی۔ خوف سے لوگوں کے دِل دہل گئے۔ اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف ہے۔ گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ چلے گئے، عورتیں بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھیں اور مردوں کے سروں پر سامان کی گٹھریاں تھیں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے، ہم سب نے مل کر گلی کا دروازہ بند کر لیا۔ [اتفاقاً] مصیبت سے میں کام بننے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ راجا نرندر سنگھ بہادُر، فرمانروائے پٹیالہ اس جنگ میں (انگریز) فاتحین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزی لشکر کی مددگار ہے۔ راجا کے چند ملازمینِ خاص [یعنی حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں، حکیم غلام اللّٰہ خاں] شہر کے نامور اور معزز لوگوں میں سے ہیں، اس کوچے میں رہتے ہیں۔ چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی، راجا نے ازراہِ بندہ پروری (انگریزوں سے) طے کر لیا تھا کہ جب (شہر) فتح ہو گا، اس گلی کے دروازے پر محافظ مقرر کر دیے جائیں گے، تاکہ انگریز فوجی گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔[8]

---

(7) غالب 2000ء، ص 38-39۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 15-15 (8) غالب 2000ء، ص 39-41۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 16-17

گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان تھا، رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ پانی آخر کار کوزے یا گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ کسی میں برداشت کی طاقت نہیں رہی، صبر کے ساتھ دِن گزارنے اور سامانِ خوردونوش حاصل کرنے کا فریب دینے کا وقت بھی گزر گیا، [غرض] دو شبانہ روز سب بھوکے پیاسے رہے۔ تیسرے دِن مہاراجا (پٹیالہ) کی فوج کے سپاہی آ گئے اور [گلی کے باہر] پہرہ دینے لگے [اور یوں] گلی کے رہنے والوں نے لوٹ مار کرنے والوں کے خوف سے نجات پائی۔ پہرے داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی، کہا گیا کہ چوک کے بازار تک جاسکتے ہیں، چوک کے آگے قتل وخون کا بازار گرم ہے اور راستہ پُر خطر ہے۔ مجبور و پریشاں حال لوگوں نے دروازہ کھول دیا۔ بہشتی یا مشک کا ملنا ناممکن تھا، اس لیے ہر گھر سے ایک مرد اور میرے ملازمین سے دو شخص گئے۔ میٹھا پانی دُور تھا اور (اتنی) دُور جا نہیں سکتے تھے، مجبوراً نیم شور پانی مٹکوں اور گھڑوں میں بھر لائے، اس طرح اس نمکین پانی سے وہ آگ بجھی، جس کا دوسرا نام پیاس ہے۔ باہر جانے اور پانی لانے والے کہتے ہیں کہ اس گلی سے آگے سپاہیوں نے کچھ مکانوں کے دروازے توڑ ڈالے۔ (ان گھروں میں) نہ تو بورے میں آٹا ملا، نہ برتن میں روغن۔[9]

ہم لوگ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ تو کوئی آتا ہے کہ بات سننے کو ملے، نہ خود باہر جا (سکتے) ہیں کہ اپنی آنکھوں سے سارے واقعات دیکھیں۔ اس کشمکش کے علاوہ نہ کھانے کو روٹی ہے، نہ پینے کو پانی۔ ایک دِن اچانک بادل آ گیا، پانی برسا، ہم نے (صحن میں) ایک چادر باندھ لی اور ایک مٹکا اس کے نیچے رکھ دیا اور (اس طرح) پانی حاصل کیا۔[10]

○○○

وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے معاملاتِ مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اُسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے دوست دِلی تھے اور منشی نبی بخش اُن کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص؛ نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ مَیں جس شہر میں ہوں، اُس کا نام

(**9**) غالب 2000ء، ص42-43۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص18 (**10**) غالب 2000ء، ص44۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص19

بھی دلّی اور اُس محلے کا نام بَلّی ماروں کا محلہ ہے؛ لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ، ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا؛ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں، ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں۔ امیر غریب سب نکل گئے؛ جو رہ گئے، وہ نکالے گئے۔ جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ؛ کوئی بھی نہیں ہے۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پُرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں؛ مگر وہ نوکر، جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ مَیں غریب شاعر دس دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہُوا ہوں، اِس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں مَیں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر، شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے؛ چونکہ بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، طلبی نہیں ہوئی؛ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیر دار بلائے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔[11]

OOO

اس سے پہلے صرف بیوی تھی؛ نہ کوئی لڑکا تھا، نہ لڑکی۔ تقریباً پانچ سال ہوئے کہ مَیں نے اپنی بیوی کے خاندان کے دو یتیم بچوں کو لے کر پال لیا ہے۔ ان شیریں زباں بچوں سے مجھ کو بے انتہا محبت ہے۔ اس عالمِ بے چارگی میں (بچے) میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن و گریباں کے پھول۔ وہ دونوں ناز پروردہ بچے پھل، مٹھائی مانگتے ہیں، لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں۔ افسوس، افسوس! جب تک زندہ ہوں، روٹی اور پانی کی فکر رہے گی اور مرنے کے بعد کفن دفن کی۔ بھائی [مرزا یوسُف] دو سال مجھ سے چھوٹا ہے، تیس برس سے نہ کسی کو ستاتا ہے، نہ شور و غوغا کرتا ہے۔ اس کا مکان میرے گھر سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں نے بچوں اور کنیزوں کے ساتھ بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ گھر کے فاترالعقل مالک [مرزا یوسُف] اور سارے سامان کو ایک بوڑھے دربان اور ایک بڑھیا کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا۔ اگر مَیں جادُو جانتا ہوتا، تب بھی (ان حالات میں) کسی کو بھیج کر ان تینوں آدمیوں کو نہ بلوا سکتا تھا، نہ سامان منگوا سکتا تھا۔ یہ بہت بڑا غم ہے اور میرے دِل پر اس کا بہت اثر ہے۔ مَیں اس فکر میں

---

(11) خلیق انجم 2008ء، ص 266-268

رہتا ہوں کہ بھائی نے دِن میں کیا کھایا اور رات میں کیسے سویا اور (حالات سے) ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ (بھائی) زندہ بھی ہے یا مصیبتیں (اٹھاتے اٹھاتے) مر گیا۔[12]

OOO

وہی بالا خانہ ہے اور وہی مَیں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسُف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسُف علی خاں آئے۔ مَرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللّٰہ اللّٰہ اللّٰہ۔ ہزاروں کا مَیں ماتم دار ہوں، مَیں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟[13]

ستمبر کی اکیسویں تاریخ کو بدھ کے روز شہر کی فتح اور گلی کا دروازہ بند کرنے کے سترھویں دِن لوگ خبر لائے کہ لوٹ مار کرنے والے، بھائی [میرزا یوسُف] کے گھر پر چڑھ دَوڑے۔ گلی اور گھر میں لوٹ مار کی، دیوانے مرزا یوسُف خاں اور دونوں بڑھیا بڈھوں کو زندہ چھوڑ دیا۔ اس بھاگڑ میں دو ہندو کہیں سے آکر (گھر میں) پناہ گزیں ہو گئے۔ بوڑھے دربان اور بڑھیا کنیز دونوں نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوچے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے، اسی طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں بھی سب سپاہیوں کا انداز ایک نہیں ہے۔ اگر کوئی (سپاہی) رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے تو یہ ذاتی رحم دِلی اور سنگ دِلی کا نتیجہ ہے۔[14]

5/ اکتوبر [1857ء] کو دوپہر کے وقت اچانک چند گورے اس دیوار پر چڑھ گئے، جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی ہے۔ (وہاں سے) ایک چھت پر (اور چھت سے) کود کر گلی میں آ گئے۔ راجا نرندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا (کچھ) مفید نہیں ہُوا۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے گھر میں (گھس) آئے۔ [اگرچہ] بھل منسی سے سامان [وغیرہ] کو ہاتھ نہیں لگایا، [البتہ] مجھ کو ان دونوں بچوں، دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند دانشور کرنل براؤن کے پاس لے گئے، جو

(**12**) غالب 2000ء، ص 46-47۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 20-21 (**13**) خلیق انجم 1990ء، ص 762 (**14**) غالب 2000ء، ص 51۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 23

چوک سے اسی طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے۔ (کرنل براؤن نے) مجھ سے بہت نرمی و انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا [اور] خوش اسلوبی کے ساتھ اُسی وقت رخصت کر دیا۔ مَیں نے خدا کا شکر ادا کیا۔[15] اُس دِن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا یا دُور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہو۔ مَیں مر چکا ہوں، مجھ کو بازپرس کے لیے اٹھایا گیا اور جزاے اعمالِ بد کے نتیجے میں دوزخ کے کنویں میں لٹکا دیا گیا ہے، مجبوراً اس قید میں بے چارگی و پریشانی کے ساتھ ہمیشہ جینا پڑے گا۔[16]

OOO

[29/ صفر 1274ھ بمطابق] 19/ اکتوبر [1857ء] کو پیر کے دن، صبح کے وقت کم بخت دربان، بھائی [مرزا یوسُف] کے مرنے کی خبر لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہِ فنا پانچ دِن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اِس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ پانی، رومال، غسّال، گورکن، اینٹ چونے گارے وغیرہ کا ذکر [کیا، مسئلہ تو یہ تھا] کہ مَیں کیسے جاؤں اور (میت کو) کہاں لے جاؤں؟ کس قبرستان میں سپردِ خاک کروں؟ بازار میں اچھا بُرا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مُردوں کو دریا کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں، (لیکن) مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں، چہ جائیکہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔ پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور (اس) کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیالہ کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا، دو تین [سفید] چادریں (گھر) سے لے گئے تھے، ان میں لپیٹا اور [تہور خاں کی] مسجد میں، جو مکان کے برابر تھی، زمین کھودی، (قبر بنائی،) میت کو اس گڑھے میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔ یہ نیک سرشت، لیکن بدقسمت شخص، جس نے زندگی کے ساٹھ سال خوش و ناخوش گزارے۔ تیس سال ہوش مندی کے ساتھ اور تیس سال دیوانگی کے عالم میں۔ زمانۂ ہوش مندی میں غصہ ضبط کرنا اور عالمِ دیوانگی میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا:

---

(15) غالب 2000ء، ص54۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص24-25 (16) غالب 2000ء، ص56-57۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص26

ز سالِ مرگ ستم دیدہ میرزا یوسُف — کہ زیستے بجہاں در ز خویش بیگانہ
یکے در انجمن از من ہمے پژدہش کرد — کشیدم آہے و گفتم 'دریغ دیوانہ'

[ایک شخص نے مجھ سے ستم نصیب مرزا یوسُف، جس نے اس دُنیا میں اپنے سے
بیگانہ ہو کر زندگی گزاری، کی تاریخ (وفات) پوچھی۔ مَیں نے ایک آہ کھینچی اور کہا،
دریغ دیوانہ (1274ھ)۔][17]

OOO

اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون، جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں، جرنیلی بندوبست 11/ مئی سے آج تک، یعنی شنبہ 5/ دسمبر 1857ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ [خدا جانے،] انجامِ کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا، ابھی دیکھا چاہیے، مسلمانوں کی آبادی کو حکم ہوتا ہے یا نہیں۔[18]

OOO

میرا ایک سبہی بھائی ہے، نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا؛ چنانچہ مجموعہ نثر اور کلیاتِ نظمِ فارسی اور کلیاتِ نظمِ اردو سب نسخے اُس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتب خانہ بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہو گا، لُٹ گیا، ایک ورق نہیں رہا۔[19]

OOO

حقیقتِ حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اَب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں، کسی محکمے میں ابھی تک بلایا نہیں گیا، معرضِ باز پُرس میں نہیں آیا۔[20] میرا تعلق بہادُر شاہ سے صرف اسی قدر تھا کہ سات آٹھ سال سلاطین تیموریہ کی تاریخ نویسی اور دو تین سال بادشاہ کے اشعار کی اصلاح میں مصروف رہا۔ اس ہنگامے میں مَیں نے کنارہ کشی اختیار کی اور اس خوف

---

(17) غالب 2000ء، ص58-60۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص26-28۔ مرزا یوسُف ایک انگریز کی گولی سے جاں بحق ہوئے تھے۔ **(18)** خلیق انجم 2008ء، ص268 **(19)** خلیق انجم 1989ء، ص1020 **(20)** خلیق انجم 1990ء، ص623

سے کہ اگر قطعاً ترکِ تعلق کرتا ہوں تو خدانخواستہ میرا گھربار برباد ہو جائے اور میری جان بھی ہلاکت میں پڑے، اندرونی طور پر بیگانہ اور ظاہراً آشنا رہا۔ جب شہر دہلی پر انگریز فوج کا قبضہ ہو گیا تو تمام جاگیر دار اور پنشن دار شہر سے نکل گئے، چنانچہ وہ سب تاحال جنگلوں اور پہاڑوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ مَیں اپنی جگہ سے نہ ہلا اور اسی طرح ایک گوشہ پکڑے بیٹھا رہا۔ اَب اس (حالیہ) بندوبست میں کہ جو خاص طور پر مجرموں کی سزا دہی کے لیے ہے اور تحقیقاتِ جرم بھی قلعے کے دفتر اور مخبروں کی شہادتوں پر کی جا رہی ہے، کسی طرح بھی میرا دامن آلودہ نہیں پایا گیا اور نہ ہی کسی قسم کی پکڑ دھکڑ اور تحقیق و تفتیش کا سامنا ہُوا۔ حکام دلّی میں میری موجودگی سے آگاہ ہیں۔ اَب چونکہ کسی قسم کی باز پرس نہیں ہو رہی، اس لیے لامحالہ محفوظ ہوں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مَیں خود ہی پیش قدمی کرتا اور حکام سے ملاقات کرتا، لیکن اس ضمن میں مضائقہ یہ ہے کہ موجودہ حکام میں کسی سے میری شناسائی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ابھی اس بات کا بھی موقع محل نظر نہیں آتا کہ مَیں کسی سے ملاقات کی خواہش کروں۔ حق تو یہ ہے کہ فتنہ آشوب میں مَیں نے (حکومتِ وقت کی) کوئی خدمت نہیں کی، لیکن مقامِ شکر ہے کہ میری یہ کوتاہی حقیقت میں میری بے دست و پائی کے سبب ہے اور میری بے گناہی ہی میری نقد خلوص و اخلاص کا وسیلہ ہے۔[21]

OOO

مسلمانوں کے میلوں کا ہُوا قُل — پُجے ہے جوگ مایا اور دیہی

نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا — مگر ، ہاں ، نام کو اورنگ زیبی[22]

جنوری 1858ء کے آغاز میں ہندوؤں کو فرمانِ آزادی مل گیا اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ [ہندو] لوگ جہاں جہاں تھے، شہر کی طرف چل پڑے؛ خانماں برباد مسلمانوں کے [خالی] گھروں میں سبزہ اس قدر اُگ آیا ہے کہ در و دیوار سبز ہیں۔ ہر لحظہ سبزۂ سرِ دیوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ (بدستور) خالی ہے۔[23]

بسکہ فعالِ ما یُرید ہے آج — ہر سِلحَشور انگلستاں کا

(21) پرتوروہیلہ 2015ء، ص846-847۔ فارسی متن: حوالۂ مذکورہ، ص939 (22) غالب 1996ء، ص346

(23) غالب 2000ء، ص66۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص31-32

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے　　زہرہ ہوتا ہے آب ، انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زِنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک　　آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
مَیں نے مانا کہ مل گئے ، پھر کیا　　وہی رونا تن و دِل و جاں کا
گاہ جل کر کِیا کیے شکوہ　　سوزشِ داغ ہاے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم　　ماجرا دیدہ ہاے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے، یارَب!　　کیا مٹے دِل سے داغ ہجراں کا[24]

مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے، پھر مَیں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے۔[25]

 OOO

دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا، کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی، حکامِ وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں؛ فراری نہیں ہوں، رُوپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، داروگیر سے محفوظ ہوں۔ مئی سے پنشن نہیں پایا، یہ نو دس مہینے کیونکر گزرے ہوں گے، انجام کچھ نظر آتا نہیں کہ کیا ہو گا؟ زندہ ہوں، مگر زندگی وبال ہے۔[26]

OOO

بدھ کا دِن، تیسری فروری [1858ء] کی، ڈیڑھ بجے دِن باقی رہے، ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط مع رجسٹری لایا۔ خط کھولا، سو روپے کی ہنڈوی، بل؛ جو کچھ کہیے، وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مہری لے کر نیل کے کٹرے چلا گیا، سو روپیہ چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس! چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اُٹھے تھے، وہ دیے گئے؛ پچاس روپے محل میں بھیج دیے، چھبیس روپے باقی رہے، وہ بکس میں رکھ لیے۔[27]

(**24**) خلیق انجم 2008ء، ص 363-364 (**25**) حالی 1897ء، ص 75 (**26**) خلیق انجم 2008ء، ص 268-269 (**27**) خلیق انجم 2008ء، ص 269

کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا، یہاں جان کے لالے پڑے ہیں :

ہے موجزن اِک قلزمِ خوں، کاش! یہی ہو
آتا ہے، ابھی دیکھیے ، کیا کیا مِرے آگے[28]

بُری آ بنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔[29] اگر جیتے رہے اور [دوستوں سے] ملنا نصیب ہُوا تو [سب احوال] کہا جائے گا، ورنہ قصہ مختصر، قصہ تمام ہُوا۔[30]

OOO

ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور ہے، ایک کو تنہائی منظور۔ تاہل میری موت ہے، مَیں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی، اگرچہ مجھ کو دولت میسر آجاتی، لیکن اس تنہائیِ چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی؟ خدا نے لاولد رکھا تھا، شکر بجالاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا، یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے؛ یعنی جس لوہے کا طوق، اسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں۔ خیر، اس کا کیا رونا ہے، یہ قید جاوِدانی ہے۔[31]

OOO

5/ فروری کو حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں اور ان کے بھتیجے عبدالحکیم خاں عرف حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ 12/ فروری کو جمعہ کے دِن چند دوسرے اشخاص اور 13/ فروری کو سنیچر کے دِن تین شخص اَور واپس آ گئے، (لیکن) نصف سے زیادہ حوالات میں رہ گئے۔ یہ مصیبت، جو پڑوس میں نازل ہوئی اور ہنگامہ، جو گلی میں برپا ہُوا، (اس کی وجہ سے) مجھ درویشِ غمزدہ کا دِل بھی قابو میں نہیں۔ اس کے باوجود کہ اس داروگیر میں مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، ابھی تک (یہ عالم ہے) کہ دِن بھر متفکر رہتا ہوں اور رات میں آرام کی نیند نہیں ہو پاتا۔[32]

جناب حکیم [احسن اللہ خاں] صاحب ایک روز ازراہِ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوں کہ ان کے دیکھنے سے دِل کیا خوش ہُوا ہے، خدا ان کو زندہ رکھے۔ مصطفیٰ خاں، خدا کرے، مرافعے میں

---

(28) خلیق انجم 1990ء، ص 491 **(29)** خلیق انجم 2008ء، ص 269 **(30)** خلیق انجم 1990ء، ص 693 **(31)** خلیق انجم 1990ء، ص 626 **(32)** غالب 2000ء، ص 67۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 32

چھوٹ جائے، ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اُس ناز پرورد میں کہاں؟ احمد حسین میکش کا حال، مخنوق ہُوا، گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔[33]

OOO

حاکمِ مہرباں، خورشید طلعت، ستارہ حشم سر جان لارنس صاحب، چیف کمشنر بہادُر [ایگزیٹو برانچ] کے آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ چونکہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم ہندوستان، خصوصاً اس شہر میں آئیں، ان کی مدح میں قصیدہ بھیجا جائے۔ اس بنا پر اس والا شکوہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا، جو تہنیتِ فتح اور خیر مقدمِ نوروز پر مشتمل تھا، 19/ فروری کو بذریعہ ڈاک بھیجا۔[34] 24/ فروری ایک پہر چڑھے باغِ انصاف کے سروِ آزاد، آسمانِ رفعت کے ماہِ تابندہ، فرخ طلعت، فرخندہ سیرت، چیف کمشنر بہادُر نے اپنے توسن کے سموں کے نشانات سے دہلی کی سرزمین کو آسمان کی طرح ستارہ زار بنا دیا اور تیرہ توپوں کی (سلامی) نے خستہ دلوں کو مرہمِ مہر و محبت کی بشارت دی۔[35]

OOO

پنشن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بشرطِ اجرا بھی میرا کیا گزارہ ہو گا؟ ہاں، دو باتیں ہیں؛ ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے، دوسرے یہ کہ موافق قولِ عوام چولھے دلدّر نہ ہو گا۔ اگر مَیں تنہا ہوتا تو اس وجہِ قلیل میں کیسا فارغ البال اور خوش حال رہتا۔ یہ بھی خبط ہے، جو مَیں کہہ رہا ہوں؛ خدا جانے، پنشن جاری ہو گا یا نہ ہو گا۔ احتمالِ تعیش و تنعم بشرطِ تجرید، صورتِ اجراے پنشن میں سوچتا ہوں اور وہ موہوم ہے۔[36]

OOO

حاکمِ اکبر نے آکر کوئی نیا بندوبست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب میرے آشناے قدیم ہیں، مگر مَیں مل نہیں سکتا؛ خط بھیج دیا ہے، ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔[37]

میرا شہر میں رہنا بہ اجازتِ سرکار کے نہیں اور باہر نکلنا بے ٹکٹ ممکن نہیں۔[38] مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا۔[39]

---

(33) خلیق انجم 1990ء، ص626 **(34)** غالب 2000ء، ص68۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص32-33
(35) غالب 2000ء، ص69۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص33 **(36)** خلیق انجم 1990ء، ص626-627
(37) خلیق انجم 2008ء، ص270 **(38)** خلیق انجم 1990ء، ص627 **(39)** خلیق انجم 2008ء، ص270

اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرونِ شہر۔ ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے، ان کی تعداد فرشتۂ موت ہی جانتا ہے۔[40]

شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں، مَیں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ اِس قدر دُور نکل گئے، گویا وہ اس سرزمین کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دو دو چار چار کوس پر ٹیلوں، گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں۔ اس ویرانہ نشین گروہ میں یا تو وہ لوگ ہیں، جو شہر میں رہنے کے خواہش مند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے رشتہ دار یا پنشن دار۔ لوگوں کی درخواستوں میں رہائی، آبادی یا اجراے پنشن کے علاوہ اَور کوئی (مضمون) نہیں۔ داد خواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ گئی ہیں۔ یہ انصاف طلب چشم براہ اور گوش بر آواز ہیں کہ کیا سننے اور دیکھنے میں آتا ہے۔ مَیں بھی اُس نیاز نامے اور ستائش نامے کے جواب کا منتظر ہوں، جس کو مَیں نے بذریعہ ڈاک بھیجا تھا۔[41]

مختلف خیالاتِ پریشاں کے سبب سے حاکم کی جاے قیام پر جانے اور ملاقات کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے۔ یہ ایسی مصیبتیں ہیں، گویا (ہر طرف) کانٹے ہی کانٹے ہیں، (کسی طرح سکون نہیں ہے)۔ 17/ مارچ کو، فرمانروا کے حضور سے پہلی خواہش کے بارے میں حکم صادر ہُوا کہ 'یہ خط، جس میں تہنیت کے سوا کچھ نہیں، اس کے بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے'۔ مَیں نے بھی سوچا کہ ایسے پُر آشوب حالات میں مہر و محبت اور مسرت و انبساط کی کیا گنجائش! مَیں تو بندۂ شکم ہوں، مجھ کو تو روٹی چاہیے۔ دیکھوں تو اس دوسری خواہش کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔[42]

○○○

عرضی میری سر جان لارنس، چیف کمشنر بہادُر کو گزری، اُس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کواغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیج دی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش

(**40**) غالب 2000ء، ص 70۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 34 (**41**) غالب 2000ء، ص 70-71۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 34 (**42**) غالب 2000ء، ص 71-73۔ فارسی متن: غالب 1969ء، ص 34-35

کرو۔ اَب سر رشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہُوا، وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ مَیں نے خط صاحب کمشنر دہلی، چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اُس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنشن کی کیفیت لکھو۔ اَب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اُس حکم کی نہیں کی۔ بہر حال، یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور مَیں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے، یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کا لگاؤ نہ تھا۔ بدائت تو اچھی ہے، نہایت بھی خدا اچھی کرے۔ وہ عزت اور وہ ربط و ضبط، جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اَب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ گورنری کلکتہ اور گورنری آگرہ اور ایجنٹی و کمشنری و دیوانی و فوجداری و کلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہُوا ہے، مشتمل اُس حکم پر خط میرے نام آیا ہے۔ حاکم نے اَب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جاوے کہ یوں کرو۔ عملے نے خط نہ لکھا، صرف وہ عرضی چڑھی ہوئی بھیج دی۔[43]

○○○

نواب [سید محمد یوسُف علی خاں] صاحب میرے محسن اور میرے قدر دان اور میری امید گاہ ہیں۔ مَیں رامپور نہ [جاؤں] تو کہاں جاؤں گا۔ وجہ توقف کی یہ کہ مَیں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادُر کو درخواست دی، مگر تا صدورِ حکم، مَیں یہاں سے کہیں جا نہیں سکتا، مگر حیران ہوں کہ جب تک یہاں رہوں، کھاؤں کیا اور جب چلنے کا قصد ہو تو رامپور کس طرح پہنچوں؟[44]

○○○

یہ [مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب] نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ اشعار، جو [ثاقب] نے بھیجے ہیں، خدا جانے، کس ولد الزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے، متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیے پر ہوں تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر

---

(43) خلیق انجم 2008ء، ص 271-272 **(44)** خلیق انجم 1995ء، ص 1583-1584

یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں، اس کے باپ پر اور دادا پر اور پر دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولدالحرام۔ ایک تو لڑکے میاں غلام نجف، دوسرے [ثاقب]، میری کم بختی، بڑھاپے میں آئی کہ میرا کلام [ان کے] ہاتھ پڑا۔ [مَیں نے ثاقب کو تاکید کر دی ہے کہ] اپنے کاتب سے کہہ دینا کہ یہ خرافات متن میں نہ لکھے۔ اگر لکھ دیے ہوں تو وہ ورق نکلوا ڈالنا اور ورق اس کے بدلے لکھوا کر لگا دینا۔[45]

OOO

بے رزق جینے کا ڈھب آ گیا ہے۔ رمضان کا مہینا روزہ کھا کھا کر کاٹا، آئندہ خدا رزّاق ہے، کچھ اَور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ جب ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے۔[46]

OOO

مَیں پانسات سال سے بہرا ہو گیا ہوں، ایک رباعی چار قافیے کی اس مضمونِ خاص کی مَیں نے لکھی ہے:

دارم دِل شاد و دیدۂ بینای | و ز کری گوشم نہ بود پروای
خوبست کہ نشنوم ز ہر خودرای | گلبانگ انار بکم الاعلای[47]

مَیں مادّۂ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے مادّے دیے ہوئے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادّہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں، وہ بیشتر لچر ہُوا کرتا ہے۔[48]

OOO

بیمار کیا ہُوا، توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغِ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارۂ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا؛ اُس وقت تو بچ گیا، مگر قصہ قطع نہ ہُوا۔ میری غذا تندرستی میں کیا ہے، دس دِن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی، گویا دس دِن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنّا اور آلو بخارے کا افشردہ۔ کل سے خوفِ مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آئی ہے۔ آج صبح کو بعد دوا پینے کے، یقین تو ہے کہ پیٹ بھر کر روٹی کھا سکوں گا۔[49]

OOO

---

(45) خلیق انجم 1990ء، ص 694 **(46)** خلیق انجم 1990ء، ص 493-494 **(47)** خلیق انجم 1990ء، ص 582 **(48)** خلیق انجم 2008ء، ص 364 **(49)** خلیق انجم 2008ء، ص 375

کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا؛ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اَب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اُس کا بیٹا؛ یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے، اُن دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ آمد خطوط کی موقوف۔[50] رجب علی بیگ سرور نے جو **فسانۂ عجائب** لکھا ہے، آغازِ داستان کا شعر اَب مجھ کو بہت مزہ دیتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ   یاد رکھنا ، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعِ ثانی کتنا گرم ہے اور 'یاد رکھنا' 'فسانے' کے واسطے کتنا مناسب![51]

شعر کہنے کی رِوش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا؛ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر، یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے؛ سو گاہ گاہ، جب دِل الٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے :

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آجاتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں:

اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے

[ایسا نہیں کہ] مَیں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دُکھ مجھ کو ہے، اُس کا بیان تو معلوم، مگر اُس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے، جو اُن رُوسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد؛ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق؛ سو وہ سب کے سب خاک میں مِل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے؛ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اُس کو زیست کیونکر نہ دُشوار ہو۔[52] ہائے میجر جان جاکوب، کیا جوان مارا گیا ہے۔ یہ بھی انھی میں ہے کہ

---

(50) خلیق انجم 2008ء، ص 276-277 **(51)** خلیق انجم 2008ء، ص 278 **(52)** خلیق انجم 2008ء، ص 280-281

جن کا مَیں ماتمی ہوں۔ ہزارہا دوست مر گئے، کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔[53]

OOO

ہائے لکھنوَ! کچھ نہیں کھلتا کہ اُس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہُوا؟ قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر کی سرگذشت کیا ہے؟[54]

OOO

پنشن اگرچہ ملے گا، پر کب ملے گا؟ اُس کے ملنے تک کیا ہو گا اور اس کے ملنے سے میرا کیا کام نکلے گا؟ قطع نظر ان امور سے، اُس وجہِ قلیل کو کس بستی میں بیٹھ کر کھاؤں گا؟ یہ شہر، اب شہر نہیں، قہر ہے۔[55]

OOO

یہاں آدمی کہاں ہیں کہ اخبار کا خریدار ہو۔ مہاجن لوگ، جو یہاں بستے ہیں، وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ روپیہ مہینے کا کیوں مول لیں گے؟[56]

OOO

شعرائے ایران کُلہم اجمعین مسلّم الثبوت ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ سخنورانِ ہند میں امیر خسرو دہلوی بھی ایسے ہی ہیں، جیسے اہلِ ایران۔ اہلِ ہند میں امیر خسرو دہلوی نے، اہلِ ایران میں رودکی و فردوسی سے لے کر جامی تک اور جامی سے صائب و کلیم تک کسی نے لغت کی کوئی کتاب لکھی ہو، کوئی فرہنگ جمع کی ہو۔ اُس کو اگر مَیں نہ مانوں اور سند نہ جانوں تو مَیں گنہگار۔ جتنی فرہنگیں اَب موجود ہیں، نام اُن کے کہاں تک لوں؛ مشہور و غیر مشہور کچھ کم سو رسالے ہوں گے۔ اِن سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں، کوئی اہلِ زبان نہیں ہے۔ اشعارِ اساتذۂ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات اُن کی نظم میں دیکھے، بہ مناسبت مقام ان لغات کے معنی لکھ دیے۔ استنباطِ معنی کا مدار قیاس پر۔ یہ

(**53**) خلیق انجم 1990ء، ص 700-701 (**54**) خلیق انجم 1990ء، ص 701 (**55**) خلیق انجم 1989ء، ص 1048 (**56**) خلیق انجم 1989ء، ص 1049

مَیں نہیں کہتا کہ قیاس اُن کا سراسر غلط، میرا قول یہ ہے کہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔ اُن سب فرہنگ لکھنے والوں میں یہ [گولکنڈہ] دکن کا آدمی [محمد حسین برہان تبریزی]، یعنی جامعِ **برہانِ قاطع** [1652ء] احمق اور غلط فہم اور معوج الذہن ہے؛ مگر قسمت کا اچھا ہے۔ مسلمان اس کے قول کو آیت اور حدیث جانتے ہیں اور ہندو اس کے بیان کو مطالبِ مندرجۂ بید [وید] کے برابر مانتے ہیں۔[57]

قاطع برہان کے مسودے سب مَیں نے پھاڑ ڈالے، اس واسطے کہ ہر نظر میں اُس کی صورت بدلتی گئی، وہ تحریر بالکل مغشوش ہو گئی۔ ہاں، اس کی نقلیں صاف کہ نواب صاحب نے کر لی ہیں؛ ایک میرے واسطے، ایک بھائی ضیاء الدین خاں کے واسطے۔ جو صاحب اس کو دیکھیں گے، وہ ہرگز نہ سمجھیں گے، صرف **برہانِ قاطع** کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی، وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو؛ دوسرے فنِ لغت کو جانتا ہو؛ تیسرے فارسی کا علم خوب ہو اور اس زبان سے اس کو لگاؤ ہو، اساتذۂ سلف کا کلام بہت کچھ دیکھا ہُوا اور کچھ یاد بھی ہو؛ چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو؛ پانچویں طبعِ سلیم و ذہنِ مستقیم رکھتا ہو، معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔[58]

ooo

پنشن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی، اُس نے اچھی لکھی۔ کل ہفتے کا دِن، ساتویں اگست کی، مجھ کو اجرٹن صاحب بہادُر [ڈپٹی کمشنر] نے بلایا۔[59] صرف اتنا ہی پوچھا کہ غدر میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہُوا، وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدِ ولایت مَیں نے پڑھائے۔ انداز و ادا سے پنشن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے، مگر پندرہ مہینے پچھلے ملتے نظر نہیں آتے۔[60]

ooo

زندگی کے تریسٹھ سال گزر چکے۔ ان طرح طرح کے رُوح فرسا غموں (کے سبب) سے اَب [ایک] زمانے سے اَور فرصت (عمر) کی توقع بے جا ہے۔ مجبوراً سحر نگارِ شیراز (شیخ سعدی) رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار دہراتا ہوں اور جس طرح ایک غم نصیب دوسرے غمزدہ شخص سے نصیحت حاصل

---

(57) خلیق انجم 1990ء، ص789 (58) خلیق انجم 1990ء، ص495 (59) خلیق انجم 1990ء، ص494 (60) خلیق انجم 1990ء، ص628

کرتا ہے، ان اشعار (کو پڑھ کر) اگر دِل کو خوش نہیں کر سکتا تو کم سے کم قیدِ رنج و غم سے آزاد تو کر ہی لوں گا:

دریغا کہ بی ما بسی روزگار   بروید گل و بشگفد نوبہار
بسی تیر و دی ماہ اردی بہشت   بیاد کہ ما خاک باشیم و خشت

[افسوس! ہمارے بغیر اس دُنیا میں بارہا بہاریں آئیں گی اور پھول کھلیں گے۔ تیر، دے اور اردی بہشت کے مہینے بار بار آئیں گے، جب کہ ہم (قبر میں) خاک ہو چکے ہوں گے][61]

○○○

فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔ مَیں نیم مسلمان، مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں اور بدنامی و رُسوائی کے رنج ڈر سے بے نیاز۔ ہمیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی۔ ولایتی شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل کہ انگریزی شراب شہر میں بہت مہنگی ہے اور مَیں بالکل مفلس ہوں؛ اگر خدادوست، خداشناس، فیاض، دریادِل مہیش داس دیسی شرابِ قند، جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور بُو میں اس سے بڑھ کر ہے، بھیج کر آتشِ دل کو سرد نہ کرتے تو مَیں زندہ نہیں رہتا، [بلکہ] اسی عالمِ جگر تشنگی میں مر جاتا۔ اس نیکی پسند شخص نے (شہر میں) مسلمانوں کی آبادکاری کے متعلق کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چونکہ خدا کی مرضی نہیں تھی، کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ (شہر میں) ہندوؤں کا آزادی کے ساتھ رہنا مہربان حاکموں کی محبت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ بہر حال، اس نیکی پسند، بہی خواہ کا اس انتظام میں دخل رہا ہے۔ قصہ مختصر، خوش نصیب شخص ہے، لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہے، زندگی عیش و مسرت کے ساتھ گزارتا ہے۔ اگرچہ مجھ سے پرانی شناسائی نہیں، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھ کو ممنون کرتا ہے۔ ہیرا سنگھ، جو ایک نیک نام اور بامروّت نوجوان ہے، آتا رہتا ہے اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نصف آباد، نصف ویران شہر کے لوگوں میں سے عالی نسب شیوجی رام برہمن، جو ایک عقل مند نوجوان اور مجھ کو بیٹے

---

(61) غالب 2000ء، ص 79

کی طرح عزیز ہے، مجھ درویشِ غمزدہ کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے، [بلکہ] فرماں برداری اور کارسازی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا لڑکا بال مکند، جو ایک پرہیز گار اور خوش اخلاق نوجوان ہے، اپنے والد کی طرح تعمیلِ حکم میں مستعد اور غمگساری میں یکتا ہے۔ دُور دراز کے (ایک دوست) آسمانِ محبت کے ماہِ کامل، شیوا بیان، ہرگوپال تفتہ میرے پرانے مونس و ہمدم، مجھ کو اپنا استاد کہتے ہیں، بہت اچھے آدمی ہیں، سر تاپا محبت و اخلاص۔ شاعری سے ان کو فروغ (شہرت) حاصل ہے اور ان کے دَم سے شاعری کے ہنگامے گرم رہتے ہیں۔ انتہائے محبت سے مَیں نے ان کو اپنا جزوِ رُوح سمجھ لیا ہے، 'مرزا تفتہ' خطاب دیا ہے۔ انھوں نے میرٹھ سے ایک ہنڈوی میرے پاس بھیجی، نیز غزل اور خط برابر بھیجتے رہتے ہیں۔ [غرض] شہر مسلمانوں سے خالی ہے۔ راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں اور دِن میں دیواروں کے روزن دھویں سے۔ غالب، شہر میں جس کے ہزاروں دوست تھے، ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے، اس تنہائی میں قلم کے سوا اس کا ہم زبان اور (اپنے) سایے کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے۔ اگر شہر میں یہ چاروں شخص نہ ہوتے تو کوئی شخص میری بے کسی کا گواہ بھی نہ ہوتا۔ (گردش) روزگار پر رشک آتا ہے کہ اس لوٹ مار میں، جب شہر کے کسی گھر میں مَٹّی بھی نہیں بچی، اگر میرا گھر لوٹ مار کرنے والوں کی درازدستی سے محفوظ رہا، (لیکن) قسم کھا سکتا ہوں کہ بستر اور پہننے کے کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا۔ اس عقدۂ دُشوار کا حل اور اس دروغ نما سچ کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں نے شہر پر قبضہ کیا، بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں، زیور وغیرہ، جو کچھ تھا، خفیہ طور پر کالے صاحب پیرزادہ کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں تہہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مَٹّی سے پاٹ دیا گیا۔ جب فاتح (انگریزوں) نے شہر کو فتح کیا اور سپاہیوں کو لوٹ مار کا حکم مل گیا، تب بیگم نے یہ راز مجھ سے کہا۔ وقت نکل چکا تھا، (وہاں تک) جانے اور (سامان) لانے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ مَیں خاموش ہو گیا اور دِل کو سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں، اچھا ہُوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں۔ اَب یہ جولائی کا پندرھواں مہینا ہے، قدیم پنشن، جو سرکار انگریزی سے (ملتی تھی)، اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہیں نکلا۔ بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں، گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں، مَیں کپڑے

کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب (بیچ کر) کھالوں گا، عالمِ برہنگی میں بھوک سے مر جاؤں گا۔ اس قیامت میں پرانے نوکروں میں سے دو تین نوکر میرے پاس سے نہیں گئے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ آدمی آدمی کے بغیر رہ نہیں سکتا، نوکر کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اَب کہ جسمانی تکلیفوں کے دباؤ اور رُوحانی اذیتوں کی گدا ختگی نے جسم و جان کو تباہ کر دیا ہے۔ [غرض] پنشن اگر مل [بھی] گئی، تب بھی آئینہ (دل) سے زنگ (غم) صاف نہیں ہو سکے گا، (یعنی قرض ادا نہیں ہو گا)، [اور] اگر نہیں ملی، اُس صوت میں شیشہ پتّھر سے چور چور ہو جائے گا۔ (تباہی یقینی ہے) اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چونکہ یہاں (دہلی) کی آب و ہَوا مصیبت زندہ لوگوں کو ساز گار نہیں آتی، یقیناً شہر سے بھاگنا ہو گا اور کسی دوسرے شہر میں رہنا ہو گا۔[62] کاش! میری ان تین خواہشوں، یعنی خطاب، خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور آ جائے، میری آنکھیں اور میرا دِل انھیں کی طرف لگا ہُوا ہے۔[63]

OOO

مَیں نے 11/ مئی 1857ء سے 31/ جولائی 1858ء تک رُودادِ شہر اور اپنی سرگزشت، یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔[64] التزام اس کا کیا ہے کہ **دساتیر** کی عبارت، یعنی پارسیِ قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اُس نثر میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزشِ لفظِ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے؛ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔[65] اگر ملکہ عالم کی بخشش سے مَیں کچھ حاصل کر لوں تو اس دُنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا۔[66]

OOO

[مَیں] اپنا مقصود [علائی کے] والد ماجد سے اور [ان کی] جدۂ ماجدہ اور [ان کے] عمِ عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں کہ میری بی بی [امراو بیگم] اور [امراو کی بہن کے] بچوں [مرزا باقر علی بیگ، مرزا حسین علی بیگ] کو کہ تمھاری قوم کے ہیں، مجھ سے [واپس] لے لو کہ مَیں اَب اس بوجھ کا متحمل ہو نہیں سکتا۔ [ان سب] نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے، [میری] اس

(62) غالب 2000ء، ص85 **(63)** خلیق انجم 2008ء، ص282 **(64)** ایضاً **(65)** غالب 2000ء، ص86-87
(66) غالب 2000ء، ص87

خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائے تو وہ اپنے صَرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا، وہاں رہ گیا؛ جہاں سے دِل اُکھڑا، چل دیا۔[67]

○○○

روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کہاں سے چھپواؤں گا۔ منشی امید سنگھ اندور والے دلّی آئے تھے، سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا، ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے [**دستنبو کا**] نسخہ دیکھا، چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں منشی ہر گوپال تفتہ نے اہتمام اپنے ذمے لیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں، پچیس روپے بطریق ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بشمولِ سعیِ منشی ہر گوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دِکھایا، اجازت چاہی، حکام نے بکمالِ خوشی اجازت دی۔[68] مطبع مفید خلائق [آگرہ] میں چھپنے کو گئی ہے، **دستنبو** اس کا نام رکھا ہے۔[69] مَیں نہیں چاہتا کہ دو جز یا چار جز کی کتاب ہو، چھ جز سے کم نہ ہو۔ مسطر دس گیارہ سطر کا ہو، مگر حاشیہ تین طرف بڑا رہے، شیرازے کی طرف کا کم ہو۔ کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامے کی حاجت نہ پڑے۔ کاغذ شیو رامپوری ہو، مگر سفید و مہرہ کیا ہُوا اور لعاب دار۔ حاشیے پر جو لغات کے معنی لکھے جائیں تو اس کی طرزِ تحریر اور تقسیم دِل پسند اور نظر فریب ہو۔ حاشیے کی قلم بہ نسبت متن کی قلم کے خفی ہو۔[70] یہ تحریر میرا پارۂ جان اور رُوح کا ٹکڑا ہے۔ مَیں اس کی خوبیوں میں کاغذ کی چمک دمک، رَوشنائی اور سیاہی کی آب و تاب، اسلوبِ گفتگو میں تبدیلی نہ آنے دینا اور طرزِ بیان میں فرق و تفاوت نہ ہونے کے علاوہ اَور کچھ نہیں سمجھتا۔[71] پانسو جلد چھاپی جاتی ہے، یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔[72] امید ہے کہ اگر یہ لندن جائے تو وہاں کے ماہرین واہلِ فن اس کی شائستگی کی تعریف کریں۔[73]

[پہلے صفحے کی] تقسیم یوں ہے کہ تین سطریں اوپر اور تین سطریں نیچے اور بیچ میں ایک سطر، اس میں کتاب کا نام۔ دوسرے صفحے پر ساتوں سطریں، ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہو جائے گی اور

(**67**) خلیق انجم 2008ء، ص365-366 (**68**) خلیق انجم 1990ء، ص497-498 (**69**) خلیق انجم 1989ء، ص1086 (**70**) خلیق انجم 1989ء، ص1051 (**71**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص259۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص687 (**72**) خلیق انجم 1990ء، ص498 (**73**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص259

مطبع پر بات آئے گی۔ 'نوابی' کا مجھ کو خطاب ہے، 'نجم الدولہ' اور اطراف و جوانب کے اُمرا سب مجھ کو 'نواب' لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی؛ چنانچہ صاحب کمشنر بہادُر دہلی نے، جو اَب اِن دِنوں میں رُوبکاری بھیجی ہے تو لفافے پر 'نواب اسد اللّٰہ خاں' لکھا ہے؛ لیکن 'نواب' کے لفظ کے ساتھ 'مرزا' یا 'میر' نہیں لکھتے، یہ خلافِ دستور ہیں۔ یا 'نواب اسد اللّٰہ خاں' یا 'مرزا اسد اللّٰہ خاں' اور 'بہادُر' کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔[74] [اگرچہ] لفظ مبارک: میم، حا، میم، دال [محمد]؛ اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے؛ مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ، یعنی 'محمد اسد اللّٰہ خاں' نہیں لکھا جاتا، مَیں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔[75]

[**دستنبو** کی] خاتمہ عبارت [یہ ہو گی]، 'نامہ نگار غالبِ خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے، اس کو مَیں نے مطبعِ مفیدِ خلائق میں چھپوایا ہے اور میری رائے میں اُس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اَور صاحبانِ مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے پر جرأت نہ کریں'۔[76]

OOO

لوگ کہتے ہیں کہ آگرے میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈوراپٹ گیا ہے کہ [ایسٹ انڈیا] کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا ہے اور [برطانوی] بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ [یہ بھی سنا ہے] کہ جناب [جارج فریڈرِک] اڈمنسٹن صاحب بہادُر گورنمنٹ کلکتے کے چیف سیکرٹری، اکبر آباد [صوبہ غرب و شمال] کے لفٹننٹ گورنر بہادُر ہو گئے۔[77] جناب اڈمنسٹن صاحب بہادُر سے مَیں صورت آشنا نہیں۔ کبھی مَیں نے اُن کو کہیں دیکھا نہیں، خطوں کی میری اُن کی ملاقات ہے اور نامہ پیام کی یوں بات ہے کہ جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادُر نئے آتے ہیں تو میری طرف سے ایک قصیدہ بطریق نذر جاتا ہے۔ بے ذریعہ جناب بہادُر ایجنٹ دہلی اور نواب لفٹننٹ گورنر بہادُر آگرہ بھجواتا ہوں اور صاحب سیکرٹری بہادُر گورنمنٹ کا خط اُس کی رسید میں بسبیلِ ڈاک پاتا ہوں۔ جب جناب لارڈ کیننگ بہادُر نے [یکم فروری 1856ء کو] کرسیِ گورنری پر اجلاس فرمایا تو مَیں نے موافق

(**74**) خلیق انجم 1989ء، ص 1056 (**75**) خلیق انجم 2008ء، ص 295 (**76**) خلیق انجم 2008ء، ص 291
(**77**) خلیق انجم 1990ء، ص 704

دستور کے قصیدہ ڈاک میں بھجوایا، اڈمنسٹن صاحب بہادُر [کلکتہ کے اُس وقت کے] چیف سیکرٹری کا جو مجھ کو خط آیا تو انھوں نے باوجود عدم سابقہ معرفت میرا القاب بڑھایا۔ قبل ازیں 'خاں صاحب بسیار مہربان دوستاں' میرا القاب تھا، اس قدر شناس نے ازراہِ قدر افزائی 'خاں صاحب مشفق بسیار مہربانِ مخلصاں' لکھا۔ اُن کو کیونکر اپنا محسن اور مربی نہ جانوں؟ کیا کافر ہوں، جو احسان نہ مانوں؟[78]

OOO

مَیں نے حضرت ملکہ معظمۂ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ اِن دِنوں میں لکھا ہے، 'تہنیتِ فتحِ ہند اور عملداریِ شاہی' ساٹھ بیت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اَور کاغذ مذہَّب پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر یہ خیال میں آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے، یعنی چھاپا ہوئی ہے۔ اگر یہ چھ صفحے، یعنی[79] تین ورق پر چھپ کر دستنبو سے پہلے، شیر ازے میں شامل کر دیے جائیں تو کتاب کو قصیدے سے عزت اور قصیدے کو کتاب کے سبب سے شہرت حاصل ہو جائے گی۔[80] ایک تو یہ کہ چھپے بعد کتاب اور لگایا جائے پہلے کتاب سے؛ دوسرے یہ کہ اس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو اور پہلے صفحے پر جس طرح کتاب کا نام چھاپتے ہیں، اس طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ 'قصیدہ در مدحِ جناب ملکہ انگلستان خلد اللہ ملکہا'۔ میرا نام ضرور نہیں، کتاب کے پہلے صفحے پر تو ہو گا۔[81] قصیدے کا نثر سے پہلے لگانا، ازراہِ اکرام و اعزاز ہے، ورنہ نثر یں اَور صنعت اور نظم کا اَور انداز ہے۔ یہ اُس کا دیباچہ کیوں ہو، بلکہ صورت ان دونوں کے اجماع کی یوں ہو کہ سر رشتہ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدے کے اور دستنبو کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔[82]

OOO

مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے۔ اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔ کاپی میرے دیکھنے کو بھیجی تھی، سب طرح میرے پسند آئی، سیاہی ذرا اَور بھی رنگت کی اچھی ہو۔[83]

اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ[84] ان جلدوں میں سے دو جلدیں ولایت کو جائیں گی؛ ایک جناب فیض مآب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر اور ایک میرے آقائے قدیم

---

(78) خلیق انجم 1990ء ص705 **(79)** خلیق انجم 1990ء ص704 **(80)** خلیق انجم 1989ء ص1176 **(81)** خلیق انجم 1990ء ص704 **(82)** خلیق انجم 1990ء ص708 **(83)** خلیق انجم 1990ء ص707 **(84)** ⇦

لارڈ ایلن برا بہادُر کی نذر اور چار جلدیں یہاں کے چار حاکموں کی نذر کروں گا۔[85] اللہ اللہ، کیا غفلت ہے اور کیا اعتماد ہے زندگی پر! بہر حال، یہ ہوس تھی اور شاید اَب بھی ہو کہ ان چھے جلدوں کی کچھ تزئین اور آرائش کی جاوے، معہذا دو دو روپے کتاب سے زیادہ کا مقدور بھی نہیں۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ چاروں جلدیں چھ روپے میں اور دو جلدیں چھے روپے میں تیار ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ یارَب! آرائش کی گنجائش کہاں؟ ناچار چار کتابوں کی جلد ڈیڑھ ڈیڑھ روپے کی اور دو کتابوں کی جلد تین تین روپے کی بنائی جائے۔[86] یہ چار جلدیں نواب گورنر جنرل بہادُر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادُر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادُر دہلی کی نذر ہیں۔ یہ کیا میری بدوضعی ہے کہ جناب اڈمنسٹن صاحب [لفٹننٹ گورنر غرب وشمال] کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت بھیجوں گا، ایک جلد اُن کے لیے بہت ضروری ہے۔[87]

ooo

[پولیٹکل ایجنٹ، کرنل آلوس کے اسسٹنٹ] بلیک صاحب کے جے پور میں [ایک غلط فہمی کے نتیجے میں عوام کے ہاتھوں] ٹکڑے اُڑ گئے۔ گورنر مدعی نہ ہوئے، قصاص نہ لیا۔[88]

ooo

بادشاہ کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اجڑا ہُوا شہر، نہ آدمی، نہ آدم زاد؛ مگر دو ایک مصوروں کی آبادی کا حکم ہو گیا ہے؛ وہ رہتے ہیں، سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں۔ تصویریں اُن کے گھروں میں سے لٹ گئیں۔ کچھ جو رہیں، وہ صاحبانِ انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کر لیں۔ ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے، وہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو مَیں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہے، تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ مَیں نے چاہا کہ اُس کی نقل کاغذ پر اُتار دے، اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے اور پھر خدا جانے، اچھی ہو یا نہ ہو۔ اتنا صَرفِ بے جا کیا ضرور ہے۔ مَیں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے، اگر کہیں سے ہاتھ آ جائے گی تو، مصوروں سے نہ خرید کرنے کا خود مجھ میں مقدور، نہ [منشی شیونرائن آرام کا] نقصان منظور۔[89]

⇦ خلیق انجم 2008ء ص 285 (**85**) خلیق انجم 1989ء ص 1051 (**86**) خلیق انجم 1990ء، ص 707 (**87**) خلیق انجم 2008ء، ص 298-299 (**88**) خلیق انجم 1990ء، ص 498 (**89**) خلیق انجم 1989ء، ص 1057

○○○

پنشن کا حال، حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا، عملے میں ہر چند تفحص کیجے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہُوا، کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہر حال، اتنا سنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہُوا ہے کہ مَیں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر بہادُر کی رائے میں پنشن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم، نہ کسی کو خبر۔[90]

پہلی نومبر کو دو شنبے کے دِن، حسب الحکم حکام، [سب خیر خواہانِ انگریز کے گھروں اور صاحب کمشنر بہادُر کی کوٹھی سمیت] کوچہ و بازار میں رَوشنی ہوئی اور سب کو [ایسٹ انڈیا] کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا [برطانوی] بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادُر کو ملکۂ معظمۂ انگلستان نے 'فرزندِ ارجمند' خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔[91]

○○○

علمِ نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانے کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، تب سطحِ فلک پر [دُم دار ستارہ قسم کی] شکلیں دِکھائی دیتی ہیں۔ جس برج میں یہ نظر آئے، اُس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں، پھر ذوذنابہ کا ممر اور طریقہ دیکھتے ہیں۔ ہزار طرح کے جال ڈالتے ہیں، تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہاں آباد میں بعدِ غروبِ آفتاب غربیِ شہر پر نظر آتا تھا اور چونکہ اُن دنوں آفتاب اوّل میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجے اور دقیقے کی حقیقت نامعلوم رہی، بہت دِن شہر میں اس ستارے کی دھوم رہی، اَب دس بارہ دِن سے نظر نہیں آتا۔ مَیں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہرِ الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی تباہی کی ہیں۔ قران النحسین، پھر کسوف، پھر خسوف، پھر یہ صورتِ پُر کدورت، عیاذاً باللّٰہ وپناہ بخدا۔[92]

○○○

ازرُوے **اخبار مفید خلائق**، اس ہفتے میں جناب اڈمنسٹن صاحب بہادُر آگرے آئیں گے اور وسادۂ لفٹننٹ گورنری پر اجلاس فرمائیں گے۔ اس صورت میں اغلب ہے کہ ولیم میور صاحب بہادُر اُن کی جگہ چیف سیکرٹری بن جائیں گے۔ جب [1858ء] تک اڈمنسٹن صاحب چیف سیکرٹری تھے

---

(90) خلیق انجم 1990ء ص497 **(91)** خلیق انجم 1989ء، ص987-988 **(92)** خلیق انجم 1989ء، ص987

تو خیال میں تھا کہ اُن کی نذر اور نواب گورنر جنرل کی نذر، یعنی دو کتابیں مع اپنے خط کے اُن کے پاس بھیجوں گا؛ اَب حیران ہوں کہ کیا کروں؟ آیا اُن کی جگہ سیکرٹری کون ہُوا اور یہ لفٹننٹ گورنر ہوئے تو سیکرٹری کس کو کیا؟ میر منشی لفٹننٹ گورنر کا کون رہا اور گورنر جنرل کا میر منشی کون ہے؟[93]

OOO

مَیں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔[94]

OOO

[مرزا حاتم] نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے۔ مہتمم مطبع لکھتے ہیں کہ 'تمھاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے، اسی ہفتے میں تمھارے پاس پہنچ جائیں گی'۔ خدا کرے، اُن تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے یہ سات جلد بھی آئیں، تا خاص و عام کو جابجا بھیجی جائیں۔[95]

OOO

واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔[96] میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو مَیں نے کہا، انھوں نے لکھ لیا۔ اُن دونوں کے گھر لٹ گئے، ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہو گئے۔ اَب مَیں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دِن ہوئے، ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ وہ کاغذ جو مجھ کو دِکھایا، مجھ کو رونا آیا:

درد منّت کشِ دوا نہ ہُوا — مَیں نہ اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں — آج غالب غزل سرا نہ ہُوا[97]

OOO

یہ بھی ایک بخشش کا بہانہ پیدا کرنا ہے، ورنہ [نواب محمد یوسُف علی خاں] کے کلام کو اصلاح کی احتیاج کیا ہے۔ میری کیا سخنوری اور سخن سرائی ہے، [ان] کی قدر دانی، بلکہ قدر افزائی ہے۔[98]

---

(93) خلیق انجم 1990ء، ص 709 **(94)** خلیق انجم 1990ء، ص 710 **(95)** ایضاً **(96)** خلیق انجم 1990ء، ص 810 **(97)** خلیق انجم 1990ء، ص 710-711 **(98)** خلیق انجم 1989ء، ص 1181

جو[وہ]بن مانگے دیں، اُس کے لینے میں مجھے انکار نہیں اور جب مجھ کو حاجت آ پڑے تو[ان]سے مانگنے میں مجھے عار نہیں۔ بارِ گرانِ غم سے پست ہو گیا ہوں؛ آگے تنگ دست تھا، اَب تہی دست ہو گیا ہوں۔[99]

ooo

خدا کا شکر یہ کہ باوجودِ تعلق قلعہ، کسی طرح کے جرم کا، بہ نسبت میرے، احتمال بھی نہیں۔ قسمت کا گلہ یہ کہ عطاے پنشنِ قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں۔ یہ نومبر 1858ء، انیسویں مہینا ہے، گویا بن کھائے جینا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال[1859ء] میں پنشن داروں کا روپیہ ملے گا، [دیکھتا ہوں،] کیا گُل کھلے گا۔ مَیں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزراے ملکہ دارادربان کے دو سرٹیفکیٹ پا چکا ہوں۔[100]

ooo

کل جمعے کے دِن بارہ تاریخ نومبر[1858ء] کو تینتیس جلدیں پہنچیں، دِل خوش ہُوا اور شیونرائن کو دعا دی۔[101] کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر مَیں نے از رُوے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ[سات] کتابیں طاوسِ بہشت بن جائیں گی، حوریں اُن کو دیکھ کر شرمائیں گی۔[102]

ooo

اگرچہ تریسٹھ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں، پر بینائی میں فتور نہیں، عینک سے اعانت چاہنی منظور نہیں۔[103]

ooo

اردو کے خطوط، جو[منشی شیونرائن آرام] چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہو گا کہ جو مَیں نے قلم سنبھال کر اور دِل لگا کر لکھا ہو گا، ورنہ صرف تحریرِ سرسری ہے۔ اُس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے اور اس سے قطع نظر، کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اَوروں پر ظاہر ہوں۔[104] [مَیں نے مرزا ہرگوپال تفتہ کو بھی صاف صاف بتا دیا ہے کہ] 'رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے، لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمھاری

---

(99) خلیق انجم 1989ء، ص 1182 **(100)** خلیق انجم 1989ء، ص 1181-1182 **(101)** خلیق انجم 2008ء، ص302 **(102)** خلیق انجم 1990ء، ص 711-712 **(103)** خلیق انجم 1990ء، ص858 **(104)** خلیق انجم1989ء، ص1062

اسی میں خوشی ہے تو صاحب! مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے،[لیکن خیال رہے کہ] یہ امر میرے خلافِ رائے ہے'۔[105]

OOO

کل جو جمعہ روزِ مبارک و سعید تھا، گویا میرے حق میں روزِ عید تھا۔ چار گھڑی دِن رہے، نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام[106] 19/ نومبر 1858ء کو سات کتابوں کے دو پارسل پہنچے۔[107]

سات جلدوں کا پارسل پہنچا　　واہ ، کیا خوب بر محل پہنچا[108]

واقعی کتابیں، جیسا کہ میرا جی چاہتا تھا، اُسی روپ کی ہیں۔[109] زبان نہیں، جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرائش ہے، آفتاب کی سی نمائش ہے۔[110] آدمی کو موافق اُس کی تمنا کے آرزو بر آنی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی بر آئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا، مَیں تو صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زرّیں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ، اگر تصور میں بھی گزرتا کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔[111]

ہنری اسٹوراٹ ریڈ صاحب، ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔ امن کے دِنوں میں ایک ملاقات میری اُن کی ہوئی تھی۔ مَیں نے اَب ایک کتاب سادہ بے جلد اُن کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط مجھ کو اُس کتاب کی رسید میں آیا ہے۔ بہت تعریف لکھتے تھے اور لکھتے تھے کہ یہ دستنبو پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمھارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ اُن کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہُوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہو گی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔ مَیں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سیکرٹریوں کی نذر یہ پارسل اِن شاء اللہ تعالیٰ آج [27/ نومبر

(**105**) خلیق انجم 2008ء، ص 303 (**106**) خلیق انجم 1990ء، ص 712 (**107**) خلیق انجم 1989ء، ص 1062 (**108**) خلیق انجم 1990ء، ص 712 (**109**) خلیق انجم 1989ء، ص 1062 (**110**) خلیق انجم 2008ء، ص 303 (**111**) خلیق انجم 1990ء، ص 712-713

1858ء] روانہ ہو جائیں گے۔[112] خطوں کا چوتھے پانچویں دِن اور پارسلوں کا چھٹے ساتویں دِن پہنچنا خیال کرتا ہوں۔ پارسلوں کے عنوان پر خطوں کی معیت رقم کی ہے اور خطوں کے سرنامے پر پارسلوں کے ارسال کی اطلاع دی ہے۔[113]

ایک قرینے سے مجھ کو معلوم ہُوا ہے کہ شاید گورنمنٹ سو دو سو دستنبو کی خریداری کرے گی اور ان نسخوں کو ولایت بھیجے گی۔ کیا بعید ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں [منشی شیو نرائن آرام کے] پاس الٰہ آباد سے حکم پہنچے۔[114]

OOO

[نواب سید محمد یوسُف علی خاں ناظم کی طرف سے موصولہ] اڑھائی سو روپے کی ہنڈوی معتمد کے حوالے کی گئی، آج یا کل روپیہ آ جائے گا۔ میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، مَیں وہاں نہ آؤں گا تو اَور کہاں جاؤں گا۔ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے، اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں۔ سنا جاتا ہے اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغازِ سال 59ء میں یہ قصہ انجام پائے [گا]۔ جس کو روپیہ ملنا ہے، اُس کو روپیہ؛ جس کو جواب ملنا ہے، اُس کو جواب مل جائے [گا]۔[115]

OOO

خط اور پارسل کا پہنچ جانا ایسا نہیں کہ اس کی خبر پا کر بخت کی رسائی کا سپاس گزار نہ ہوں۔ دوسرا پارسل اور خط معاً اس پارسل اور اس خط کے ساتھ بھیجا گیا ہے اور ہر گونہ توقع کا خیال اُسی پارسل پر ہے۔ کس واسطے کہ اس خط میں حاکمِ اعظم کے نام کی عرضی ملفوف ہے۔ جانتا ہوں کہ محکمہ ایک، ڈاک ایک، دونوں پارسل اور دونوں لفافے ایک دِن پہنچے ہوں گے، مگر دِل نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ نہ مانوں گا، جب تک کہ [خواجہ غلام غوث خاں بے خبر] اُس سر رشتے سے معلوم کر کر نہ لکھیں گے۔ [وہ] لکھ سکتے ہیں، بلکہ یہ بھی مجھ پر حالی کر سکتے ہیں کہ نذر ولایت کی، ولایت کو روانہ ہوئی یا نہیں؟ میری جگر کاوی کی قدر دانی ہوئی یا نہیں؟ پیش گاہِ حکام سے موافق دستورِ قدیم کے خط کا امیدوار ہوں یا نہیں؟ اپنے حسنِ طبع کا شکر گزار ہوں یا نہیں؟[116]

OOO

---

(112) خلیق انجم 2008ء، ص 304-305 **(113)** خلیق انجم 1990ء، ص 639-640 **(114)** خلیق انجم 1989ء، ص 1065 **(115)** خلیق انجم 1989ء، ص 1182 **(116)** خلیق انجم 1990ء، ص 641-642

قلم بنانے میں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس سے زخمی ہو گیا اور ورم کر آیا۔ چار دِن روٹی بھی مشکل سے کھائی گئی ہے۔ بہر حال، اَب اچھا ہوں۔[117]

OOO

پنج آہنگ، دو چھاپے ہیں؛ ایک بادشاہی چھاپا خانے کا اور ایک منشی نور الدین کے چھاپا خانے کا۔ پہلا ناقص ہے، دوسرا سراسر غلط ہے۔ ضیاء الدین خاں جاگیر دار لوہارو، میری سبھی بھائی اور میرے شاگردِ رشید ہیں؛ جو نظم و نثر میں مَیں نے کچھ لکھا، وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا؛ چنانچہ کلیاتِ نظمِ فارسی چون پچپن جُز اور **پنج آہنگ** اور **مہر نیم روز** اور دیوانِ ریختہ سب مل کر سو سوا سو جُز مطلّا اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یک جا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادے نے اُس مجموعِ نظم و نثر کی نقل لی۔ اَب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہُوا۔ [1857ء میں نجانے] کہاں سے یہ فتنہ برپا ہُوا اور شہر لٹے، وہ دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوانِ یغما ہو گیا۔ ہر چند مَیں نے آدمی دَوڑائے، کہیں سے اُن میں سے کوئی کتاب ہاتھ آئی، وہ سب قلمی ہیں۔ قلمی فارسی کا کلیات، قلمی ہندی کا کلیات، قلمی **پنج آہنگ**، قلمی **مہر نیم روز**۔[118] مَیں نے اپنی نظم و نثر کی کتب کا حال [شیو نرائن] کو لکھ کر یہ استدعا کی تھی کہ قلمی جو نسخہ [ان کے] ہاتھ آجائے، وہ خرید کر مجھے بھیج دینا۔[119]

جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کی فرمائش ہے اردو نثر کی۔ اردو میں مَیں اپنے قلم کا زور کیا صَرف کروں اور اس عبارت میں معنیِ نازُک کیونکر بھروں؟ سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں، کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر کروں۔[120] [منشی شیو نرائن آرام] سے صلاح پوچھی تھی کہ کس حکایت اور کس روایت کو فارسی سے اردو کروں؟[121] جناب [ہنری اسٹورٹ] ریڈر صاحب، صاحبی کرتے ہیں۔ مَیں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اُس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہو گا تو یہ ہو گا کہ میرا اردو بہ نسبت اَوروں کے اردو کے فصیح ہو گا۔ خیر، بہر حال کچھ کروں گا اور اردو میں اپنا زورِ قلم دِکھاؤں گا۔[122] اَب مَیں

---

(117) خلیق انجم 1989ء، ص1064 **(118)** ایضاً **(119)** خلیق انجم 1989ء، ص1065 **(120)** خلیق انجم 1989ء، ص1064-1065 **(121)** خلیق انجم 1989ء، ص1065 **(122)** خلیق انجم 1989ء، ص1067

کہانیاں قصے کہاں ڈھونڈتا پھروں؟ کتاب نام کو میرے پاس نہیں۔ پنشن مل جائے، حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔ پیٹ پڑے روٹیاں تو سبھی گلاں موٹیاں۔[123]

○○○

امراو سنگھ [کی دوسری بیوی مر گئی، اس] کے حال پر اُس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دَم ہی نکلتا ہے۔[124]

چرخ چلا جاتا ہے؛ جو ہونا ہے، وہ ہُوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ نہ آزاد ہوں، نہ مقید؛ نہ رنجور ہوں، نہ تندرست؛ نہ خوش ہوں، نہ ناخوش؛ نہ مردہ ہوں، نہ زندہ؛ جیے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں؛ روٹی کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی، مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے، نہ شکایت ہے؛ جو تقریر ہے، بسبیلِ حکایت ہے۔[125]

○○○

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت ڈال کر بند کر دیا۔ بَلّی ماروں کے دروازے کے پاس کی کئی دُکانیں ڈھا کر راستا چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام، کچھ نہیں۔ پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتے پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی۔ دیکھیے، کیپ [ٹاؤن] میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے ازرُوے قیاس، جیسا کہ دلّی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اُڑادی ہے، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری، شروع سال میں 1859ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر روپے دیے جائیں گے۔ اگر جیتے رہے تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہُوا۔[126]

قاسم جان کی گلی، میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں

---

(123) خلیق انجم 1989ء، ص 1069 **(124)** خلیق انجم 2008ء، ص 305 **(125)** خلیق انجم 2008ء، ص 306-307 **(126)** خلیق انجم 1990ء، ص 500

ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اَور صاحبِ عالی شانِ انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خاں اور ان کے بھائی مع قبائل و عشائر لوہارو ہیں۔ لال کنویں کے محلے میں خاک اُڑتی ہے، آدمی کا نام نہیں۔[127]

مَیں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا، مَیں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دِن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آرہتے ہوں، بلکہ ایسا بھی دِن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دِل لگی ہو جاتی ہے، دِن اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔[128]

❍❍❍

اپنے بخت و قسمت کو بھی آفریں کہی اور ڈاک کے کارپردازوں کا بھی احسان مانا۔ بارے، دونوں پارسل اور دونوں لفافے پہنچ گئے۔[129]

❑❑❑

(**127**) خلیق انجم 1995ء، ص 1444 (**128**) خلیق انجم 2008ء، ص 307 (**129**) خلیق انجم 1990ء، ص 641

(8)

مضمحل ہو گئے قویٰ

(1859ء-1860ء)

شراب کی قیمت کاس ٹیلین اور اولڈ ٹام دونوں [قسم کی] چوبیس روپے درجن، مَیں ہمیشہ لیا کرتا تھا، اَب مہنگی ملتی ہے۔ خیر، روٹی ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ مہینا بھر کی روٹی کا مول ایک درجن [بوتل] کی قیمت ہے۔[1] ابر گھر رہا ہے، ترشح ہو رہا ہے، ہَوا سرد چل رہی ہے۔ پینے کو کچھ میسر نہیں، ناچار روٹی کھائی ہے۔[2] اس سے زیادہ یاس کیا ہو گی کہ بہ امیدِ مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہو تا چلا ہوں۔ دو اڑھائی برس کی زندگی اَور ہے، ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ [سننے والے] کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے؟ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے؟ بیس بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باشم کہ جاوِداں باشم چوں نظیری نماند و طالب مرد
در بگویند در کدامی سال مرد غالب بگو کہ غالب مرد

اَب 1275ھ ہے اور 'غالب مرد' کے 1270ھ ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچی ہو، پہنچ لے، ورنہ پھر ہم کہاں؟[3]

ooo

دو جلدیں دستنبو کی مجھ کو لکھنؤ بھیجنی ہیں اور میرے پاس کوئی جلد نہیں ہے۔ صاحب لوگ اطراف و جوانب سے مجھ پر فرمائشیں بھیجتے ہیں، [شیونرائن] سے بہ قیمت کوئی نہیں منگواتا۔

---

(1) خلیق انجم 1989ء، ص834 (2) خلیق انجم 1989ء، ص642 (3) خلیق انجم 1989ء، ص642-643

چالیس جلدیں پہلی اور بارہ یہ حال کی، سب تقسیم ہو گئیں۔ ایک روپے کے بتیس ٹکٹ اور دو آنے کے دو ٹکٹ [منشی شیونرائن] کو بھیجتا ہوں۔ دو پارسل الگ الگ، آنے آنے کا ٹکٹ اس پر؛ یعنی دو پارسل اسٹامپ پیڈ، دونوں لکھنؤ کو، ایک بنام میر حسین علی اور ایک بنام مولوی سراج الدین احمد، بسبیلِ ڈاک۔[4] یہ دونوں صاحب بالفعل دلّی میں وارد ہیں۔[5]

OOO

منشی کشوری لال صاحب نے کہ وہ میرے دوست اور حضور [مہاراجا سردار سنگھ والی بیکانیر] کے خیر خواہ ہیں، مجھ پر مسودۂ عرضداشت اور سکّہ [والیِ بیکانیر] کی فرمائش کی۔ مَیں [ان] کی خدمت بجالانے کو اپنا فخر و سعادت سمجھتا ہوں۔[6]

OOO

پرسوں اور کل، دو ملاقاتیں جناب آرنلڈ صاحب بہادُر سے ہوئیں۔ کیا کہوں کہ مجھ پر بے سابقہ معرفت کیا عنایت فرمائی۔ مَیں یہ جانتا ہوں کہ گویا مجھ کو مول لے لیا۔ **دستنبو** [منشی شیو نرائن آرام کی] بھیجی ہوئی اُن کے پاس نہیں پہنچی، ناچار ایک **دستنبو** اور ایک **پنج آہنگ** اپنے پاس سے اُن کی نذر کر آیا ہوں۔[7] جناب آرنلڈ صاحب بہادُر مجھ سے وہ سلوک کر گئے ہیں اور مجھ پر وہ احسان کر گئے ہیں کہ قیامت تک ان کا شکر گزار رہوں گا۔[8]

OOO

پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند اور مَیں سادہ دِل فتوحِ جدید کا آرزومند۔ پنشن کا احاطۂ پنجاب کے حکام پر مدار ہے، سو اُن کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں، نہ جواب؛ نہ مہربانی کرتے ہیں، نہ عتاب۔ خیر، اس سے قطع نظر کی۔[9] 17/ دسمبر 1856ء کا لکھا ہُوا حکم وزیرِ اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ اُس قصیدے کے صلے اور جائزے کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ ایلن براسائل نے بھجوایا ہے، خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے؛ جو حکم صادر ہو گا، سائل کو بتوسط گورنمنٹ اُس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ یہ حکم مؤرخہ 17/ دسمبر 1856ء آخر جنوری 1857ء میں مَیں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے۔ مئی 1857ء

---

(4) خلیق انجم 1990ء، ص 1067-1068 (5) خلیق انجم 1990ء، ص 1068 (6) خلیق انجم 1989ء، ص 751 (7) خلیق انجم 1990ء، ص 1069 (8) خلیق انجم 1990ء، ص 1070 (9) خلیق انجم 1989ء، ص 643

میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔[10] بموجب تحریرِ وزیرِ [اعظم] عطیہ ٔشاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں، اگر گنہگار ہوں۔ گنہگار ہوتا تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ مَیں بے گناہ ہوں، مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیش گاہِ گورنمنٹ کلکتے میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے، بقلم چیف سیکرٹری بہادُر اُس کا جواب پایا ہے۔ اَب کی بار دو کتابیں بھیجیں۔ ایک پیشکش گورنمنٹ اور ایک نذرِ شاہی ہے۔ نہ اُس کے قبول کی اطلاع، نہ اُس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور صاحب بہادُر نے بھی عنایت نہ فرمائی، اُن کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔[11] اَب اس کتاب اور دوسرے قصیدے کے جابجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمہ ٔولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔ جب یہاں سے نویدِ تحسین نہیں تو ولایت کو نذر کے ارسال کا بھی یقین نہیں۔ تحسین اور آفرین سے گزرا۔ نذر کے ولایت جانے کا یقین کیونکر حاصل ہو، جہاں یہ تفرقہ اور یہ بے التفاتی اور یہ دُشواری اور یہ مشکل ہو۔ جی میں آتا ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادُر اور نواب لفٹننٹ گورنر بہادُر اور حاکم صدر بورڈ کو ایک ایک عریضہ جدا جدا لکھوں۔ پھر یہ سوچتا ہوں کہ انگریزی لکھواؤں، فارسی لکھوں اور دونوں صورتوں میں کیا لکھوں؟[12]

OOO

نواب مصطفی خاں [شیفتہ بغاوت کے مقدمے میں] بہ معیاد سات برس قید کے قید ہو گئے تھے، سو [نواب صدیق حسن خاں کی کوشش اور سفارش سے] اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے، جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہُوا۔ ناچار، وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا، اُن کو دیکھا؛ چار دِن وہاں رہا۔[13]

OOO

یہاں [دلّی میں] بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے، لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا

---

(10) خلیق انجم 1989ء، ص 645 **(11)** خلیق انجم 1989ء، ص 643 **(12)** خلیق انجم 1989ء، ص 645
(13) خلیق انجم 1989ء، ص 501

ہے، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے، آٹھ دِن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ، سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جماعہ دار میرے پاس بھی آیا۔ مَیں نے کہا، 'بھائی! تُو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری عبارت الگ لکھ'۔ عبارت یہ کہ 'اسد اللہ خاں پنشن دار 1850ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل برن صاحب بہادُر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار رہے۔ اَب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا، اَب حاکمِ وقت کو اختیار ہے'۔ پرسوں یہ عبارت جماعہ دار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی ہے، کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان وَکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں، انھیں ڈھا دو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں،[14] مَیں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے، 'ٹکٹ آبادی درون شہر دلّی بہ شرطِ ادخال جرمانہ'۔[15] جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بقدرِ مقدور نذرانہ دے، اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے، [دیکھتا ہوں،] شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں، وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، وہ شہر میں آتے ہیں۔ الملک للہ والحکم للہ۔[16] ڈھنڈورا پٹوا کر، ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادُر بطریقِ ڈاک کلکتے چلے گئے۔ دلّی کے حُمقا، جو باہر پڑے ہوئے ہیں، مُنھ کھول کر رہ گئے۔ جب وہ معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہو گی یا کوئی اَور نئی صورت نکل آئے۔[17]

دلّی کے سب پنشن داروں کو مئی 1857ء سے پنشن نہیں ملا۔ یہ فروری 1859ء بائیسواں مہینا ہے۔ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریقِ مدد خرچ مل گیا، باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آئندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادُر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریقِ مدد خرچ سو

---

(14) خلیق انجم 1989ء، ص 501-502 **(15)** خلیق انجم 1989ء، ص 504 **(16)** خلیق انجم 1989ء، ص 502 **(17)** خلیق انجم 1989ء، ص 503

روپے مل جائیں۔ مَیں نے وہ سو روپے نہ لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادُر کو لکھا کہ 'مَیں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا پانے والا ہوں، سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنشن داروں کو سال سال بھر کا روپیہ ملا، مجھ کو سو روپے کیسے ملتے ہیں؟ مثل اَوروں کے، مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جائے'،[18] [چنانچہ] پرسوں کوتوال کو حکم آیا ہے کہ اسد اللّٰہ خاں پنشن دار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں؟ کوتوال نے موافق ضابطے کے، مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں؛ سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔[19]

❍❍❍

لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری میں ایسا امن و امان ہو گا، نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین ہو گا۔ اُمرا اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں بقدرِ رُتبہ تعظیم و توقیر، پنشن کی تقسیم علی العموم، آبادی کا حکم عام، لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آبادی کرتے جاتے ہیں۔ وہاں کے صاحب کمشنر بہادُر نے جو دیکھا کہ عملے میں ہنود بھرے ہیں، اہلِ اسلام نہیں؛ ہنود کو اَور علاقوں پر بھیج دیا اور اُن کی جگہ مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ آفت تو دلّی پر ٹوٹ پڑی ہے؛ لکھنؤ کے سوا، اَور شہروں میں عملداری کی وہ صورت ہے، جو غدر سے پہلے تھی۔[20]

❍❍❍

مَیں نے ایک بار سات روپے کی ہنڈوی بھیج کر [**دستنبو** کی] بارہ جلدیں اور ایک جنتری اُن سے منگوائی، پھر اُن کو اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو، انھیں کے ہاتھوں وہیں سے بھجوائیں اور اُس کے بعد پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھجوا کر دو جلدیں وہیں سے سردھنے کو بھجوائیں۔ غرض، بعد اُس پچاس جلد کے، سولہ جلدیں اَور اُن سے لے چکا ہوں، مگر نقد۔[21]

❍❍❍

خاص میرے پنشن کے باب میں گورنمنٹ سے رپورٹ طلب ہوئی ہے۔ دلّی علاقہ لفٹننٹ گورنری سے انقطاع پا گئی اور احاطہ پنجاب کے تحت حکومت آ گئی۔[22] پنجاب کا نواب لفٹننٹ گورنر بہادُر یہاں کا صدر ٹھہرا۔ اُس دفتر میں میری ریاست کا، میری معاش کا، میری عزت کا نام و نشان

(**18**) خلیق انجم 1989ء، ص 503 (**19**) خلیق انجم 1989ء، ص 504-505 (**20**) خلیق انجم 1989ء، ص 504 (**21**) خلیق انجم 2008ء، ص310 (**22**) خلیق انجم 1989ء، ص726

نہیں ہے۔ ایسے ایسے پیچ پڑ گئے ہیں، کچھ نکل گئے ہیں، کچھ باقی رہے ہیں؛ یہ بھی نکل جائیں گے۔[23] [غرض] رپورٹ یہاں سے لاہور اور لاہور سے کلکتے جائے گی اور اسی طرح پھیر کھا کر نوید حکمِ منظوری آئے گی۔[24]

صاحب کمشنر بہادُر دہلی، جناب سانڈرس صاحب بہادُر نے مجھ کو بلایا۔ جمعہ 25/ فروری کو گیا، ملاقات ہوئی، کرسی دی؛ بعد پُرسشِ مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اُٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب حاکمِ اکبر صدر بورڈ پنجاب [فنانشل کمشنر] کا تمھارے باب میں۔ لکھتے ہیں کہ 'اُن کا حال دریافت کر کے لکھو'، سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکۂ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمد ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا، 'تم نے کتاب کیسی لکھی ہے'؟ اُس کی حقیقت بیان کی۔ کہا، 'ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو'۔ مَیں نے عرض کیا، 'کل حاضر کروں گا'۔ پھر پنشن کا حال پوچھا، وہ بھی گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔ حاکمِ پنجاب کو مقدمۂ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنشن کی پُرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بحکمِ نواب گورنر جنرل بہادُر ہُوا ہے اور یہ صورت مقدمۂ فتح وفیروزی ہے؛ غرض کہ دوسرے دِن [اتوار] یوم التعطیل تھا، مَیں اپنے گھر رہا۔ [پیر] 28/ فروری کو گیا، باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا، 'اچھا، توقف کرو'۔ بعد تھوڑی دیر کے گڑھ کپتان کی چٹھی آئی، سواری مانگی؛ جب سواری آ گئی، باہر نکلے۔ مَیں نے کہا، 'وہ کتابیں حاضر ہیں'۔ کہا، 'منشی جیون لال کو دے جاؤ'۔ وہ اُدھر سوار ہو گئے، مَیں اِدھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ سہ شنبہ یکم مارچ کو پھر گیا۔ بہت التفات اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے لے گیا تھا، وہ دِکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادُر کے نام کا لے گیا تھا، وہ دے کر یہ استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔ 'بہت اچھا' کہہ کر رکھ لیا۔[25] یہ بھی کہا کہ 'اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو'۔ مَیں نے کہا، 'صاحب! یہ کیسی بات ہے کہ اَوروں کو برس دِن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دِلواتے ہو'؟ فرمایا کہ 'تم کو اَب چند روز میں سب

(23) خلیق انجم 1989ء، ص 590 (24) خلیق انجم 1989ء، ص 726 (25) خلیق انجم 1989ء، ص 505-506

روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا، اَوروں کو یہ بات شاید برسوں میں میسر آئے گی'۔ مَیں چپ ہو رہا۔[26] پھر مجھ سے کہا کہ 'ہم نے تمھارے پنشن کے باب میں اجرٹن صاحب کو کچھ لکھا ہے، تم اُن سے ملو'۔ عرض کیا، 'بہتر'۔ اجرٹن صاحب بہادُر گئے ہوئے تھے، کل وہ آئے، آج مَیں نے اُن کو خط لکھا ہے۔[27] دیکھو، سید اسد اللّٰہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا، پھر کس محکمے سے کہ وہ آج سلطنت کا دہندہ ہے، میرے تَفقُّد کا حکم بھجوایا، حکام سے مجھ کو عزت دِلوائی، میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اُسی کا بخشا ہُوا تھا، مَیں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا![28]

○○○

یہاں [دہلی] کا نقشہ ہی کچھ اَور ہے، سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے؟ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی، آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ستائیس مارچ ہے، پانچ چار دِن مہینے میں باقی ہیں، آنچ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔[29]

○○○

مجھ پر میرے اللّٰہ نے ایک اَور عنایت کی ہے اور اس غمزدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ ایک **دستنبو** نواب لفٹننٹ گورنر بہادُر اور دوسری گورنر جنرل بہادُر کلکتہ کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دِن ہے کہ نواب لفٹننٹ گورنر بہادُر کا خط مقامِ الہٰ آباد سے ببسیلِ ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القابِ قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ پنشن کے ملنے کا بھی حکم آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادُر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔[30]

○○○

اِن دِنوں میں **برہانِ قاطع** کو دیکھ رہا ہوں اور اُس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے تو ان نکات کو جمع کر کے اُس نسخے کا نام **قاطعِ برہان** رکھوں گا۔[31] قتیل کو اساتذۂ

(**26**) خلیق انجم 1989ء، ص507 (**27**) خلیق انجم 1989ء، ص506 (**28**) ایضاً (**29**) خلیق انجم 1989ء، ص508 (**30**) ایضاً (**31**) خلیق انجم 1989ء ص590

سلف کے کلام سے قطعاً آشنائی نہیں۔[32] ایک شخص بھیک مانگتا ہے، باپ نے اس کا نام میر بادشاہ رکھ دیا ہے۔ اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ماعلیہ نے تباہ کیا، رہا سہا غیاث الدین رامپور نے کھو دیا۔ ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں؟ وہ خرانِ نامشخص کیا کہتے ہیں اور مَیں خستہ و درد مند کیا بکتا ہوں۔ واللہ، نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ عبد الواسع پیغمبر نہ تھا، قتیل برہمانہ تھا، واقف غوث الاعظم نہ تھا، مَیں یزید نہیں ہوں، شمر نہیں ہوں۔[33]

OOO

اردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں، بہت غزلیں اُس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان، جو اتم اور اکمل تھے، وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہُوا نظر آئے، لے لو۔[34] انھی دِنوں میں ایک صاحب نے مجھے آگرے سے لکھا کہ یہ غزل بھیج دیجیے: اسد اَور لینے کے دینے پڑے ہیں۔ مَیں نے کہا کہ لاحول ولا قوۃ۔ اگر یہ کلام میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسی طرح زمانہ ٔسابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا:

اسد اس جفا پر بُتوں سے وفا کی ۔۔۔ مِرے شیر! شاباش، رحمت خدا کی

مَیں نے سن کر عرض کیا کہ 'صاحب! جس بزرگ کا یہ مطلع ہے، اُس پر بقول اُس کے، خدا کی رحمت اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت'۔[35] بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں۔ یہ مطلع اور یہ غزل ان کے کلامِ معجز نظام میں سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے۔ مَیں نے کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے، ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔[36]

مَیں نے ایک قصیدہ اپنے محسن و مربّیِ قدیم جناب [جارج] فریڈرک اڈمنسٹن صاحب لفٹننٹ گورنر بہادُر غرب و شمال کی مدح میں اور ایک قصیدہ جناب منٹگمری لفٹننٹ گورنر بہادُر ملکِ پنجاب کی تعریف میں لکھا ہے؛[37] ایک پچپن شعر کا، ایک چالیس بیت کا اور پھر فارسی، [ورنہ تو] نہ میرا اَب ریختہ لکھنے کو جی چاہے، نہ مجھ سے کہا جائے۔ اس دو برس میں صرف پچیس تیس شعر بطریقِ قصیدہ [منشی شیو نرائن آرام کی] خاطر سے لکھ کر بھیجے تھے، سوائے اس کے، اگر مَیں نے

(**32**) خلیق انجم 1989 ص 587 (**33**) خلیق انجم 1990ء ص 1019 (**34**) خلیق انجم 1990ء ص 1070 (**35**) خلیق انجم 1995 ص 1494-1495 (**36**) خلیق انجم 1990 ص 1073 (**37**) خلیق انجم 1990 ص 1070

کوئی ریختہ کہا ہو گا تو گنہگار، بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی۔ صرف یہ دو قصیدے لکھے ہیں۔ کیا کہوں کہ دِل و دِماغ کا کیا حال ہے۔[38]

OOO

کتب دستنبو کے بک جانے سے مَیں خوش ہُوا۔ یہ نہ معلوم ہُوا کہ صاحب لوگوں نے خریدیں یا ہندوستانیوں نے لیں؟ ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا، لاکھوں مر گئے؛ جو زندہ ہیں، اُن میں سیکڑوں گرفتارِ بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے، اُس میں مقدور نہیں۔ مَیں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہو گی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی۔ پُورب میں کم بکی ہوں گی۔[39] میرا یہی گمان تھا کہ لاہور کے ضلع میں گئی ہوں گی۔ جناب میکلوڈ صاحب فنانشل کمشنر پنجاب نے بذریعہ صاحب کمشنر دہلی مجھ سے منگوائی تھی، ایک جلد اُن کو بھی بھیج چکا ہوں۔[40]

OOO

میرا قد درازی میں انگشت نما ہے۔ جب مَیں جیتا تھا کہ میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اَب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے، تیسرے دِن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہُوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار، مسی بھی چھوڑی اور داڑھی بھی، مگر اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام؛ مُلّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑہ؛ مُنھ پر داڑھی، سر پر بال؛ فقیر نے جس دِن داڑھی رکھی، اُسی دِن سر منڈایا۔[41]

OOO

جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹننٹ گورنر بہادُر پنجاب کا مہری خط بذریعہ [کمشنر] صاحب بہادُر دہلی آ گیا، [لیکن] پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں۔ اسباب توقع کے فراہم ہوتے جاتے ہیں، دیر آید درست آید۔ اناج کھاتا ہی نہیں ہوں، آدھ سیر گوشت دِن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے۔[42]

OOO

(**38**) خلیق انجم 1990ء، ص 1073 (**39**) خلیق انجم 1990ء، ص 1071 (**40**) خلیق انجم 1990ء، ص 1073
(**41**) خلیق انجم 1989ء، ص 719-720 (**42**) خلیق انجم 1989ء ص 720

دلّی کا حال تو یہ ہے، شعر:

گھر میں تھا کیا، جو تِرا غم اسے غارت کرتا
وہ، جو رکھتے تھے ہم اِک حسرتِ تعمیر، سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے، جو کوئی لوٹے گا۔[43] یہ احاطہ پنجاب میں شامل ہے۔ نہ قانون، نہ آئین؛ جس حاکم کی جو رائے میں آوے، وہ ویسا ہی کرے۔[44] چند روز چند گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا۔ اہل قلم اور اہلِ فوج نے بہ اتفاق رائے ہم دگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا، اَب امن و امان ہے۔[45] مسلمانوں امیروں میں نواب حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں؛ معہذا یہاں کی اقامت میں تذبذب، خدا جانے، کہاں جائیں، کہاں رہیں؟ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔[46] آبادی کا آوازہ پھر فرو ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوئے ہیں۔ کئی ہزار کی بستی ہے، اِن شاء اللہ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا اور جب وہ علاقہ آباد ہو جائے گا تو دوسرا علاقہ شروع ہو گا۔[47]

ایک اخبار، جو گوری سنگر یا گوری دیال یا کوئی اَور غدر کے دِنوں میں بھیجتا تھا، اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرانا:

بہ زر زد سکّۂ کشورستانی سراج الدین بہادُر شاہ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ 'یہ کیا لکھتا ہے'؟ مَیں نے کہا کہ 'غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر؛ خدا جانے، کس نے کہا؟ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر مَیں نے کہہ کر گزرانا ہوتا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہُوا گزرتا اور آپ کو چاہیے، حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے'۔ اُس وقت تو چپ ہو رہا، اَب جو اُس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی رُوبکاری لکھوا گیا کہ 'یہ جو اسد اللہ خاں فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکّہ لکھا۔ ہمارے نزدیک،

---

(43) خلیق انجم 1989ء، ص 720-721 **(44)** خلیق انجم 1989ء، ص 597 **(45)** خلیق انجم 1989ء، ص 721 **(46)** خلیق انجم 1990ء، ص 1074 **(47)** خلیق انجم 1989ء، ص 674

پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے'،[48] [حالانکہ] **مولوی محمد باقر** نے [ہفت روزہ **دہلی اردو اخبار میں**] خبر وفاتِ اکبر شاہ و جلوسِ بہادر شاہ چھاپی تھی۔[49] اکتوبر کی ساتویں آٹھویں تاریخ 1837ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں، ذوق نے اسی مہینے میں یا دو ایک مہینے کے بعد سکے کہہ کر گزارنے ہیں۔[50] [اوّل تو] مَیں نے سکّہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے؟ سبحان اللّٰہ، گولہ انداز کا بارُود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے، شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔[51]

○○○

کمشنر جدید سے ملوں گا۔ جواب از راہِ احتیاط اُس کمشنر کے عہد میں بھی بھیج چکا ہوں، مگر غور نہ کی اور ایک جانب سے مقدمہ کیا۔ مَیں تو 'علی علی' کہہ رہا ہوں؛ جیوں تو، اور مروں تو، کہیں جواب صاف مل چکے تو اس شہر سے چلا جاؤں۔ یہ دو روپیہ بھی اُسی غاصب ملعون [سابق کمشنر دہلی] کی گور میں جائیں، جس نے مجھے دس ہزار روپیہ سال میں سے یہ کچھ دیا ہے۔ علیہ اللعنت و العذاب۔[52]

○○○

پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی ہے۔ ابتداے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زُہد و وَرع منظور نہیں؛ ہم مانعِ فسق و فجور نہیں؛ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ؛ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو، میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے، جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی! مَیں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاوِدانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا مُنھ کو آتا ہے۔ ہے ہے، وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ! چشم بد دُور وہی ایک حور۔[53]

○○○

---

(48) خلیق انجم 1989ء ص 674-675 **(49)** خلیق انجم 1989ء، ص 675 **(50)** خلیق انجم 1989ء، ص 598
(51) خلیق انجم 1989ء ص 768 **(52)** خلیق انجم 1989ء، ص 675 **(53)** خلیق انجم 1989ء، ص 721-722

دِن تھوڑا رہ گیا، باہر تختوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی، چراغ رَوشن ہُوا۔ منشی سید احمد حسین سرھانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں، مَیں پلنگ پر لیٹا ہُوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمانِ علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ، اُس کے سر پر ایک ٹوکرا، اُس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ مَیں نے کہا، 'آہاہا، سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رَسد بھیجی ہے'۔ بارے معلوم ہُوا کہ وہ نہیں ہے، یہ کچھ اَور ہے۔ فیضِ خاص نہیں، لطفِ عام ہے؛ یعنی شراب نہیں، آم ہے۔ خیر، یہ عطیہ بھی بے خلل ہے، بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سربمہر گلاس سمجھا۔ لکیور سے بھرا ہُوا، مگر واہ، کس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اسّی تھے، پندرہ بگڑ گئے، بلکہ سڑ گئے؛ تا اُن کی بُرائی اَوروں میں سرایت نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیے۔ مَیں نے کہا، 'بھائی! یہ کیا کم ہے، مگر مَیں تمھاری تکلیف اور تکلف سے خوش نہیں ہُوا۔ تمھارے پاس روپیہ کہاں، جو تم نے آم خریدے؟ خانہ آباد، دولت زیادہ۔ لکیور انگریزی شراب ہوتی ہے، قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی، جیسا قند کا قوام پتلا۔[54]

OOO

ترپین برس کا پنشن، تقررِ اُس کا بہ تجویز لارڈ لیک و منظوریِ گورنمنٹ اور پھر نہ ملا، نہ ملے گا۔ خیر، ایک احتمال ہے ملنے کا۔ بعض لوگ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں پنشن کی تقسیم کا حکم آ جائے گا۔ [دیکھتا ہوں]، آتا ہے یا نہیں؟ اگر آتا ہے تو مَیں مقبولوں میں ہوں یا مردُودوں میں؟[55] [بہر حال] علی کا بندہ ہوں، اُس کی قسم، کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اِس وقت کلّو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے، نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر، ورنہ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔[56]

OOO

آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزاخانہ ہے، ایک بنائے قدیم رفیع مشہور۔ اُس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہو گا؟ یہاں دو سڑکیں دَوڑتی پھرتی ہیں، ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک

(54) خلیق انجم 1989ء ص 511-512 **(55)** خلیق انجم 1989ء ص 770-771 **(56)** خلیق انجم 1989ء ص 770

آہنی سڑک، محل اُن کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے، جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ محبوب کی دُکانیں، بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچہ سے خاص بازار تک، یہ سب میدان ہو جائے گا؛ امّو جان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے، آثارِ عمارت باقی نہ رہیں گے۔ آج جاں نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے شروع ہو گئے ہیں۔[57] آمد ورفت کا ٹکٹ موقوف ہو گیا۔ فقیر اور ہتھیار جس پاس ہو، وہ نہ آئے اور باقی ہندو، مسلمان؛ عورت، مرد؛ سوار، پیادہ؛ جو چاہے، چلا آئے، چلا جائے؛ مگر بغیر آبادی کے ٹکٹ کے، رات کو شہر میں رہنے نہ پائے۔[58] میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہُوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی۔ کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار، پشمینے کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ مقبرہ کیا، ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اَولاد کے لوگ تمام اُس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اَب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہو گا کہ کہاں ہیں؟ اُن کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا، کچھ تبرکات بھی تھے، اَب وہ لوگ ہی نہیں۔[59]

○○○

قاطعِ برہان چھپوانے کا مقدور نہ تھا، مسودہ کاتب سے صاف کروالیا ہے۔[60]

○○○

[اوّلین] ہنڈوی کے پہنچنے [پر نواب سید محمد یوسُف علی کاظم] کا شکر بجالاتا ہوں، [یعنی] ستمبر 1859ء کے مہینے کے سو روپے پہنچے۔ بڑھاپے نے کھو دیا، جُز نفسے چند مجھ میں کچھ باقی نہیں۔[61]

شہر کی آبادی کا چرچا ہُوا، کرایے کو مکان ملنے لگے۔ چار پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔[62] یہاں کوئی طرحِ آسائش نہیں ہے۔ اہلِ دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے۔ یہ داغ ان کی جبینِ حال سے مٹ نہیں سکتا۔ مَیں اموات میں ہوں، مردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا، معشوق کس کو قرار دُوں، جو غزل کی رِوِش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ ہائے، انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے:

---

(57) خلیق انجم 1989ء ص772 **(58)** خلیق انجم 1989ء ص774 **(59)** خلیق انجم 1990ء، ص1033 **(60)** خلیق انجم 1989ء، ص601-602 **(61)** خلیق انجم 1990ء، ص1186 **(62)** خلیق انجم 1989ء، ص512

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح   اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل[63]

حاکمِ اکبر کی آمد آمد سن رہے ہیں۔ دلّی آئیں یا نہیں؟ آئیں تو دربار کریں یا نہیں؟ دربار کریں تو مَیں گنہگار بلایا جاؤں یا نہیں؟ بلایا جاؤں تو خلعت پاؤں یا نہیں؟ پنشن کا تو نہ کہیں ذکر ہے، نہ کسی کو خبر ہے۔[64] پھر کس دِل سے قصیدہ لکھوں؟ صناعتِ شعر اعضا و جوارح کا کام نہیں، دِل چاہیے، دِماغ چاہیے، ذوق چاہیے، امنگ چاہیے۔ یہ سارا سامان کہاں سے لاؤں، جو شعر کہوں، معہذا کیوں کہوں؟ ولولۂ شباب کہاں؟ رعایتِ فن، اس کے اسباب کہاں؟ اناللّٰہ و انا الیہ راجعون۔[65]

سکّے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا، جیسے کوئی چھرّا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ مَیں نے ہر چند قلمرو ِہند میں **دلّی اردو اخبار** کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبّا مجھ پر رہا، پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان، خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر، جو کچھ ہُوا، چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے، اس کا گلہ کیا۔[66]

کوئی حاکم، کوئی سیکرٹری میرا آشنا نہیں۔ بڑے میرے مربی قدردان جناب اڈمنسٹن صاحب، وہ بھی چیف سیکرٹری نہ رہے، لفٹننٹ گورنر ہوگئے۔ وہ سیکرٹری تھے تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔ اَب تک مَیں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بے گناہ ہوں یا گناہ گار، مقبول ہوں یا مردُود۔ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں، لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔ بہر حال، اس تشویش میں ہوں، راہِ چارہ مسدود اور دُکھ موجود۔[67] پندرہ دِن پہلے تک دِن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی؛ اَب صرف روٹی ملے جاتی ہے، شراب نہیں۔ کپڑا ایامِ تنعم کا بناہُوا ابھی ہے، اس کی کچھ فکر نہیں ہے۔[68] اس پیچ میں ایک اَور پیچ آپڑا ہے۔ اُس کو دیکھ لوں اور پھر صرف اسی کا انتظار نہیں، اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد پنشن کے ملنے نہ ملنے کا تردّد بدستور رہے گا۔ سبک سیر کیونکر بن جاؤں کہ یہ سب امور ملتوی چھوڑ کر نکل جاؤں؟

---

(63) خلیق انجم 1989ء، ص 603 **(64)** خلیق انجم 1989ء، ص 513 **(65)** خلیق انجم 1989ء، ص 603 **(66)** خلیق انجم 1989ء، ص 604 **(67)** خلیق انجم 1990ء، ص 1186-1187 **(68)** خلیق انجم 2008ء، ص 317

پنشن جاری ہوئے پر بھی تو سوا رامپور کے کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ وہاں تو جاؤں اور ضرور جاؤں۔ تین برس ثباتِ قدم اختیار کیا، اَب انجامِ کار میں اضطراب کی کیا وجہ؟[69]

OOO

آج کل یہاں پنجاب احاطے کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ ٹون ڈیوٹی [Town Duty] کے باب میں کونسل ہوئی، پرسوں سات نومبر سے جاری ہو گئی۔ سالک رام خزانچی، چھنامل، مہیش داس، ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطریقِ امانی سپرد ہُوا ہے۔ غلے اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے، خلق کا اژدہام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان رہیں، کرایہ دار نہ رہیں، پرسوں سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ وہ لوگ، جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرایے کے مکان میں رہتے ہیں، وہ بھی آ رہیں، مگر کرایہ سرکار کو دیں۔[70]

دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی: قلعہ، چاندنی چوک، ہر روزہ بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اَب نہیں، پھر دلّی کہاں؟ ہاں، کوئی شہر قلمروِ ہند میں اس نام کا تھا۔[71] جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا۔۔۔، غالبِ افسردہ دل۔[72] فیل خانہ ملک پیر لال ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے۔[73]

OOO

آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے! بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت۔ غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا اُنیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابنِ اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ۔ کیا مَیں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا؟ اے لو، بھول گیا؛ حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ! اُن کو کہاں سے لاؤں؟ غمِ فراقِ حسین مرزا، یوسُف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین،

(**69**) خلیق انجم 1989ء، ص 514 (**70**) خلیق انجم 1989ء، ص 679 (**71**) خلیق انجم 1989ء، ص 514 (**72**) خلیق انجم 1989ء، ص 515 (**73**) خلیق انجم 1989ء، ص 681

میرن صاحب، خدا اُن کو جیتا رکھے؛ کاش! یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے، وہاں خوش ہوتے۔ گھر اُن کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر مَیں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اُن اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔ حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا؛ اُس کی بیٹی، اُس کے چار بچے، اُس کی ماں، یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ اُن کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہو گی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور اُمرا کے ازواج و اَولاد بھیک مانگتے پھریں اور مَیں دیکھوں۔ اس مصیبت کے تاب لانے کو جگر چاہیے۔ ایک بی بی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے؛ کلو، کلیان، ایاز، یہ باہر؛ مداری کے جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی! تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقامِ معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے، وہ بقدر سدّ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دِن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے، ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمل کیونکر کروں؟ بڑھاپا، ضعفِ قویٰ، شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں؛ ورنہ پڑا رہتا ہوں، گویا صاحب فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق، جو بقدرِ طاقت بنائے رکھتا تھا، اَب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعتِ فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اَب نظر نہیں آتی۔ اَب اگر یہاں دربار ہُوا اور مَیں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں؟ دو مہینے دِن رات خونِ جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصور کو دے دیا، وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا۔ اس میں التزام اپنی تمام سرگذشت کے لکھنے کا کِیا ہے۔ جہاں پناہ کی مدح کی فکر نہ کر سکا۔ اس قصیدے سے مجھ کو عرضِ دستگاہِ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔[74] مقصود تو اتنا ہی ہے کہ قصیدہ گزرے اور کچھ ہمارے ہاتھ آئے۔[75]

○○○

---

(74) خلیق انجم 1989ء، ص775-777 **(75)** خلیق انجم 1989ء، ص779

کل مَیں نے فرد فہرستِ دیہات و باغات و املاک مع حاصل ہر یک باغ و دہ و ملک ناظر جی کو بھیج دی ہے۔ یہ فرد کلکٹری کے دفتر سے لی ہے۔ شہر کی عمارت، جو سڑک میں نہیں آئی اور برسات میں ڈھے نہیں گئی، وہ سب خالی پڑی ہے، کرایہ دار کا نام نہیں۔ مجھ کو یہاں کی املاک کا علاقہ حسین مرزا صاحب کے واسطے مطلوب ہے۔ یہ مرتضیٰ علی پہلے سے نیت یہ ہے کہ جو شاہِ اودھ سے ہاتھ آئے، حصہ برادرانہ کروں؛ نصف حسین مرزا اور [نواب یوسُف مرزا] اور سجاد، نصف [میں] مفلسوں کا مدار۔[76] املاک واقع شہر دہلی کے سوال کا جواب اَب کے بار قلم انداز ہُوا۔ مکرر اگر کہا جائے گا تو بے شک یہ جواب آئے گا کہ ہم نے تم کو عوض اُن مکانات کے یہ مکانات دیے، معاوضہ ہو گیا۔ مَیں پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ املاک قتل ہوئی اور وہ سوا لاکھ روپیہ، جو علاوہ زرِ مقرر ملا ہے، وہ دلّی کی املاک کا خوں بہا ہے۔ پرسوں ناظر جی کے نام کے سرنامے میں فردِ فہرست مجموع املاک بھیج چکا ہوں۔ خیر، یہ وار بھی خالی گیا۔ مولانا غالب علیہ الرحمتہ خوب فرماتے ہیں:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

ہے ہے، حسین مرزا اور یہ کہے کہ مَیں کہاں جاؤں اور کیا کروں اور مجھ کم بخت سے اُس کا جواب سر انجام نہ ہو سکے؟ بہت بڑا آسرا تھا اُس سرکار کا، خدمت نہ سہی، عہدہ نہ سہی، علاقہ نہ سہی، سو ڈیڑھ سو درماہہ مقرر ہو جانا کیا مشکل تھا۔ دلّی کے آدمی، خصوصاً امراے شاہی ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ اُن کے سایے سے بھاگتے ہیں۔ مرشد آباد بھی ایک سرکار تھی، حیدر آباد بہت بڑا گھر ہے، مگر بے ذریعہ و واسطہ کیونکر جائے اور جائے تو کس سے ملے، کیا کہے؟[77] مَیں تو پنشن کے باب میں حکمِ اخیر سن لوں، پھر رامپور چلا جاؤں گا۔ جمادی الاوّل سے ذی الحجہ تک آٹھ مہینے اور پھر محرم سے 1277ھ سال شروع ہو گا۔ اس سال کے دو، چار، حد دس گیارہ مہینے، غرض کہ انیس بیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ اس میں رنج و راحت و ذلت و عزت، جو مقسوم میں ہے، وہ پہنچ جائے اور پھر 'علی علی' کہتا ہُوا ملکِ عدم کو چلا جاؤں گا۔ جسم رامپور میں اور رُوح عالمِ نُور میں، 'یا علی، یا علی، یا علی'۔[78]

OOO

(**76**) خلیق انجم 1989ء، ص777 (**77**) خلیق انجم 1989ء، ص779 (**78**) خلیق انجم 1989ء، ص778

آگے کے درباروں میں سات جاگیر دار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہو تا تھا؛ جھجر، بہادُر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو؛ چار معدومِ محض، تین جو باقی رہے، اس میں سے دوجانہ و لوہارو تختِ حکومت ہانسی، حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادُر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس، بس۔ رہے دربارِ عام والے مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہلِ اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں؛ میرٹھ میں مصطفی خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین، بَلّی ماروں میں سگِ دُنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مرُدود و مطرود و محروم و مغموم:

توڑ بیٹھے جب کہ جام و سبو، پھر ہم کو کیا　　　آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے[79]

OOO

صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے، انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے وہ آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رَگ و پے میں دَوڑ گئی۔ دِل توانا ہو گیا، دِماغ رَوشن ہو گیا، نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب![80]

OOO

گورنر جنرل کہاں اور پنشن کہاں؟ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادُر، صاحب کمشنر بہادُر، نواب لفٹننٹ گورنر بہادُر، جب اِن تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرافعہ گورنمنٹ میں کروں، مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، یہاں کے حاکم نے میرا نام دربار کی فرد میں نہیں لکھا۔[81] مَیں نے اس کا اپیل نواب لفٹننٹ گورنر بہادُر کے ہاں کیا ہے۔[82]

OOO

دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہُوا۔ دلّی کے علاقے کے جاگیر دار بموجب حکمِ کمشنر دہلی، میرٹھ گئے۔ موافق دستورِ قدیم مل آئے۔ غرض کہ پنج شنبہ 29/ دسمبر کو پہر دِن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازے کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔[83] بھولو شاہ کی قبر کے سامنے خیمۂ خاصا برپا ہُوا اور باقی لشکر تیس ہزاری باغ تک اترا ہے۔[84] اُسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی

(**79**) خلیق انجم 1989ء، ص 515 (**80**) خلیق انجم 1989ء، ص 515-516 (**81**) خلیق انجم 1989ء، ص 516 (**82**) ایضاً (**83**) خلیق انجم 1989ء، ص 516-517 (**84**) خلیق انجم 1989ء، ص 681

مَیں سوار ہو کر گیا۔[85] میر منشی سے ملا، اُن کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سیکرٹری بہادُر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلّو بھی گیا تھا۔ جواب آیا کہ 'ہمارا سلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے'۔ خیر، مَیں اپنے گھر آیا، کل پھر گیا۔ خبر کروائی، حکم ہُوا کہ 'غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے، اَب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو'؟ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیامِ نومیدیِ جاوید ہے۔[86] مَیں گدائے مبرم اس حکم پر ممنوع نہ ہُوا۔ جب لارڈ صاحب بہادُر کلکتے پہنچے، مَیں نے قصیدہ حسبِ معمولِ قدیم بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ 'اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو'۔ مَیں مایوسِ مطلق ہو کر بیٹھ رہا اور حکامِ شہر سے ملنا ترک کیا۔[87] کمشنر صاحب کا نائب یہاں کوئی نہیں آیا اور نہ کسی انگریزی خواں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اتنا مسموع ہُوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضۂ نقصانِ رعایا کے واسطے تجویز ہُوا ہے اور حکم یہ ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بحساب دہ یک سرکار سے ہو گا؛ یعنی ہزار روپے کے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے، وہ ہدر اور بحل ہے، اُس کا معاوضہ نہ ہو گا۔ شاید یہ وہی کمشنر ہوں۔ مکانات کو حامد علی خاں کا کیوں [کر کہا جائے؟] وہ تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا۔ باغ کی صورت بدل گئی تھی، محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے، اَب پھاٹک اور سر تا سر دُکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہُوا۔ جب بادشاہِ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے؟ کیسا نوندراے، کیسی نقل حکم، کیسا مرافعہ؟ جو احکام کہ دلّی میں صادر ہوئے ہیں، وہ احکامِ قضاو قدر ہیں، ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک رکھتے تھے، نہ پنشن رکھتے تھے۔ رامپور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو لیا۔ مَیں یقین کرتا ہوں کہ ہلالِ ماہِ رجب المرجب رامپور میں دیکھوں۔ زندگی میری کب تک؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے آئندہ سال کے۔ اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر، نہ پانی کی پیاس؛ نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت؛ نہ حاکم کا خوف، نہ مخبر کا خطر؛ نہ مکان کا

---

(85) خلیق انجم 1989ء، ص 517 **(86)** خلیق انجم 1989ء، ص 681 **(87)** خلیق انجم 1989ء، ص 656

کرایہ دینا پڑے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے؛نہ گوشت گھی منگاؤں، نہ روٹی پکواؤں؛عالمِ نور اور سراسر سرُور۔[88]

OOO

کتاب [دستنبو] اور عرضی اواسط ماہِ جنوری میں ولایت کو روانہ، چھ ہفتے میں جہاز پہنچتا ہے، یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہو گا۔[89]

OOO

نواب یوسُف علی خاں بہادُر والی رامپور میرے آشنائے قدیم، گاہ گاہ کچھ روپیہ اُدھر سے آتا رہتا۔ قلعے کی تنخواہ جاری، انگریزی پنشن کھلا ہُوا۔ [غدر کے بعد] جب دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار اُن کے عطیے پر رہا۔ بعد فتحِ دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے اور مَیں عذر کرتا تھا۔[90] [بہر حال، بدھ 19/ جنوری کو] مَیں نے دلّی کو چھوڑا اور رامپور کو چلا، جمعرات اُنیس (20) کو مراد نگر اور جمعہ بیس (20) کو میرٹھ پہنچا۔ آج اکیس (21) کو بھائی مصطفی خاں کے کہنے سے [ان کے ہاں] مقام کیا۔[91] مفت کا کھانا ہے، خوب پیٹ بھر کر کھاؤں۔[92] کل شاہجہاں پور، پرسوں گڑھ مکیٹشر رہوں گا، پھر مراد آباد ہوتا ہُوا رامپور جاؤں گا۔[93]

OOO

[27/ جنوری 1860ء کو رامپور پہنچا۔] رامپور میں مجھے کون نہیں جانتا؟ کہاں مولوی وجیہہ الزماں صاحب، کہاں مَیں؟ اُن کا مسکن میرے مسکن سے دُور، پھر درِ دولتِ رئیس کہاں اور مَیں کہاں؟ چار دِن والیِ شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا۔[94] تعظیم و توقیر بہت، ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ [ڈاک خانہ، یعنی مولوی محمد یحییٰ وکیل کے مکان سے متصل] ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے، رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتّھر تو دوا کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں، کچی دیواریں اور کھپریل، سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں، وہ بھی ایسے ہیں۔ ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ مَیں خود [نواب صاحب] سے [گفتگو کی] ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ

(**88**) خلیق انجم 1989ء، ص 682-683 (**89**) خلیق انجم 1990ء، ص 1080 (**90**) خلیق انجم 1989ء، ص 646 (**91**) خلیق انجم 2008ء، ص 318 (**92**) خلیق انجم 1989ء، ص 629 (**93**) خلیق انجم 2008ء، ص 318 (**94**) خلیق انجم 2008ء، ص 319

سے بالمشافہ نہ کہیں گے؛ مگر بواسطہ کارپردازانِ سرکار۔ دیکھوں، کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں؟ مَیں سمجھا تھا کہ میرے پہنچنے کے بعد جلد کوئی صورت قرار پائے گی، لیکن آج جمعہ آٹھواں دِن میرے پہنچنے کو ہے، کچھ کلام نہیں ہُوا۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلافِ طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس مُنھ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے، 'کوسی'، سبحان اللہ، اتنا میٹھا پانی ہے کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، ہاضم، سریع النفوذ۔ اس آٹھ دِن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا، مگر ہاں، ایک [ملازم] عنایت اللہ دو دِن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر، اچھا ہو جائے گا۔[95]

اس بقعہ معمور سراسر سرور [رامپور] میں غالبِ مغموم بہت مسرور ہے اور کیوں نہ ہو، فقیر کی قدر و منزلت، کیا اہالیِ شہر اور کیا والیِ شہر، ہر دو جانب سے ارزش سے بڑھ کر ہے۔ یہاں کا ارمغان، اہلِ شہر کی کششِ سیرت و صورت اور روشِ خلوص و مروّت ہے یا نواب عالی جناب معلّی القاب [نواب سید محمد یوسُف علی خاں] کا دیدارِ پُرانوار اور گُل افشانیِ گفتار ہے۔ شہر کا حال یہ ہے کہ ذوقِ شعر گوئی و شعر فہمی کا جو پایہ مَیں نے یہاں پایا، جمیع اہلِ ہند کو بھی میسر نہ آیا۔ رامپور کہاں ہے، اس باب میں رُو کشِ شیراز و اصفہان ہے۔ ہر شخص شعر کا فریفتہ، شعر ہر شخص پر فریفتہ۔ نواب صاحب کو پروردگار نے جیسا حسن و تناسبِ اعضا و اندام دیا ہے، ویسا ہی حسنِ تخیل و اعجازِ کلام دیا ہے۔ چند روز ہوئے، بیاضِ مردّف کے اَوراق برائے اصلاح مرحمت فرمائے، لیکن اس سحر حلال کو کوئی کیا ہاتھ لگائے۔ خدا کی قسم، مجھے اس شخص کے حسنِ صورت پر رشک آتا، اگر اپنے تئیں اس کا ہم عصر پاتا۔ بھلا شیریں کلامی پر نہ کیوں رشک آئے۔ مَیں نے صاف صاف عرض کر دیا کہ ان اشعار کے پردے میں ولی نعمت نے معانی کی پریوں کو بند کیا ہے۔ فقیر نے حسبِ ارشادِ خداوند نقطہ ہائے اصلاحی کو ان کی دفعِ نظرِ بد کے لیے دانہ ہائے سپند کیا ہے۔ سُن کے گلے سے لگا لیا اور فرمانے لگے کہ 'مرزا صاحب! آپ کے نقوشِ قدم پر قدم رکھنے کی بے ادبی ہوئی ہے تو معاف فرمایئے، مگر اس میں ہماری عقیدت کو دخل ہے، اس جسارت پر ہنسی نہ اُڑایئے'۔ تعجب [ہے کہ]

(95) خلیق انجم 1989ء، ص630

نواب صاحب کو فرزندِ دلبند[نواب کلب علی خاں] بھی اخلاقِ پسندیدہ و اوصافِ حمیدہ کا مالک ملا ہے۔ خوش گفتار، صاحبِ کردار۔ غرض کئی دِن سے یہی اَوراقِ غزلیات پڑھ رہا ہوں۔[96]

○○○

[رامپور میں] لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دِل بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا، سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپے لے کر دس دِن میں اُٹھاڈالے، پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ داداجان! کچھ ہم کو قرضِ حسنہ دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرضِ حسنہ دیا گیا۔ آج چودہ ہے، مہینا دُور ہے، کَے بار قرض لیں گے۔[97]

○○○

نواب گورنر بہادُر کے چیف سیکرٹری[لکھتے ہیں]:

از دفتر خانہ سیکرٹری اعظم

حکم دیا جاتا ہے کہ عرضی دینے والے کو کہ جواب اس عرضی کا نواب گورنر جنرل بہادُر، بعد دریافت کے ارشاد فرمائیں گے۔

از کیمپ لدھیانہ

28/ جنوری 1860ء[98]

[اور پھر] فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادُر فرماتے ہیں کہ 'ہم تحقیقات نہ کریں گے، پس یہ مقدمہ طے ہُوا۔ دربار خلعت موقوف، پنشن مسدود، وجہ نامعلوم'۔[99]

○○○

[رامپور میں لڑکوں] نے میرا ناک میں دَم کر دیا، [لیکن] تنہا [دہلی واپس] بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے، اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔[100] [چنانچہ] 23/ شعبان [1276ھ بمطابق 17/ مارچ 1860ء] کو رامپور سے چلا اور 30/ شعبان کو دلّی پہنچا۔[101] ماہِ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ مَیں اس مہینے رامپور کیونکر رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے، برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے؛ مگر مَیں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دِن یہاں [دلّی] آپہنچا۔ [25/ مارچ] کو غرّہ ماہِ مقدس ہُوا، اُسی دِن سے ہر صبح حامد

(96) خلیق انجم 1995ء ص1460 **(97)** خلیق انجم 1989ء ص631 **(98)** خلیق انجم 1989ء ص630-631

(99) خلیق انجم 1989ء، ص646 **(100)** خلیق انجم 1989ء، ص 518 **(101)** خلیق انجم 1989ء ص780

علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں، شب کو مسجدِ جامع جا کر نمازِ تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقتِ صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ، واہ، کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔[102]

کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول یہ ہے کہ یہ شخص والی رامپور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا؛ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہو گا تو بھی پانچ چار ہزار روپے سے کم نہ دیا ہو گا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے، مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا، دو سو روپیہ مہینا کر دیا تھا، لفٹننٹ گورنر الہ آباد، جو رامپور آئے اور اُن کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہُوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو، نواب نے برطرف کر دیا۔ اَب اصل حقیقت، نواب یوسُف علی خاں بہادُر تیس تیس برس کے میرے دوست پانچ چھے برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے، جولائی 1859ء سے سو روپیہ مہینا ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے، مَیں گیا، دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بشرطِ حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینا؛ یہاں رہوں، وہاں رہوں؛ خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔[103]

○○○

مَیں رامپور میں تھا کہ ایک خط پہنچا۔ سرنامے پر لکھا تھا، 'عرضداشت عظیم الدین احمد، من مقام میرٹھ'۔ واللہ باللہ، اگر مَیں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہر حال پڑھا، معلوم ہُوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اُٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر، چپ ہو رہا۔ جب مَیں رامپور سے میرٹھ آیا، بھائی مصطفٰی خاں صاحب کے ہاں اُترا، وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوستِ قدیم مجھ کو ملے۔ انھوں نے کہا کہ اپنا اردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجیے گا؛ عظیم الدین، ایک کتاب فروش، اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ دیوانِ ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا، مگر ہاں، مَیں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسُف علی خاں بہادُر کو رامپور بھیج دیا تھا۔ اَب جو مَیں دلّی سے رامپور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی

---

(102) خلیق انجم 1989ء ص518 **(103)** خلیق انجم 1990ء، ص1083

سرکار سے دیوانِ اردو لے کر اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ مَیں نے رامپور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیلِ ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلّی بھیج دیا تھا۔ اَب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا، دیوان تو مَیں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا، مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے؟ نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ 'مَیں'۔ دلّی آکر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر، ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس بھیج دیا، [لیکن اَب] مَیں نے [منشی شیونرائن آرام] کو اور اسی وقت بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور اُن کو لکھا ہے کہ 'اگر چھاپا شروع نہ ہُوا ہو تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے'۔[104] وہ شخص ناآشنا، موسوم بہ عظیم الدین، آدمی نہیں ہے، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے؛ قصہ مختصر، سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر انطباعِ دیوان نامطبوع ہے۔ اَب مَیں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا،[105] [البتہ] بڑی کوشش اور محنت سے اس [دیوانِ ریختہ] کو وہاں [میرٹھ میں] نہ چھپنے دیا اور منگوالیا۔ آج پیر کے دِن پچیس جون کو پارسل ڈاک میں [منشی شیونرائن آرام کو] روانہ کیا۔[106] یقینِ کُلّی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔[107]

❍❍❍

وہ نقشہ پنشن داروں کا، جو یہاں سے صدر کو گیا تھا، وہ اَب صدر سے بعد صدورِ حکم آ گیا۔[108] یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے صاف لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے؛ گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے، میرے پنشن کے اجرا کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہُوا، مَیں نے بھی سنا۔ کہتے ہیں کہ ماہِ آئندہ، یعنی مئی کی پہلی تاریخ کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہو گا۔[109] حکم بہ نسبت ہر واحد کے مختلف ہے۔ تقلیل بہت ہے، سو روپے مہینے والے کو پچھتّر بھی ہیں اور پچیس بھی ہیں اور دس بھی ہیں۔ یاسِ کُلی ہے، لیکن واقع یہ ہُوا ہے کہ سب سے پہلے میرا نام اور پورے پنشن کی واگذاشت کا حکم۔ طرفہ یہ کہ میرے نام کے ساتھ ایک انگریزی

(**104**) خلیق انجم 1990ء ص 1081-1082 (**105**) خلیق انجم 1989ء ص 547 (**106**) خلیق انجم 1990ء، ص 1083 (**107**) خلیق انجم 1989ء، ص 548 (**108**) خلیق انجم 1990ء، ص 1189 (**109**) خلیق انجم 2008ء، ص 322

تحریر ہے، جس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا حکمِ منظوری اس تحریر پر متفرع ہے۔ حکام کے عملے میں اور وُکلا اور اہلِ شہر میں یہ مشہور ہے کہ وہ تحریر ولایت سے آئی ہے۔[110]

OOO

1858ء میں یہ قصیدہ کہ گویا نامۂ منظوم ہے، مَیں نے [نواب سید محمد یوسُف علی خاں کے] حضور میں بھیجا تھا اور بریلی کا ملک ملنے کی تہنیت دی تھی۔ بعد اس کے حضرت کو دامنۂ کوہ کی محال، یعنی کاشی پور ملا، گویا یہ میری تحریر غلط ہو گئی۔ الحمد للہ، انجام کار، جو مَیں نے قصیدے میں قصد کیا تھا، وہی ہُوا۔ مَیں لسان الغیب ہوں یا نہیں؟

چوں نیست مرا شربتِ آبی ز تو حاصل　　　دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل[111]

توقیعِ بریلی بتو فرخندہ کہ من نیز　　　بستم بفرہ مندیِ خویش از کرمت دل[112]

OOO

سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں، تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مد دخرچ ملے تھے، وہ کٹ گے؛ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے؛ رہے دو ہزار روپے، میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور مَیں اس کا قرض دارِ قدیم ہوں۔ اَب جو وہ دو ہزار لایا، اس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔[113] حساب کیا، سود مول سات کم پندرہ سو ہوئے۔ مَیں نے کہا، میرے قرض متفرق کا حساب کر، کچھ اوپر گیارہ سو روپے نکلے۔[114] پندرہ اور گیارہ چھبیس سو ہوئے۔ اصل میں، یعنی دو ہزار میں چھے سو کا گھاٹا۔[115] مَیں کہتا ہوں، یہ گیارہ سو بانٹ دے، نو سو بچے؛ آدھے تُو لے، آدھے مجھے دے۔ وہ کہتا ہے، پندرہ سو مجھ کو دو، پانسو سات تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا، تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آ گیا ہے، مَیں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی، دوست شاد ہو گئے۔ مَیں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ ید اللّٰہی ہے۔ حاکمِ شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنشن پانے کا مستحق نہیں، حاکم صدر مجھ کو پنشن دِلوائے اور پورا دِلوائے۔[116]

(**110**) خلیق انجم 1990ء، ص1189 (**111**) ایضاً (**112**) خلیق انجم 1990ء ص1192 (**113**) خلیق انجم 2008ء ص322 (**114**) خلیق انجم 1989ء، ص520 (**115**) خلیق انجم 2008ء، ص223 (**116**) خلیق انجم 1989ء، ص 520

جنابِ میر وزیر علی خاں صاحب بلگرامی یہاں تشریف لائے اور میرے مسکن سے ایک تیر پر تاب کے فاصلے پر چاندنی چوک میں حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اُترے ہیں۔ ایک دِن فقیر بھی اُن [میر وزیر علی خاں] کے مکان پر چلا گیا تھا۔ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت، دونوں اُن میں جمع ہیں۔ آنکھیں اُن کے حسنِ صورت سے رَوشن ہو گئیں اور دِل اُن کے حسنِ سیرت سے خوش ہو گیا۔ واہ خاکِ پاکِ بلگرام! مَیں نے تو وہاں کے جس بزرگوار کو دیکھا، بہت اچھا پایا۔[117]

○○○

اب کے ایسا بیمار ہو گیا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دِن غذا کھائی۔ اَب اچھا ہوں، تندرست ہوں۔ اَب کے بار درد میں مجھ کو غفلت بہت رہی، اکثر احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔[118]

○○○

لکھنؤ کا کیا کہنا ہے! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی، جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔ اُس باغ کی یہ فصلِ خزاں ہے۔[119] لکھنؤ کی ویرانی پر دِل جلتا ہے، مگر وہاں بعد اس فساد کے ایک کون ہو گا، یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے؛ جو دیکھے گا، وہ داد دے گا اور دلّی کے فساد کے بعد کون نہیں ہے، یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سوائے اس بازار کے، جو قلعے کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہور دروازے تک ہے، سراسر بگڑ گئی ہے اور بگڑتی جاتی ہے۔[120]

○○○

جس کا دِل و دِماغ (باقی) نہ رہا ہو، سخن گوئی کس طرح کرے؛ دِل ہے، لیکن غمگین؛ دِماغ ہے، لیکن افسردہ۔ وہ، جس نے میرے جسم میں دِل اور دِماغ پیدا کیا ہے، اس نے مجھ سے توانائی فکر، تابانِ اندیشہ، ذوقِ شعر گوئی اور اسلوبِ قافیہ واپس لے لیے ہیں؛ جس طرح اہلِ ہند کہتے ہیں، 'داتا کے تین گن: دے، نہ دے، دے کے چھین لے'۔[121] اشعارِ تازہ، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے، جو ایمان سے کفر کو۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آ

(**117**) خلیق انجم 1990ء ص1026 (**118**) خلیق انجم 1989ء ص520 (119) خلیق انجم 1989ء، ص548

(**120**) خلیق انجم 1989ء، ص 547 (**121**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص325۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص757

جاتے ہیں، اصلاح پا جاتے ہیں۔ اردو کا دیوان رامپور سے لایا ہوں اور وہ آگرے گیا ہے، وہاں منطبع ہو گا۔[122] مَیں نے فارسی زبان میں ایک زمانے تک مشقِ سخن کی ہے اور نادر سحر نامے لکھے ہیں۔ اَب کہ دِل ناتوانی کے سبب کاوش نہیں کر سکتا تو مَیں نے ایک سادہ و سہل راہ اختیار کر لی ہے اور جو کچھ مجھے لکھنا ہوتا ہے، اردو میں لکھتا ہوں، گویا مَیں اپنی روزمرہ کی بات چیت کو خط میں لکھ دیتا ہوں۔ حاشا کہ اردو زبان میں سخن آرائی و خود نمائی کا کوئی دستور نہیں، جو بات نزدیک تر لوگوں سے کی جا سکتی ہے، وہی بِلا تکلف دُور والوں سے بھی اسی لب ولہجہ میں ہو سکتی ہے۔[123]

ooo

آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آ گیا کہ پنشن دارانِ قدیم سال میں دو بار بطریقِ شش ماہہ فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار، ساہوکار سے سُود کاٹ کر روپیہ لیا گیا، تا رامپور کی آمد میں مل کر صَرف ہو۔ یہ سُود چھ مہینے تک اسی طرح کٹواں دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی:

رسم ہے مردے کی چھماہی ایک　　خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات　　اور چھماہی ہو سال میں دو بار[124]

ooo

مَیں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔[125] سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپیہ دیا گیا، اَب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یک مشت دیا۔[126] اَب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون میں[127] اس نے مجھ سے پیام، بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو اُٹھوں۔ بے دردنے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالا خانے کا، جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول، اس میں ایک پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سونا، گرمی کی شدت، پاڑ کا قرب؛ گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹگھرا ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔[128] اَب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہمدِگر ایسی ملیں کہ ایک محل سرا

(**122**) خلیق انجم 2008ء، ص 366 (**123**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 317۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص756 (**124**) خلیق انجم 2008ء، ص323 (**125**) خلیق انجم 2008ء، ص367 (**126**) خلیق انجم 2008ء، ص324 (**127**) خلیق انجم 2008ء، ص367 (**128**) خلیق انجم 2008ء، ص324

اور ایک دیوان خانہ ہو، [لیکن] نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بَلّی ماروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رَہوں، [مگر] نہ ملا۔ [علائی کی] چھوٹی پھوپی نے بے کس نوازی کی، کروڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ہر چند، وہ رعایتِ مرعی نہ رہی کہ محل سرا سے قریب ہو، مگر خیر بہت دُور بھی نہیں۔ ایک پاؤں زمین پر ہے، ایک پاؤں رکاب میں۔ توشے کا وہ حال، گوشے کی یہ صورت،[129] [لیکن اس سے پہلے ہی] دوشنبہ 9/ جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آ گیا، وہاں جا رہا، جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اُس مکان کے، بہشت ہے اور یہ خوبی کہ محلہ وہی بَلّی ماروں کا۔ اگر چہ ہے یوں کہ مَیں اگر اَور محلے میں بھی جا رہتا تو قاصدانِ ڈاک وہیں پہنچتے، یعنی اَب اکثر خطوط لال کنویں کے پتے سے آتے ہیں اور بے تکلف یہیں پہنچتے ہیں۔[130]

❍❍❍

پانچ لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہُوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اُس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا؛ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اُس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے؛ تیسرا لشکر کال کا، اُس میں ہزارہا آدمی بھوکے مَرے؛ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مَرے؛ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی؛ مَرے آدمی کم، لیکن جس کو تپ آئی، اُس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اَب تک اُس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں؛ ایک بڑا لڑکا اور ایک میرا داروغہ۔[131]

❍❍❍

یہ دِن مجھ پر بُرے گزرتے ہیں۔[132] برسات اچھی ہوئی ہے، لیکن نہ ایسی کہ جیسی کالپی اور بنارس میں، زمیندار خوش، کھیتیاں تیار ہیں، خریف کا بیڑا پار ہے۔ ربیع کے واسطے پوہ ماہ میں مینہ درکار ہے،[133] شبِ رفتہ کو مینہ خوب برسا۔ ہَوا میں فرطِ برودت سے گزند پیدا ہو گیا۔ صبح کا وقت ہے، ہَوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے۔ ابرِ تنک محیط ہے، آفتاب نکلا ہے، پر نظر نہیں آتا ہے۔[134]

❍❍❍

(**129**) خلیق انجم 2008ء، ص 367 (**130**) خلیق انجم 2008ء، ص 324 (**131**) خلیق انجم 1990ء، ص 989 (**132**) خلیق انجم 1990ء، ص 990-991 (**133**) خلیق انجم 1990ء، ص 989 (**134**) خلیق انجم 1990ء، ص 991

انہدامِ مساکن و مساجد کا حال؟ بانیِ شہر کو وہ اہتمام مکانات کے بنانے میں نہ ہو گا، جو اَب والیانِ ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ اللہ، قلعے میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہے کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں، بلکہ قلعے میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا، سرنگیں کھودی گئیں اور بارُود بچھائی گئی اور مکاناتِ سنگین اُڑا دیے گئے۔[135] بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجاے خود ایک قصبہ تھا، اَب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے؟ صاحبانِ امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دُکان کہاں تھی؟[136] غلّے کی گرانی، آفت آسمانی، امراضِ دموی بلاے جانی، انواع واقسام کے اورام و بثور شائع، چارہ ناسودمند اور سعی ضائع۔ بقدر خصوصیتِ سابق، دلّی ممتاز ہے، ورنہ سر تاسر قلمروِ ہند میں فتنہ و بلا کا دروازہ باز ہے۔[137] اَب اہلِ دہلی، یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔[138]

OOO

ڈاک کا ہرکارہ، جو بلّی ماروں کے محلے کے خطوط پہنچاتا ہے؛ اِن دِنوں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس، کوئی فلاں ناتھ یا ڈھمک داس ہے، حویلی میں آکر اُس [ہرکارے] نے داروغہ کو خط دیا اور اُس [داروغہ] نے خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو، جیسا کہ دلّی کے بادشاہ نے نواب کا خطاب دیا تھا، اَب کالپی سے خطاب 'کپتانی' کا ملا ہے۔ حیران، کہ یہ کیا کہتا ہے۔ سرنامے کو غور سے دیکھا، کہیں قبل از اسم 'مخدوم نیاز کیشاں' لکھا تھا۔ اُس قرمساق نے اَور الفاظ سے قطع نظر کرکے 'کیشاں' کو 'کپتان' پڑھا۔[139]

خانہ نسیاں خراب عشرہ قتالہ کے مرحلے کارَہ پیا ہوں، شاید اگر جیوں گا تو اس کا بھی مجھ کو علم نہ رہے گا کہ مَیں کون ہوں اور کیا ہوں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہوئی،[140] حواسِ ظاہری میں سے سامعہ و شامہ باطل، حواسِ باطنی میں سے حافظہ زائل، بسبب نسیاں کے اکثر مطالب ضروری تلف ہو جاتے ہیں۔ خدایا، کیا اس عمر میں سب آدمی ایسے خرف ہو جاتے ہیں۔[141] مَیں اَب وہ نہیں ہوں۔

(**135**) خلیق انجم 1990ء، ص 993-994 (**136**) خلیق انجم 1989ء، ص 607 (**137**) خلیق انجم 1990ء، ص 994 (**138**) خلیق انجم 1989ء، ص 524 (**139**) خلیق انجم 1990ء، ص 992 (**140**) خلیق انجم 1989ء، ص 785 (**141**) ایضاً

نظم و نثر کا کام صرف پچاس برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے، ورنہ جوہرِ فکر کی رخشندگی کہاں؟ بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے، زور نہیں دِلوا سکتا۔[142]

OOO

برسات بھر کا مینہ نہیں برسا۔ آبِ تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ بارہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ کوار کا مہینا، جسے جاڑے کا دوار کہتے ہیں؛ پانی گرم، دھوپ تیز، روز لو چلتی ہے، جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے۔[143]

OOO

قاری کا کنواں بند ہو گیا، لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر، کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں مَیں سوار ہو کر کنوؤں کا حال معلوم کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہو تا ہُوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ مرزا گوہر کے باغیچے کے اُس جانب کوئی کئی بانس نشیب تھا، اَب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا، یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اَٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال، اَب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر، شہر صحرا ہو گیا تھا، اَب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ! دلّی نہ رہی اور دلّی والے اَب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد! اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟ دلّی کہاں؟ واللہ، اَب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے؛ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔[144] مَیں مع زَن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں،

(**142**) خلیق انجم 1989ء، ص786 (**143**) خلیق انجم 1989ء، ص607 (**144**) خلیق انجم 1989ء، ص524

دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفسِ مطمئنہ بخشا، جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔[145]

○○○

مَیں جو والیِ دکن کی طرف رجوع کروں [تو خدشہ ہے کہ] متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں۔[146]

○○○

سو روپے رامپور کے، ساٹھ روپے پنشن کے، روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور ارزانی امورِ عامہ میں سے ہے۔ دُنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں، قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔[147]

ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکمّا کر دیا ہے۔ رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دُور دراز پیش ہے، زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپُرسیدہ بخش دیا تو خیر، اور اگر باز پُرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی [ذوق] کا کیا اچھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے[148]

❑❑❑

---

(145) خلیق انجم 1989ء، ص 608 **(146)** خلیق انجم 1989ء، ص 609-610 **(147)** خلیق انجم 1989ء، ص 610 **(148)** خلیق انجم 1989ء، ص 551

(9)

عناصر میں اعتدال کہاں

(1861ء-1864ء)

عرفی کے قصائد کی شہرت سے عرفی کے کیا ہاتھ آیا، جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا؟ سعدی نے **بوستاں** سے کیا پھل پایا؟ اللہ کے سوا جو کچھ ہے، موہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے، نہ سخنور ہے؛ نہ قصیدہ ہے، نہ قصد ہے۔ لاموجود اِلّا اللہ۔[1] ایک بُری بھلی شاعری، اُس کا حال یہ ہے کہ آگے جو کچھ کہا، سو کہا، اَب شاعر بھی نہیں رہا۔[2] نسیان کا مرض لاحق ہے، حافظہ گویا نہ رہا، شامہ ضعیف، سامعہ باطل، باصرہ میں نقصان نہیں، البتہ حدت کچھ کم ہو گئی ہے۔[3] گوشہ نشیں، فلک زدہ، اندوہ گیں؛ نہ اہلِ دُنیا، نہ اہلِ دیں۔[4] حق تعالیٰ والیِ رامپور [نواب سید **محمد یوسُف علی خاں**] کو صدوسی سال سلامت رکھے، اُن کا عطیہ ماہ بہ ماہ مجھ کو پہنچتا ہے۔ کرم گستری و استاد پروری کر رہے ہیں۔ میرے رنجِ سفر اُٹھانے کی اور رامپور جانے کی حاجت نہیں۔[5]

○○○

پچاس برس سے دلّی میں رہتا ہوں، ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے، بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلۂ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی اور انگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ اگر مَیں امیر نہیں، نہ سہی؛ اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتانہ پائے۔[6]

---

(1) خلیق انجم 2008ء، ص325-326 **(2)** خلیق انجم 1990ء، ص1037 **(3)** خلیق انجم 1995ء، ص1498
(4) خلیق انجم 1990ء، ص1037 **(5)** خلیق انجم 1995ء، ص1498 **(6)** خلیق انجم 2008ء، ص369

کشمیری کٹرہ بگڑ گیا، وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دورویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔[7] بیگماتِ قلعہ، صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔[8] ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن خاں کہاں؟ ایک آزردہ، سو خاموش؛ دوسرا غالب، وہ بے خود و مدہوش؛ نہ سخنوری رہی، نہ سخن دانی؛ کس برتے پر تتّا پانی۔ ہائے دلّی، وائے دلّی، بھاڑ میں جائے دلّی۔[9]

OOO

مَیں نے [اپنے] پہلے لڑکے کا اسمِ تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی [کہ] میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے، واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔[10]

اَب پھر نہ بھاگوں گا، بھاگوں گا کیا، بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی کب صادر ہو، ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ 1277ھ میں چھوٹ جاؤں گا۔ بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اَور کہیں نہیں جاتا۔ مَیں بھی بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔[11]

OOO

اب کے سال آم کم ہے اور جو کچھ ہے، وہ خشک اور بے مزہ ہے۔ آم کہاں سے ہو؟ نہ مہاوٹ ہے، نہ برسات۔ دریا پایاب ہو گئے، کنویں سوکھ گئے، اثمار میں طراوت کہاں سے ہو؟[12]

OOO

قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا بڑا۔ 1277ھ [میں اپنی وفات] کی بات غلط نہ تھی، مگر مَیں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی، بعد رفعِ فسادِ ہَوا سمجھ لیا جائے گا۔ وبا کی آنچ مدھم ہو گئی ہے۔ پانسات دِن بڑا زور شور رہا۔[13] ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں، وبا آئی تھی۔ تُف بریں وبا۔[14]

OOO

(**7**) خلیق انجم 1989ء، ص522 (**8**) خلیق انجم 2008ء، ص326 (**9**) خلیق انجم 1989ء، ص525 (**10**) خلیق انجم 2008ء، ص368 (**11**) خلیق انجم 2008ء، ص372 (**12**) خلیق انجم 1995ء، ص1499 (**13**) خلیق انجم 1989ء، ص529-530 (**14**) خلیق انجم 1989ء، ص531

قاطع برہان کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا تو مَیں بے شرکتِ غیر اس کو چھپواؤں گا، مگر یہ خیال محل ہے، واللہ علیٰ کُل شیٍٔ قدیر۔[15]

چھاپے کی پنج آہنگیں اَب بھی بکتی ہیں اور معیوب بہ دو عیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو بعد انطباع از قسمِ نثر تحریر ہُوا ہے، وہ اس میں نہیں؛ دوسرے یہ کہ کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔[16]

شغل نگارشِ نظم و نثر مدت سے متروک ہے۔ نثر یہ کہ مکنونِ ضمیر کو زبانِ اردو سے حوالۂ قلم کرتا ہوں۔ میرا ہر خط مکالمہ ہے، نہ [کہ] مراسلہ۔ نظم، قسم [ہے]، اگر دِل میں خیال بھی گزرتا ہو کہ کہا چاہیے، کہنا کیسا![17]

دیوانِ اردو چھپ چکا۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا، حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اور اس کے بانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرنا، جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اَور تھا؛ متوسط، جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اَور تھا؛ اَب جو دیوان چھپ چکے، حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں، یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا، وہ چھپا۔ بہر حال، خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم، مرزا امو جان، مطبع شاہدرہ میں، محمد حسین خاں دلّی شہر میں۔[18]

OOO

گزشتہ ماہ میں کہ سالِ رواں کی فضاے عمر افزا میں ماہِ اگست آگے آگے رواں تھا اور ماہِ صفر پیچھے پیچھے چل رہا تھا، منتخب دیوانِ ریختہ، جس نے حال ہی میں قالبِ طباعت اختیار کیا ہے، مومی جامے میں لپیٹ کر مَیں نے آصف سلیمان منزلت کی (نواب مختار الملک) نظر گاہِ والا میں (کہ وہ روشنانِ فلک کی گزرگاہ ہے) بھیجا ہے۔ مجموعۂ فارسی کو طلب کیا گیا ہے، ہر آئینہ چونکہ **پنج آہنگ و مہرِ نیم روز و دستنبو** [ان] کے پاس ہے، اَب جو مَیں بھیج سکتا ہوں، وہ مجموعۂ نظمِ فارسی ہو سکتا ہے۔

(**15**) خلیق انجم 1989ء، ص 530 (**16**) خلیق انجم 1990ء، ص 1020 (**17**) خلیق انجم 1989ء، ص 732
(**18**) خلیق انجم 1989ء، ص 531

میرا کلام میرے پاس کبھی نہیں رہا۔ اس آراستہ شہر کی تباہی اور آفات و ادبار کی اڑائی ہوئی گرد کے بیٹھ جانے کے بعد ایک جاہ مند شخص نے، جو میرے اعزا میں ہوتے ہیں، اس کی جمع آوری کا ارادہ کیا اور گلیم فقر کی طرح پارہ پارہ کر کے اس کو جمع کیا۔ تقریباً پچاس جزو بہم پہنچے، اَب اس فکر میں ہوں کہ طباعت کے ذریعے اس کی شیرازہ بندی ہو جائے کہ اس صورت میں اس کی دستیابی بہت سے آرزومندوں کے لیے ممکن الحصول ہو۔ اگر یہ نقشِ آرزو درست نہ ہُوا تو پھر مَیں یہ چاہوں گا کہ کوئی اچھا سا لکھنے والا مل جائے اور وہ اسے لکھ دے اور اس طرح اس کی فراہمی کا ایک راستہ نکل آئے اور کاتب کی اجرت طباعت کا خرچ تو ہے نہیں کہ وہ مَیں برداشت نہ کر سکوں اور وہ میری دسترس سے باہر ہو۔[19]

OOO

شہر چپ چاپ؛ نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر مکان اڑایا جاتا ہے؛ نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے؛ دلّی شہر خموشاں ہے۔[20]

OOO

رئیس [نواب یوسُف علی خاں، والیِ رامپور] کی طرف سے بطریق وکیل محکمۂ کمشنری میں معین نہیں ہوں۔ جس طرح اُمرا واسطے فقرا کے وجہِ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح اُس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں، فقیر سے دعاے خیر اور مجھ سے اصلاحِ نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلّی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو۔ ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کرایہ کروں، کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں؛ آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں۔ طاقت کہاں سے لاؤں؟ روٹی کھانے کو، باہر کے مکان میں سے محل سرا میں جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دَم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانے میں آ کر ہوتا ہے۔ والیِ رامپور نے [27/جولائی 1861ء کو منعقدہ] مرشد زادے [یعنی اپنے منجھلے بیٹے سید حیدر علی خاں] کی شادی میں بلایا تھا۔ [میری طرف سے] یہی لکھا گیا کہ 'مَیں اَب معدومِ محض ہوں، تمھارا اقبال تمھارے کلام کو اصلاح دیتا ہے، اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو'۔[21]

---

(19) تنویر احمد علوی 2016ء ص 241-242 **(20)** خلیق انجم 1989ء ص 533 **(21)** خلیق انجم 2008ء ص 376

بھائی [نواب امین الدین خاں] اور [نواب علاء الدین خاں علائی کے] دیکھنے کو جی بہت چاہتا ہے، پر کیا کروں۔ وہاں گئے کو دو برس ہو گئے، یہاں انحطاط و اضمحلال روزافزوں۔ نہ [علائی] یہاں آسکتے [ہیں]، نہ مجھ میں وہاں آنے کا دم۔ بس، اگر نومبر دسمبر میں میرا اخیر حملہ چل گیا، بہتر؛ ورنہ اے وائے ز محرومیِ دیدار دگر ہیچ۔[22] مَیں نہ تندرست ہوں، نہ رنجور ہوں، زندہ بدستور ہوں۔[23] آگ برستی ہے، کیونکر آگ میں گر پڑوں۔ مہینا ڈیڑھ مہینا اَور۔ دے و بہمن [جنوری فروری] بہت دُور ہے، آبان و آذر [نومبر دسمبر] میں بشرطِ حیات [لوہارو کا] قصد کروں گا۔[24]

○○○

میرا [ایک] ہم قوم سراسر قلمروِ ہند میں نہیں، سمرقند میں دو چار یا دشتِ خفچاق میں سو دو سو ہوں گے؛ مگر ہاں، اقربائے سببی؛ پانچ برس کی عمر سے اُن کے دام میں اسیر ہوں، اکسٹھ برس ستم اٹھائے ہیں۔ اللہ اللہ اللہ، دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے، دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ　　　مر گئے، پر دیکھیے، دِکھلائیں کیا[25]

ایک ماتم زدۂ بے نوائے گوشہ نشیں ہوں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام باآں کہ نبی تھے اور نفس مطمئنہ رکھتے تھے، ایک فرزند کے فراق میں اتنا روئے کہ نابینا ہو گئے۔ اس طغیانِ قلزمِ خوں میں میرے ہزار معشوق ایسے ڈوبے کہ اُن کا پتا نہیں ملتا کہ کیا ہو گئے؟ کوئی باپ کہتا تھا، کوئی مرشد جانتا تھا۔ بہر حال، ایک مردۂ متحرک ہوں۔ ایک پاؤں رکاب میں، ایک پاؤں زمین پر، اِرْجِعِیٓ اِلٰی رَبِّکِ [اپنے رب کی طرف لَوٹ چل] کی آوازِ دل نواز کا منتظر۔[26]

مہینا بھر سے بیمار تھا۔ ابتدا قولنج دَورے، بسبب استعمالِ ادویۂ حارّہ کہ اس مرض میں اُس سے گریز نہیں، تپ نے آگھیرا۔ کئی باریاں بھگتیں، اَب دو باریاں ٹل گئی ہیں، طاقت بالکل سلب ہو گئی ہے اور ضعفِ دِماغ نے قریب بہ ہلاکت پہنچا دیا ہے، بالفعل آبِ سیب کا استعمال ہے۔[27] دَورانِ سر میں ایسا مبتلا ہوں کہ والیِ رامپور کا بہت سا کلام یوں ہی دھرا ہُوا ہے، دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔[28]

---

(22) خلیق انجم 2008ء، ص 376 **(23)** خلیق انجم 1995ء، ص 1501 **(24)** خلیق انجم 2008ء، ص 378
(25) خلیق انجم 1990ء، ص 995-996 **(26)** خلیق انجم 1989ء، ص 733-734 **(27)** خلیق انجم 1990ء، ص 1195 **(28)** خلیق انجم 1989ء، ص 556

آج جس وقت مَیں روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا، شہاب الدین، [علائی کا] خط اور مصری کی ٹھلیا لے کر آئے، آدھ پا اوپر دو سیر نکلی، خانۂ دولت آباد۔ یہی کافی ووافی ہے اور اَب حاجت نہیں۔[29]

OOO

مولانا غالب علیہ الرحمۃ اِن دِنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جُز کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی حجم کی ایک جلد **بوستانِ خیال** کی آگئی ہے، سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانے میں موجود ہیں؛ دِن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔[30]

OOO

[معلوم نہیں، نواب ضیاء الدین احمد خاں] کو دیوان [مجھے] دینے میں تامل کیوں ہے۔ ایک جلد ہزار جلد بن جائے، میرا کلام شہرت پائے، میرا دِل خوش ہو، [خود ضیاء الدین کی] تعریف کا قصیدہ اہلِ عالم دیکھیں، [ان کے] بھائی [غالب] کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ [اگر مَیں نواب فخر الدین کو] یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے تو کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے تو مَیں اتنی دُور سے کیوں دوں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان، جو یوسُف مرزا لے گیا ہے؛ سراسر غلط، ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط؛ یہ کام [نواب ضیاء الدین کی] مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور [ان کا] کچھ نقصان نہیں۔[31]

OOO

یہ وہ دلّی نہیں ہے، جس میں [علاء الدین خاں علائی] پیدا ہوئے؛ وہ دلّی نہیں، جس میں [انھوں] نے علم تحصیل کیا؛ وہ دلّی نہیں ہے، جس میں [علائی] شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے؛ وہ دلّی نہیں ہے، جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں؛ وہ دلّی نہیں ہے، جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں؛ [بلکہ اَب یہ] ایک کیمپ ہے، [جس میں] مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ [مقیم ہیں]، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیتہ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینا پاتے ہیں؛ اناث میں سے جو پیرزن ہیں، وہ کٹنیاں اور جوانیں، کسبیاں۔ قصہ کوتاہ، قلعہ اور جھجر اور بہادُر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر، کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں؛ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے![32]

---

(29) خلیق انجم 2008ء ص379 **(30)** خلیق انجم 1989ء، ص529 **(31)** خلیق انجم 1989ء، ص825 ⇦

کلیات کے ساٹھ صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے، کاپی نگار رخصت اپنے گھر گیا۔ **قاطعِ برہان** کا چھاپا ختم ہُوا۔ ایک جلد بطریقِ نمونہ آ گئی۔ مَیں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دی رکھی ہے، اَب پچاس روپے بھیجوں تو انچاس جلدیں منگاؤں۔ [دیکھتا ہوں،] نو من تیل کب میسر ہو اور رادھا کب ناچے؟[33]

OOO

مسجدِ جامع کے باب میں کچھ پُرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار کا حکم آئے اور [مسجد] مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرہ بیٹھا ہُوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔[34]

OOO

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں، انگور سے کم عزیز نہیں۔ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے۔ یہاں دیسی انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ اور لذیذ اور خوشبو افراط سے ہیں، پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بسبیلِ ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔ آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکرے، ہر ٹوکرے میں سو آم۔ کلو داروغہ نے میرے سامنے وہ ٹوکرے کھولے۔ دو سو میں سے تراسی آم اچھے نکلے اور ایک سو سترّ بالکل سڑے ہوئے۔[35]

OOO

اضمحلالِ قویٰ کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی دوست ایسا کہ جس سے تکلف کی ملاقات ہے، آ جائے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ جو کچھ لکھنا ہوتا ہے، اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔[36] حواس بجا نہیں، حافظہ رہا نہیں، اکثر الفاظ بے قصد لکھ جاتا ہوں۔ سترّ سال کی عمر ہوئی، کہاں تک خرافت نہ آئے۔[37] [نواب امین الدین خاں] مجھ کو زندہ سمجھتا ہے، [حالانکہ] مجھے کافور و کفن کی فکر پڑی ہے، وہ ستم گر شعر و سخن کا طالب ہے۔[38]

OOO

⇦ **(32)** خلیق انجم 2008ء، ص 383-384 **(33)** خلیق انجم 1989ء، ص 533-534 **(34)** خلیق انجم 1989ء، ص 887 **(35)** خلیق انجم 1989ء، ص 558 **(36)** خلیق انجم 1990ء، ص 1021 **(37)** خلیق انجم 1990ء، ص 997 **(38)** خلیق انجم 2008ء، ص 390، 391

اس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی، مَیں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ:

پلا دے اوک سے ساقی! جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا ، نہ دے ، شراب تو دے

مقطع یہ:

اسد! خوشی سے مِرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ، ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب مَیں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے اس مقطع اور اُس بیت الغزل کو شامل اُن اشعار کے کر کے، غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلو کے۔ [39]

OOO

وہ زمانہ نہیں، اِدھر متھرا داس سے قرض لیا، اُدھر درباری مَل کو مارا، اُدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جالُوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود؛ شہد لگاؤ، چاٹو؛ نہ مول، نہ سُود؛ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی [نواب احمد بخش] خاں نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دِلوا دیا، کبھی ماں نے آگرے سے کچھ بھیج دیا۔ اَب مَیں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رامپور کے؛ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سُود ماہ بہ ماہ لیا چاہے، مول میں قسط اس کو دینی پڑی۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا؛ سُود جدا، مول جدا؛ بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا؛ آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا، گزارا مشکل ہو گیا، روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بجانِ درویش۔ صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف؛ بیس بائیس روپیہ مہینا بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا، 'تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے'؟ کہا گیا کہ 'جب تک وہ نہ پلائیں گے'۔ پوچھا کہ 'نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے'؟ جواب دیا کہ 'جس طرح وہ جِلائیں گے'۔ بارے مہینا پورا

(39) خلیق انجم 2008ء، ص395

نہیں گزرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہِ مقرری، اَور روپیہ آ گیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا، متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی، گوشت پورا آنے لگا۔[40]

○○○

موّحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللّٰہ کہتا ہوں اور دِل میں لا موجود الا اللّٰہ، لا مؤثر فی الوجود الا اللّٰہ سمجھے ہُوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی، یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی، بلکہ مِنَ اللّٰہ ہے اور امام مِنَ اللّٰہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسن، ثم حسین، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام۔ ہاں، اتنی بات اَور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردُود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہو گا، بلکہ مَیں دوزخ کا ایندھن بنوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا، تاکہ مشرکین اور منکرینِ نبوتِ مصطفوی و امامتِ مرتضوی اُس میں جلیں۔[41]

○○○

پنج شنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ؛ ایک مژہ برہم زدن مینہ نہیں تھما، اس وقت شدت سے برس رہا ہے۔[42] محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں، پاخانہ ڈھ گیا ہے؛ چھتیں ٹپک رہی ہیں، دیوان خانے کا حال اس سے بدتر ہے۔ مَیں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک [مکان] اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے؟ پھر اثنائے مرمت میں مَیں بیٹھا کس طرح رہوں؟[43] آفتاب اس طرح گاہ گاہ نظر آ جاتا ہے، جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دِکھائی دیتے ہیں تو لوگ اُن کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے، کوئی دِن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ ہزارہا مکان گر گئے، سیکڑوں آدمی جابجا دَب کر مر گئے، گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر، وہ اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہُوا؛ یہ پن کال ہے، پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔ جنھوں نے نہیں بویا تھا، وہ بونے سے رہ گئے۔[44]

---

(40) خلیق انجم 2008ء، ص396 **(41)** خلیق انجم 2008ء، ص397 **(42)** خلیق انجم 2008ء، ص394 **(43)** خلیق انجم 2008ء، ص398-399 **(44)** خلیق انجم 1989ء، ص534-535

○○○

مینہ کھل گیا ہے، مکان کے مالکوں کی طرف سے مد د شروع ہو گئی ہے۔ نہ لڑکا ڈرتا ہے، نہ بی بی گھبراتی ہے، نہ مَیں بے آرام ہوں۔ کھلا ہُوا کوٹھا، چاندنی رات، ہَوا سرد، تمام رات فلک پر مریخ پیشِ نظر، دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا، ادھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لطف، رَوشنی کا وہ عالم۔[45] دھوپ آگ سے زیادہ تیز ہے۔ وہی خفقانی اَب روتے پھرتے ہیں کہ کھیتیاں جلی جاتی ہیں۔ اگر مینہ نہ برسے گا تو پھر کال پڑے گا۔ مکانات کے گرنے کا حال یہ ہے کہ چار پانچ برس ضبط رہے، یغمائی لوگ کڑی، تختہ، کواڑ، چوکھٹ، بعض مکانات کی چھت کا مسالا سب لے گئے۔ اَب اُن غربا کو وہ مکان ملے تو ان میں مرمت کا مقدور کہاں؟[46] مَیں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا، گر گیا؛ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔[47]

○○○

میرے ہم وطن ہندی لوگ، جو وادیِ فارسی دانی میں دَم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں؛ جیسا وہ گھاگھس، اُلو عبد الواسع ہانسوی لفظ 'نامراد' کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلو کا پٹھا قتیل 'صفوت کدہ' و 'شفقت کدہ' و 'نشتر کدہ' کو اور 'ہمہ عالم' و 'ہمہ جا' کو غلط کہتا ہے۔ کیا مَیں بھی ویسا ہی ہوں، جو 'یک زمان' کو غلط کہوں گا۔ فارسی کی میزان، یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ للّٰہِ الحمد و للّٰہ الشکر؟[48] معتقدانِ **برہانِ قاطع** برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔[49] ایک صاحب فرماتے ہیں کہ **قاطع برہان** کی ترکیب غلط ہے،[50] یعنی ترکیب خلافِ قاعدہ ہے۔ کلام قطع کیا جاتا ہے، برہان قطع نہیں ہو سکتی ہے۔ لو صاحب، **برہانِ قاطع** صحیح اور **قاطعِ برہان** غلط، مگر 'برہان' 'قطع' کی فاعل ہو سکتی ہے، 'قطع' کا فعل آپ نہیں قبول کرتی۔ **قاطعِ برہان** میں جو 'برہان' کا لفظ ہے، یہ مخفف **برہانِ قاطع** ہے، **برہانِ قاطع** کے ردّ کو قطع سمجھ کر **قاطعِ برہان** نام رکھا تو کیا گناہ ہُوا؟[51] نہ ہٹ دھرم ہوں، نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے۔ دیباچے و خاتمے میں جو کچھ لکھ

---

(45) خلیق انجم 2008ء ص399-400 **(46)** خلیق انجم 1990ء ص1000 **(47)** خلیق انجم 1989ء ص536
(48) خلیق انجم 2008ء ص336 **(49)** خلیق انجم 1990ء ص997-998 **(50)** خلیق انجم 1995ء ص1447
(51) خلیق انجم 1990ء، ص998

آیا ہوں، سب سچ ہے۔ مبدءِ فیض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے، ماخذ میرا صحیح اور طبع سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبتِ ازلی و سرمدی لایا ہوں، مطابق اہلِ پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسبتِ خدادادتربیتِ استاد سے حسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا، فارسی کے غوامض جاننے لگا۔ بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا، **قاطع برہان** کا لکھنا کیا ہے، گویا باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سہامِ ملامت کا ہدف ہُوا، ہے ہے، یہ تنک مایہ معارضِ اکابرِ سلف ہُوا۔[52]

○○○

چند روز سے [نواب سید محمد یوسف علی خاں کے] تَفَقُّد و التفاتِ قدیم میں، خدانخواستہ باشد، کچھ کمی پاتا ہوں۔[53] نواب یوسف علی خاں کا دیوان، بسبیلِ ارمغاں مجھے ایک ورق بھی نہیں بھیجا۔ یہاں کچھ بکتے آ گئے تھے، مَیں نے ایک مول لے کر نواب مصطفیٰ خاں کو جہانگیر آباد بھیجا تھا۔[54]

○○○

مجھ کو اس پر ناز ہے کہ مَیں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں، جس کا ہر گوپال نام اور تفتہ تخلص ہے۔ میرا حقیقی بھائی کُل ایک تھا کہ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا؛ وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور [تفتہ کی] برائی کہتا تو مَیں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔[55]

○○○

7/ نومبر [1862ء]، 14/ جمادی الاوّل، سالِ حال، جمعے کے دِن ابو ظفر سراج الدین بہادُر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے رہا ہوئے۔ اناللّٰہ و انا الیہ راجعون۔[56]

○○○

مسجد جامع واگذاشت ہو گئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دُکانیں بنالیں؛ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ عشرۂ مبشرہ، یعنی دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی صدر الدین، تفضل حسین خاں ابن فضل اللّٰہ خاں؛ یہ تین اور سات اَور[57] [یعنی محمد حسین، نصیر الدین، حافظ داؤد، حافظ میر محمد، محبوب بخش، منشی تراب علی[58]]۔

○○○

---

(52) خلیق انجم 1995ء، ص 1447 **(53)** خلیق انجم 1990ء، ص 1196 **(54)** خلیق انجم 1989ء، ص 538 **(55)** خلیق انجم 2008ء، ص 337–338 **(56)** خلیق انجم 1989ء، ص 539 **(57)** خلیق انجم 1989ء، ص 539 **(58)** بحوالہ خلیق انجم 1989ء، ص 901

مجھ میں کچھ اَب باقی نہیں ہے، بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دِن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا، اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔[59] شراب آج کی اَور ہے، کل سے رات کو نِری انگیٹھی پر گزارا ہے، بوتل گلاس موقوف۔ [اس وقت گھر کے باہر] دھوپ میں بیٹھا ہوں، کھانا تیار ہے؛ گھر [کے اندر] جاؤں گا، ہاتھ مُنھ دھوؤں گا، ایک روٹی کا پھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا، بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا [اور دوبارہ] باہر آؤں گا۔[60]

○○○

شعر و سخن کا مجھ کمترین کی فطرت سے ایک رُوحانی رشتہ ہے اور میرا قلم بدوے شعور سے گہر افشانیاں کرتا رہا ہے۔ کم و بیش تیس سال سے فارسی زبان ہی میں فکرِ سخن کرتا ہوں۔ آج کی صبح کہ خدا کی حمد و ثنا اور خداوند کی ستائش کا زمزمہ چھیڑا اور نمودِ سحر نے میرے دِل میں اجالوں کے دریچے کھول دیے اور ان جاں فزا لمحات میں شصت و ہفت (67) ابیات کے ایک قصیدہ نے پیرایہ نگارش اختیار کیا۔ قصیدہ کیا ہے، ایک نوائے سینہ تاب ہے، جسے زمانے کی آگ نے بے طرح جلا ڈالا ہے یا پھر یہ کہیے کہ عرضِ مدعا کی وہ برق زدہ گھاس ہے، جس نے دُودِ سیاہ کا رنگ اختیار کیا۔ [میری] خوش بختی ہے کہ وہ قبولِ خاطر کی چشم داشت کے سہارے اپنے سوداز دہ دِل کو مطمئن و شاداں رکھتا ہے اور اس تنہائی میں اپنی ہمدمی کی داد دینے کے لائق ہوتا ہے:

بہ التفاف نیرزم در آرزو چہ نزاع　　　نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبی است

جیسا کہ میری ہوس کا تقاضا ہے اور میرے خُوے حرص و آز جس طرف مجھے بلاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر بندہ پرور [والیِ حیدرآباد دکن] کا دِل میری پُرسشِ احوال کے لیے گرم تپش نہ ہو اور پلکیں نم آلود نہ ہو جائیں تو مَیں یہ سمجھوں گا کہ میری 'آہِ نیم سوختہ' میں اَب شعلہ کا کوئی اثر باقی نہیں اور میری طبیعت کی آتش زدہ گیاہ میں مدح سرائی کے لیے اَب کوئی نم موجود نہیں اور جو کچھ مَیں نے لکھا ہے، وہ ہرزہ سرائی ہے، ماہرانہ جنبشِ قلم نہیں۔ غرض اظہارِ بندگی ہے، نہ ارزش کی لاف زنی، اور میرا کام نیروے بخت کی کارسازی سے متعلق ہے نہ آزمندی کی زبان درازی سے۔[61]

---

(59) خلیق انجم 2008ء، ص 338 **(60)** خلیق انجم 1989ء، ص 539، 540 **(61)** تنویر احمد علوی 2016ء، ص 315-316۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ: 2015ء، ص 647-648

اے مظہرِ کل! در ازل آثارِ کرم را　　منت بسر لوح ، ز اسمِ تو قلم را

شمس الامرا کز شرفِ جنتِ نامش　　خود قبلۂ اورنگ نشینانِ عجم را[62]

اساتذہ کے کلام کے مشاہدے میں اگر توغل رہے تو ہزارہا بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ مَیں نے سات شعر امیر خسرو کی غزل پر لکھ کر ایک مطرب کو دیے۔ وہ مجلسوں میں گانے لگا، اکبر آباد و لکھنؤ تک مشہور ہوئے:

از جسم بجاں نقاب تا کے　　ایں گنج دریں خراب تا کے[63]

OOO

ہر دَم دمِ نزع ہے۔ دل، وہ غم سے خوف زدہ ہو گیا ہے کہ کسی بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔ مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔[64] آبکاری کے بندوبستِ جدید نے مارا، عرق کے نہ کھینچنے کی قیدِ شدید نے مارا۔ ادھر انسدادِ روازۂ آبکاری ہے، اُدھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔[65]

OOO

غدر کے رفع ہونے اور دلّی کے فتح ہونے کے بعد میرا پنشن کھلا، چڑھا ہُوا روپیہ دام دام ملا، آئندہ کو بدستور بے کم وکاست جاری ہُوا۔[66] لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار و خلعت بند کر گئے۔[67] دربار اور خلعت، جو معمولی و مقرری تھا، مسدود ہو گیا؛ یہاں تک کہ صاحب سیکرٹری بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ مَیں فقیر متکبر، مایوسِ دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھا رہا اور حکامِ شہر سے بھی ملنا مَیں نے موقوف کر دیا[68] اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔[69]

اخبار میں مَیں نے نواب لفٹننٹ گورنر بہادُر پنجاب، جناب منٹگمری صاحب اور ان کے سیکرٹری ٹامس ڈگلس فورسایتھ صاحب کی اور ان کے میر منشی پنڈت من پھول سنگھ صاحب کی تعریف چھپوائی۔[70] [اسی اثنا میں] فروری 1863ء میں[71] حضرت فلک رفعت نواب معلی القاب

(62) پرتوروہیلہ 2015ء ص648 **(63)** خلیق انجم 1989ء، ص651 **(64)** خلیق انجم 2008ء، ص401 **(65)** خلیق انجم 1989ء، ص632 **(66)** خلیق انجم 1990ء، ص1085 **(67)** خلیق انجم 2008ء، ص339 **(68)** خلیق انجم 1990ء، ص1085-1086 **(69)** خلیق انجم 2008ء، ص339 **(70)** خلیق انجم 1989ء، ص656 **(71)** خلیق انجم 1995ء، ص1568

لفٹننٹ گورنر بہادُر قلمروِ پنجاب دہلی میں تشریف لائے تو[72] اہالی شہر، صاحب ڈپٹی کمشنر و صاحب کمشنر بہادُر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ مَیں تو بیگانۂ محض اور مطرودِ حکام تھا، جگہ سے نہ ہلا، کسی نہ ملا۔ دربار ہُوا، ہر ایک کامگار ہُوا۔ آٹھ فروری کو آزادنہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سیکرٹری بہادُر پاس بھیجا، بلالیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت [ملاقات] کی استدعا کی، وہ بھی حاصل ہوئی۔ دو حاکم جلیل القدر [منشی من پھول سنگھ اور مولوی اظہار حسین خاں بہادُر] کی وہ عنایتیں دیکھیں، جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔[73]

دوم مارچ کو سوادِ مخیم خیامِ گورنری ہُوا۔ آخری روز مَیں اپنے شفیقِ قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادُر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ 'تمھارا دربار خلعت بدستور بحال و برقرار ہے'۔ متحیرانہ مَیں نے پوچھا کہ 'حضرت! کیونکر'؟ حضرت نے کہا کہ 'حاکمِ حال نے ولایت سے آ کر تمھارے علاقے کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے اور بہ اجلاسِ کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللّٰہ خاں کا دربار اور لمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے'۔ مَیں نے پوچھا کہ 'حضرت! یہ امر کس اصل پر متفرع ہُوا'؟ فرمایا کہ 'ہم کو کچھ معلوم نہیں، بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر چودہ یا پندرہ دِن ادھر کو روانہ ہوئے ہیں'۔ مَیں نے کہا، 'سبحان اللّٰہ'۔[74]

3/ مارچ 1863ء کو [لفٹننٹ گورنر پنجاب نے] اس گمنام گوشہ نشین کو یاد فرمایا۔[75] میرا حال یہ ہے کہ علاوہ دائیں ہاتھ کے زخم کے، سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں، اٹھنا دشوار ہے؛ بہر حال سوار ہُوا، گیا۔ پہلے سیکرٹری بہادُر سے ملا، پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔[76] [انھوں نے] از راہِ بندہ پروری کمال عنایت سے خلعت عطا کیا[77] اور ایک شالی رومال سوزن کار اور ایک گلوبند سوزن کار اور ایک الوان کی فرد چار گز کی لمبی، یہ تین کپڑے مجھ کو دیے[78] اور فرمایا کہ 'یہ ہم اپنی طرف سے از راہِ محبت دیتے ہیں'۔[79] میری تعظیم و توقیر اور میرے حال پر لطف و عنایت میری ازرش و استحقاق سے زیادہ، بلکہ میری خواہش

---

(72) خلیق انجم 1995ء، ص 1568 **(73)** خلیق انجم 1989ء، ص 656 **(74)** خلیق انجم 1989ء، ص 656-657 **(75)** خلیق انجم 1995ء، ص 1568 **(76)** خلیق انجم 1990ء، ص 1086 **(77)** خلیق انجم 1995ء، ص 1568 **(78)** خلیق انجم 1989ء، ص 765 **(79)** خلیق انجم 1989ء، ص 761

اور تصور سے سوا مبذول کی۔[80] تصور میں کیا، بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی، وہ حاصل ہوئی؛ یعنی عنایت سی عنایت، اخلاق سے اخلاق![81] سبحان اللہ، جو لوگ متعلق ہیں لفٹننٹ گورنر پنجاب سے، وہ قسمتوں کے کتنے اچھے ہیں۔ جناب وزیر کے مکارمِ اخلاق وہ رُوح فزا کہ جس سے مردہ زندہ ہو جائے۔ صاحب والا مناقب ٹامس ڈگلس فور سایتھ صاحب بہادُر سیکرٹری کے کلماتِ شفقت آمیز وہ رُوح آسا کہ جس کو سُن کر بیمار شفا پائے۔ لفٹننٹ گورنر بہادُر اور صاحب سیکرٹری بہادُر کا کیا کہنا ہے، مگر پنڈت من پھول سنگھ صاحب، میر منشی بھی دیانت و امانت و کارپردازی و مظلوم نوازی میں انتخاب ہیں۔[82] مَیں نے عرض کیا کہ یہ میرا موجبِ اعزاز و افتخار ہے، مگر میری جان الجھی ہوئی ہے لارڈ صاحب کے دربار اور خلعت میں۔ فرمایا، 'اچھا اچھا'۔ دوسرے دِن لارڈ صاحب آئے، تیسرے دِن مَیں لفٹننٹ گورنر پنجاب سے رخصت ہونے گیا، پھر مَیں نے عرض کیا کہ 'مَیں ہمیشہ لارڈ صاحب کے دربار سے سنہری اساوری کے سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالاے مروارید، تین رقم ہمیشہ پایا کیا ہوں اور اَب میرا دربار اور خلعت بند ہے، اس کا مجھ کو غم ہے'۔ فرمایا کہ 'غم نہ کرو، تمھارا دربار اور خلعت کھل گیا۔[83] لارڈ صاحب دلّی میں دربار نہ کریں گے، میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں اُن اضلاع کے علاقہ داروں اور مال گزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے؛ دلّی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا، تم بھی انبالے چلے جاؤ، شریکِ دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔[84] عرض کیا گیا کہ 'حضور کے قدم دیکھے، خلعت پایا'۔[85] مَیں نے اپنا ہاتھ دِکھایا اور کہا کہ 'حضرت! بوڑھا ہوں اور زخمی ہوں۔ انبالے کس طرح جاؤں'؟[86] فرمایا، 'خیر، اَور کبھی کے دربار میں شریک ہونا'۔[87] [بہرحال] لارڈ صاحب بہادُر کا حکم سن لیا، مَیں نہال ہو گیا۔ اَب انبالے کہاں جاؤں؟ جیتا رہا تو اَور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا۔[88] [اب] لفٹننٹ گورنر کی ملازمت [ملاقات] اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اَور وقت پر موقوف رکھا۔[89] لفٹننٹ گورنر بہادُر نے [یہ بھی] فرمایا کہ ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل

---

(80) خلیق انجم 2008ء، ص 401 **(81)** خلیق انجم 1990ء، ص 1086 **(82)** خلیق انجم 1995ء، ص 1568 **(83)** خلیق انجم 1989ء، ص 765 **(84)** خلیق انجم 2008ء، ص 339 **(85)** خلیق انجم 1989ء، ص 657 **(86)** خلیق انجم 1989ء، ص 765 **(87)** خلیق انجم 1990ء، ص 1086 **(88)** خلیق انجم 1989ء، ص 657 **(89)** ⇦

بہادُر نے اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا ہے۔[90]

کیا کہوں کہ کیا میرے دِل پر گزری؟ گویا مردہ جی اٹھا، مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سناٹا گزرا کہ سامانِ سفر انبالہ و مصارفِ بے انتہا کہاں سے لاؤں اور طرہ یہ کہ نذرِ معمولی میری قصیدہ ہے۔ اِدھر قصیدے کی فکر، اُدھر روپے کی تدبیر؛ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دِل و دِماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان۔[91] مَیں نے خبر میں وجدان کا مزہ پایا اور انبالے نہ گیا۔[92]

○○○

مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ مَیں مسودہ نہیں رکھتا؛ جو لکھا، وہ جہاں بھیجنا ہو، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے [علائی کے] پاس بہت ہوں گے[93] [اور] میرے خطوطِ اردو کے ارسال کے بارے میں جو کچھ [علائی] نے لکھا، [ان کے] حسن طبع پر [ان] سے بعید تھا۔ اگر اُن خطوط کا [ان] کو اخفا منظور ہو اور شہرت [ان کے] منافیِ طبع ہے تو ہرگز نہ [بھیجیں]، قصہ تمام اور اگر ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے [دیں] اور کسی متصدی سے نقل اُتروا کر [مجھے] ارسال [کر دیں]۔[94]

○○○

رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی، پھنسی پھوڑا ہو گئی، پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا، زخم بگڑ کر غار ہو گیا، اَب بقدر یک کفِ دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔[95] ہندوستانی جراحوں کا علاج رہا، بگڑتا رہا۔[96] دو ہفتے سے انگریزی علاج ہوتا ہے، کالا ڈاکٹر روز آتا ہے۔[97] سلائیاں دَوڑ رہی ہیں، استرے سے گوشت کٹ رہا ہے، بیس بیس دِن سے صورت افاقت کی نظر آنے لگی ہے۔[98]

○○○

اب مَیں نے جناب کرنیل ڈورینڈ صاحب بہادُر چیف سیکرٹری کو فارسی خط بھیجا ہے اور دو کاغذ انگریزی آمد ولایت، اس خط کے ساتھ بھیجے ہیں۔ اَب دربار اور خلعت کی واگذاشت کی خبر سن کر سیکرٹری صاحب کو خط لکھا ہے، جواب کے آنے پر دِل جمعی کا مدار ہے۔[99]

⇦ خلیق انجم 2008ء، ص 340 (**90**) خلیق انجم 1990ء، ص 1197 (**91**) خلیق انجم 2008ء، ص 339 (**92**) خلیق انجم 1995ء، ص 1424 (**93**) خلیق انجم 2008ء، ص 401-402 (**94**) خلیق انجم 2008ء ص 402 ⇦

○○○

[خطوط کے] طالب کے ذوق کو سست پا کر مَیں متوقف ہو گیا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب، کتب کا سوداگر ہے۔ اپنا نفع نقصان سوچے گا، لاگت بچت کو جانچے گا۔ مَیں متوسط کو مہتمم سمجھا تھا اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا۔ تیس رقعے ایک جگہ سے لے کر اُن کو بھیجے، اُس کی رسید میں انھوں نے طلبِ رقعات بہ تکلیف سوداگر لکھی اور اس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔[100]

○○○

چھ مہینے کی دِن رات کی ٹیس نے جو رُوح تحلیل کی ہے، اَب بڑھاپے میں وہ پھر کہاں سے آئے۔[101] تین برس میں ہر روز مرگِ نَو کا مزہ چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں، پھر مَیں کیوں جیتا ہوں؟ رُوح میری اَب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے، جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں؛ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، رُوح سے نفرت۔[102]

○○○

سالِ گذشتہ [1862ء] میں **قاطع برہان** چھپی، پچاس جلدیں مَیں نے مول لیں، اَب کوئی جلد باقی نہیں ہے۔ دیوان ریختہ کا اس عرصے میں دلّی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا اور تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے۔ فارسی کا دیوان، بیس پچیس برس کا عرصہ ہُوا، جب چھپا تھا، پھر نہیں چھپا؛ مگر سالِ گذشتہ میں منشی نول کشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیاتِ فارسی، جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جُز ہیں، کوئی مصرع میرا اُس سے خارج نہیں۔ اَب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں، ہاتھ آ جائے تو پینسٹھ روپے بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں۔[103]

○○○

⇦ **(95)** خلیق انجم 1989ء، ص 761-762 **(96)** خلیق انجم 1990ء، ص 1085 **(97)** خلیق انجم 1989ء، ص 762 **(98)** خلیق انجم 1990ء، ص 1085 **(99)** خلیق انجم 1989ء، ص 766 **(100)** خلیق انجم 2008ء، ص 403 **(101)** خلیق انجم 1989ء ص 736 **(102)** خلیق انجم 1995ء ص 1503 **(103)** خلیق انجم 1990ء، ص 1044-1045

مولوی غلام غوث خاں بے خبر میر منشی لفٹننٹ گورنر مخلص خالص الاخلاص ہیں، ہرگز اُن کو مدعی سے تلمذ نہیں، البتہ اس کو خوش گو جانتے ہیں اور یہ کبھی نہ ہو گا کہ وہ میرا مقابلہ کریں اور **قاطعِ برہان** کا جواب لکھیں۔ باطل است آنچہ مدعی گوید۔[104]

OOO

مہینا بھر سے زیادہ کا عرصہ ہُوا،[105] ایک پھوڑا دائیں پہنچے میں، جس کو ساعد کہتے ہیں؛ دو پھوڑے بائیں پُہنچے میں، یہ سہل ہیں۔ بائیں پاؤں میں کفِ پا و پشتِ پا سے لے کر آدھی پنڈلی تک ورم اور ورم بھی سخت۔[106] کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رَگیں پھٹنے لگتی ہیں۔[107] مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا، کھولن شروع ہو گئی۔ حکما، جو دو تین یہاں ہیں، ان کی رائے کے مطابق، کل سے نیب کا بھرتا بندھے گا۔ وہ پکالائے گا، تب اُس کو پھوڑنے کی تدبیر کی جائے گی۔ تلوا زخمی، پنڈلی زخمی۔[108] جب کفِ پا میں جراحت کا عمل ہُوا تو قیام کا کہاں ٹھکانا؟[109] لیٹا ہُوا ہوں، دَم بہ دَم پاؤں کے ورم کی ٹیس ہوش اڑائے دیتی ہے۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔[110] صبح سے شام تک، شام سے صبح تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں۔ محل سرائے، اگرچہ دیوان خانے کے بہت قریب ہے؛ پر کیا امکان، جو جا سکوں۔ صبح کو نو بجے کھانا یہیں آ جاتا ہے، پلنگ پر سے کھسل پڑا، ہاتھ مُنھ دھو کر کھانا کھایا، پھر ہاتھ دھوئے، کُلی کی، پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے، اُٹھا اور حاجتی میں پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ مدتوں سے یہ مرض ہے کہ پیشاب جلد جلد آتا ہے۔ صاحبِ فراش اور دَم بہ دَم تقاضاے بول۔[111] بغیر اکڑوں بیٹھے بات نہیں بنتی، پاخانے کو اگرچہ دوسرے تیسرے دِن جاؤں، مگر جاؤں تو سہی۔ اپنا یہ مصرع بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں، 'اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے'۔ مرگ، اَب ناگہانی کہاں رہی، اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہائے، الٰہی بخش خاں مغفور کا کیا مصرع ہے:

آہ! جی جاؤں، نکل جائے اگر جان کہیں[112]

(**104**) خلیق انجم 1995ء، ص 1520-1521 (**105**) خلیق انجم 2008ء، ص 406 (**106**) خلیق انجم 1989ء، ص 613 (**107**) خلیق انجم 2008ء، ص 406 (**108**) خلیق انجم 2008ء، ص 341 (**109**) خلیق انجم 1989ء، ص 613 (**110**) خلیق انجم 1989ء، ص 615 (**111**) خلیق انجم 1989ء، ص 613 (**112**) خلیق انجم 2008ء، ص 406

[ہجری اعتبار سے] ستّر سال کی عمر؛ آلامِ رُوحانی، نہ مَیں کہوں، نہ کوئی باور کرے؛ امراضِ جسمانی میں کیا کلام ہے؟ افعالِ دِماغ ناقص ہو گئے، حافظہ گویا تھا ہی نہیں۔[113] بیٹھ نہیں سکتا، لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔[114]

OOO

بیس برس آگے ابر و باراں میں یا پیش از طعامِ چاشت یا قریبِ شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شرابِ شبانہ معمولی میں مجرانہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں، بڑے بڑے مینہ برسے؛ پینا یک طرف، دِل میں بھی خیال نہ گزرا، بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی ہے۔[115]

OOO

جب اَنبالے میرا جانا نہ ہُوا تو مَیں نے قصیدۂ مدح، جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا، بطریقِ ڈاک جناب چیف سیکرٹری بہادُر کو اس مراد سے بھیجا کہ آپ اس کو جناب نواب معلّی القاب کی نظر سے گزرانیں اور یہ دستورِ قدیم تھا کہ جب مَیں قصیدۂ مدحیہ بھیجتا تو صاحب سیکرٹری بہادُر کا خط بے واسطۂ حکامِ ماتحت مجھ کو آجاتا۔ اَب جو مَیں نے موافقِ معمول قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا، صدائے بر نخاست۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا، ناگاہ کل شام کو جب سیکرٹری بہادُر کا خط ڈاک میں آیا، وہی افشانی کاغذ، وہی القاب۔[116]

OOO

صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پڑا رہتا ہوں۔ نیم مردہ ہوں، قریب بہ مرگ ہوں۔[117] اشعار اصلاح کو بہت جگہ سے آتے تھے، سب کو منع کر دیا ہے۔[118]

OOO

مرزا عباس [بیگ] میری حقیقی بہن کا بیٹا ہے۔ ایک بہن، اس کی مجموع اَولاد۔[119] یہ اپنے والدین کے خاندان کا فخر ہے اور چونکہ اس کی ماں کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے، پس وہ فخر میری طرف بھی عائد ہوتا ہے۔ وہ اپنے جی میں کہتا ہو گا کہ ماموں میری بیٹی کے بیاہ میں نہ آیا اور صَرفِ زر سے جی چرایا ہے۔ مَیں تو زر کو خاک و خاکستر کے برابر بھی نہیں

(**113**) خلیق انجم 2008ء، ص 340 (**114**) خلیق انجم 2008ء، ص 343 (**115**) خلیق انجم 2008ء، ص 341
(**116**) خلیق انجم 1990ء، ص 1198 (**117**) خلیق انجم 1995ء، ص 1424 (**118**) خلیق انجم 2008ء، ص 343 (**119**) خلیق انجم 1995ء، ص 1423

سمجھتا، مگر کیا کروں کہ مجھ میں دَم ہی نہ تھا۔ کاشکے، جب ایسا ہوتا، جیسا کہ اَب ہوں تو سب سے پہلے پہنچتا۔ جی اُس کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔[120]

OOO

[شفیق مکرم و لطف مجسم] منشی نول کشور صاحب یہاں آئے تھے، مجھ سے ملے۔ بہت خوب صورت اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں۔[121] بسبیلِ ڈاک یہاں آئے۔ خالق نے اُن کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے، گویا بجاے خود قران السعدین ہیں۔ انھوں نے [کلیات کی] پہلی قیمت مشتہرۂ اخبار لینی قبول کی، یعنی تین روپے چار آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلّد کے بتیس روپے آٹھ آنے۔[122]

OOO

پرسوں مولوی صدر الدین خاں صاحب کو فالج ہو گیا۔ سیدھا ہاتھ رہ گیا ہے، زبان موٹی ہو گئی ہے، بات مشکل سے کرتے ہیں اور کم سمجھ میں آتی ہے۔ مَیں اپاہج ہوں، جا نہیں سکا؛ جو اُن کو دیکھ آتا ہے، اُس سے اُن کا حال پوچھا جاتا ہے۔[123] اَب میرا انجام کار دو طرح پر متصور ہے، یا صحت یا مرگ۔ پہلی صورت میں خود اطلاع دوں گا، دوسری صورت میں سب احباب خارج سے سُن لیں گے۔[124]

[برادرِ نسبتی] بھائی علی بخش خاں مدت سے بیمار تھے، [31/ دسمبر 1863ء کی] رات کو بارہ پر دو بجے مر گئے، اناللہ و انا الیہ راجعون۔ [نواب ضیاء الدین خاں یکم جنوری کو] بارہ بجے [دوپہر] سلطان جی گئے، مَیں نہ جا سکا۔[125]

OOO

ہائے ہائے، میرا دوست نوروز علی خاں، خدا بخشے اس کو، کیسا لطیف اور خلیق اور دانا آدمی تھا۔ مَیں کیوں افسوس کروں؟ کیا مجھ کو ہمیشہ یہاں رہنا ہے؟ آگے پیچھے سب اُدھر کو چلے جاتے ہیں۔ کوئی دو دِن رہ گیا، کوئی دِن پیچھے چل نکلا۔[126]

OOO

(**120**) خلیق انجم 1995ء، ص 1425 (**121**) خلیق انجم 1989ء، ص 824 (**122**) خلیق انجم 2008ء، ص 407 (**123**) خلیق انجم 2008ء، ص409 (**124**) خلیق انجم 1989ء، ص616 (**125**) خلیق انجم 2008ء، ص 409 (**126**) خلیق انجم 1995ء، ص1596-1597

سال گذشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحبِ فراش رہا۔ اٹھنا دُشوار تھا، چلنا پھرنا کیسا؟ سال بھر میں سے تین حصے دِن یوں گزرے، پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سر سے رُوح قالب میں آئی، اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اَب اگرچہ تندرست ہوں، لیکن ناتواں اور سُست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا، حافظے کو رو بیٹھا۔ اگر اُٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اُٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قدِ آدم دیوار اُٹھے۔[127]

○○○

لارڈ الگن صاحب بہادُر کے وقت میں پھر موافقِ معمول، قصیدہ شملے کے مقامات پر بھیج دیا۔ خلافِ تصور بحسبِ دستورِ قدیم چیف سیکرٹری بہادُر کا خط آ گیا۔ وہی افشانی کاغذ، وہی القاب، وہی تحسین کلام، وہی اظہارِ خوشنودی۔ اَب جو یہ امیر کبیر وائسرائے قلمرو ہند ہوئے، مَیں خدمتِ دیرینہ بجا لایا۔ 13/ فروری 64ء کو قصیدہ مع عرضداشت ارسال کیا، آج تک کہ 7/ مارچ [1864ء] کی ہے، جواب نہیں پایا۔ باوجود سوابق معرفت رسمِ قدیم کا عمل میں نہ آنا خاطر آشوب کیوں نہ ہو؟[128]

○○○

کتنے عزیزان بے مرگ ہیں کہ مَیں ان کی نام شماری بھی نہیں کر سکتا، جو اس ناسزا طوفانِ حوادث [جنگ آزادی] کی تیر باری میں فنا ہو گئے، مگر چند خستہ جان و ناتواں، جن میں سے ایک مَیں بھی ہوں کہ ان کشتگانِ ستم کے داغ اندوہ سے زار و نزار جی رہا ہوں اور ان خستہ جانوں کے حال احوال پر خون کے آنسو بہانا میرا کام رہ گیا ہے۔ خود خستۂ دہر اور ماتم دارِ اہلِ شہر ہوں۔[129]

○○○

حصہ نظم دو سفینوں (بیاض و کتاب) سے زیادہ نہیں۔ کلیاتِ اردو، وہ اس لائق نہیں کہ فارسی زبان کے شہسواروں کے سامنے اس کا نام بھی لیا جائے۔ کلیاتِ فارسی اپنی جگہ پر جامع اور مکمل ہے۔[130]

○○○

(**127**) خلیق انجم 1990ء، ص 1001 (**128**) خلیق انجم 1989ء، ص 658 (**129**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 322-323۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص 728 (**130**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص 323۔ فارسی متن: حوالہ مذکور، ص 729

[علائی] میرے فرزند، بلکہ بہ از فرزند [کہ] اگر میرا صلبی بیٹا اس دید و دانست و تحریر و تقریر کا ہوتا تو مَیں اس کو اپنا یارِ وفادار، ذریعۂ افتخار جانتا۔[131] روپیہ آ گیا؛ دِل سے نکلا، مخزن سے نکلا، ہاتھ سے نہیں نکلا۔ جب ہاتھ سے نکل جائے گا اور جنس مول لی جائے گی اور یہ گند کٹ جائے گا، تب ترساں ترساں پیش گاہِ نادری میں [علائی کے] یہاں آنے کے باب میں کچھ عرض کیا جائے گا۔[132]

OOO

یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔[133] ایک کم ستر برس دُنیا میں رہا؛ کوئی کام دِین کا نہ کیا، افسوس ہزار افسوس۔[134] کہتے ہیں کہ خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ مَیں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافر مطلق ہو گیا۔ موافق عقیدۂ اہلِ اسلام، جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی! نہ دُنیا، نہ دِین۔[135] رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی مَیں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ 'لو، غالب کے ایک اَور جوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ مَیں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے، اَب تو قرض داروں کو جواب دے'۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے 'جنت آرام گاہ' و 'عرش نشیمن' خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادُر، ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ مَیں اُن سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا، بے حیا، بے غیرت۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے؛ یہ بھی تو سوچا ہوتا، کہاں سے دُوں گا۔[136]

OOO

[نواب سید محمد یوسُف علی خاں ناظم کی طرف سے] نوازش نامہ اور اس کے ساتھ دو بہنگیاں دو سو آموں کی پہنچیں، شکرِ نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو۔[137]

(**131**) خلیق انجم 2008ء، ص410 (**132**) خلیق انجم 2008ء، ص412 (**133**) خلیق انجم 1989ء، ص820
(**134**) خلیق انجم 1995ء ص1512 (**135**) خلیق انجم 1989ء ص819 (**136**) خلیق انجم 1989ء، ⇦

OOO

دربارِ لاہور کی Precedence List (مجریہ لاہور 6/ ستمبر 1864ء مرسلہ بہ دفتر کمشنر دہلی بتاریخ 13/ ستمبر سالِ مذکور) دیکھ کر یہ معلوم ہُوا کہ مجھے رئیس زادوں کے زمرے سے نکال کر عوام کے جرگے میں بٹھا دیا ہے اور نذر کے پچاس روپے اور خلعت کے پچھتّر روپے مقرر ہوئے ہیں۔ لازماً حیرت نے مجھے فرومانده کر دیا۔ (چونکہ) یہ سابقہ صورت میں کوئی کمی نہیں، بلکہ ایک نئی ہیئت ترتیب دینا ہے، حیرت کیوں نہ ہو۔ خون نے جوش مارا، حاکمِ پنجاب (لفٹننٹ گورنر رابرٹ منٹگمری) کی درگارہ میں اپنی نالش لے کر گیا اور یہ عرض کیا کہ اگر یہ سزا کسی گناہ کے بدلے کے طور پر ملی ہے تو مجھے وہ خطا بتائی جائے اور اگر ایسا نہیں ہے تو میرے مرتبے میں تخفیف نہ کی جائے اور مجھے میرے (سابقہ) منصب پر بحال کیا جائے؛ (لیکن) منٹگمری صاحب بہادُر نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا اور ولایت چلے گئے۔ اَب دیکھنا ہے کہ فلک رفعت میکلوڈ صاحب بہادُر کیا رائے رکھتے اور کیا حکم فرماتے ہیں۔[138]

OOO

کتاب کا چھاپا یہاں ہی شروع ہو گیا، اِن شاء اللہ بعد انطباع ایک مجلّد [سیاح] کے واسطے اور ایک مجلّد منشی میاں داد خاں کے واسطے بسبیلِ ڈاک پارسل بھیجوں گا۔[139]

دُکانِ بے رونق کا خریدار بننا نیک سیرت افراد کا کام ہے۔ ہر چند انسان کی صفاتِ حسنہ کا کوئی اندازہ و شمار نہیں، لیکن عدل و بخشائش کو ان سب میں سر برآوردہ شمار کیا گیا ہے۔ [مرزا محمد خاں اور مرزا برکت علی] نے **قاطع برہان** اور اس کے منکروں کے باب میں شیوۂ داد و دہش اختیار فرمایا ہے اور دوستی و راستی کی روِش اختیار کر کے مجھ فقیر پر بڑی عنایت کی ہے۔ جب تک کہ مَیں دُنیا میں رہوں گا، [ان] کا ثناخواں اور خیر اندیش رہوں گا۔[140]

وہ جو ایک شخص مجہول الحال [سید سعادت علی] نے اہلِ دہلی میں سے میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے، مسمّی بہ **محرقِ قاطعِ برہان**۔[141] مَیں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا؟ مگر

⇦ ص820 (**137**) خلیق انجم 1990ء، ص1199 (**138**) پرتو روہیلہ 2015ء، ص278۔ فارسی متن: حوالۂ مذکور، ص717 (**139**) خلیق انجم 1989ء، ص561 (**140**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص318-319۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص752 (**141**) خلیق انجم 1989ء، ص659

ہاں، سخن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے۔ دو طالب علموں نے اردو زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے۔[142] مولوی [نجف علی خاں] صاحب مرشد آباد بنگالے میں ہیں،[143] باوجود فضیلتِ علم عربی، فارسی دانی میں اُن کا نظیر نہیں؛ انھوں نے اُس کی توہین اور مسودہ تضحیح میں دو جُز کا ایک نسخہ مختصر [**دافع ہذیان**] لکھا ہے۔[144] مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں، صرف اتحادِ معنوی کے اقتضا سے انھوں نے **دافع ہذیان** لکھ کر فنِ سخن میں مجھ کو مدد دی ہے[145] اور ایک طالب علم مسمی بہ عبدالکریم نے [سید] سعادت علی مؤلف **محرقِ قاطع** سے سوالات کیے ہیں اور ایک محضر اُس نے بہ فتوائے علمائے شہر مرتب کیا ہے۔ ایک میرے دوست نے بصرفِ زر اُس کو چھپوایا ہے۔[146] مؤلف [**محرقِ قاطع**] کا احمق ہے اور جب وہ احمق [سید سعادت علی] **دافع ہذیان و سوالاتِ عبدالکریم** اور **لطائفِ غیبی** [از میاں داد خاں سیاح] کو پڑھ کر متنبہ نہ ہُوا اور **محرق** کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہُوا کہ بے حیا بھی ہے۔[147]

○○○

ستر برس کی عمر ہے، بے مبالغہ کہتا ہوں، ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرۂ خواص میں سے، عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص صادق الولا دیکھے۔ ایک مولوی سراج الدین رحمتہ اللہ علیہ، دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ العلی العظیم؛ لیکن وہ مرحوم حسنِ صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ، دوسرا دوست خیر خواہِ خلق، حسن و جمال چشمِ بد دُور، کمالِ مہر و وفا، صدق و صفا، نورٌ علیٰ نور۔ مَیں آدمی نہیں ہوں، آدم شناس ہوں۔ غایت مہر و محبت، جس کے ملکہ کا [بے خبر] کو مالک سمجھا ہوں، وہ بہ نسبت اپنے اس قدر یقین کرتا ہوں کہ پہلے دو آدمیوں کو اپنے بعد اپنا ماتم دار سمجھا ہُوا تھا۔ ایک کو تو مَیں رو لیا، اَب اللہ آمین کا ایک دوست رہ گیا ہے۔ دعائیں مانگتا ہوں کہ خدایا اُس کا داغ نہ مجھے دِکھائیو، مَیں اس کے سامنے مروں۔[148]

○○○

(**142**) خلیق انجم 1995ء، ص 1527 (**143**) خلیق انجم 1995ء، ص 1537 (**144**) خلیق انجم 1989ء، ص 659 (**145**) خلیق انجم 1995ء، ص 1537 (**146**) خلیق انجم 1989ء، ص 659 (**147**) خلیق انجم 1995ء، ص 1527-1528 (**148**) خلیق انجم 1989ء، ص 660

اس شہر [دلّی] میں ایک میلہ ہوتا ہے پھول والوں کا میلہ کہلاتا ہے۔ بھادوں کے مہینے میں ہُوا کرتا ہے۔ امراے شہر سے لے کر اہلِ حرفہ تک قطب صاحب جاتے ہیں۔ دو تین ہفتے تک وہیں رہتے ہیں۔ مسلمین اور ہنود دونوں فرقے کی شہر میں دُکانیں بند پڑی رہتی ہیں۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور شہاب الدین خاں اور میرے دونوں لڑکے سب قطب گئے ہوئے ہیں۔ اَب دیوان خانے میں ایک مَیں ہوں اور ایک داروغہ اور ایک بیمار خدمت گار۔[149]

○○○

جب سے حضرت [نواب محمد یوسُف علی] کی ناسازیِ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہُوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزری ہے۔ ایک دِن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی، ہم سب نے فاقہ کیا۔[150] یکم نومبر سے گیارہ تک لیل و نہار مجھ پر کیسے گزرے ہیں؟ راہ دُور، مَیں رنجور، معہذا بے مقدور؛ اگر دلّی سے رامپور تک شکرم کی ڈاک جاتی ہوتی تو مَیں یہاں ایک دَم نہ ٹھہرتا اور [نواب صاحب کی] خدمت میں حاضر ہوتا۔ تار برقی بھی نہیں، جو صحت و عافیت کی خبر جلد حاصل ہو۔ ناچار از راہِ اضطرار آٹھ نومبر کو عریضہ روانہ کیا۔ خدا کی عنایت اور مرشدِ کامل، یعنی حضرت کی ہدایت نے اُس خط کے جواب آنے کی مدت سے پہلے مجھے گردابِ اضطراب سے نکالا۔ کل بارہ نومبر کو [ان کی طرف سے] نوازش نامہ آ گیا؛ گویا میری جان بچ گئی، بلکہ ایک اَور نئی جان میرے بدن میں آ گئی۔[151] بارے، خدا کی مہربانی ہوئی، از سرِ نَو میری زندگانی ہوئی کہ کل چار گھڑی رات گئے ڈاک کے ہر کارے نے وہ عطوفت نامۂ عالی دیا، جس کو پڑھ کر رُوحِ تازہ رَگ و پَے میں دَوڑ گئی۔ نیند کس کی، سونا کس کا، رَوشنی کے سامنے بیٹھا اور اشعارِ تہنیت لکھنے لگا۔ سات شعر مع مادّۂ حصولِ صحت، جب لکھ لیے، تب سویا۔[152]

○○○

[نواب میر غلام بابا خاں کی طرف سے] گھڑی کے عطیہ کا شکر ہر گھڑی اور ہر ساعت بجالاتا ہوں۔ پہلے تو دوست اور پھر امیر اور پھر سید۔ نظر ان تین امور پر اس ارمغان کو مَیں نے بہت عزیز سمجھا اور اپنے سر اور آنکھوں پر رکھا،[153] [ورنہ] اصل مقدمہ یہ تھا کہ مَیں **قاطعِ برہان** کو

---

(149) خلیق انجم 1989ء، ص 659 **(150)** خلیق انجم 1990ء، ص 1200 **(151)** خلیق انجم 1990ء، ص 1201 **(152)** خلیق انجم 1990ء، ص 1202 **(153)** خلیق انجم 1990ء، ص 1006

دوبارہ چھاپا چاہتا ہوں، نواب صاحب سو دو سو جلدیں خرید لیں۔ حضرت نے ایک گھڑی عنایت فرمائی۔ بھلا یہ میرے کس کام کی؟ چار دِن سوچا کیا کہ پھیر دوں، پھر سوچا کہ بُرا مانیں گے۔ آخر کو گھڑی رکھ لی اور یہ خیال کیا کہ کتاب کے انطباع کے بعد سو ڈیڑھ سو جلدیں بھیج دوں گا۔[154]

کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتے میں، مولوی عبد الغفور خاں اُن کا نام اور نساخ اُن کا تخلص ہے، میری اُن کی ملاقات نہیں؛ انھوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم بہ **دفترِ بے مثال** مجھ کو بھیجا۔[155] ہم فقیر لوگ اعلانِ کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں۔ شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے، اُن سے بڑھ کر بہ صیغہ مبالغہ، بے مبالغہ نساخ ہیں۔[156]

○○○

[ریٹ گن] تذکرہ شعراے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں، مجھ سے انھوں نے مدد چاہی۔ مَیں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب سے مستعار لے کر اُن کے پاس بھیج دیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تُو اچھی طرح جانتا ہے، ان کا حال لکھ بھیج؛ مَیں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے، بقید اس کے کہ اَب زندہ موجود ہیں۔[157]

○○○

اَب کے رجب کی آٹھویں تاریخ [1281ھ بمطابق 8/ دسمبر 1864ء] سے ہفتادم شروع ہُوا۔ جس طرح بڑھے جیتے ہیں، مَیں بھی جیتا ہوں۔[158] شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رامپور سو روپے مہینا دیتے ہیں؛ سالِ گذشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام ہے اور مَیں اپنے میں حواس نہیں پاتا، متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوضِ خدماتِ سابقہ شمار کیجیے تو مَیں 'سکہ لمبر' سہی، ورنہ خیرات خوار سہی اور اگر یہ عطیہ بشرطِ خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے، وہی میری قسمت ہے۔ برس دِن سے ان کا کلام نہیں آتا، فتوحِ مقرری نومبر تک آئی۔ آج تک نواب صاحب ازراہِ جوانمردی دیے جاتے ہیں۔ مَیں تو چراغِ دمِ صبح و آفتابِ سرِ کوہ ہوں۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔[159]

(**154**) خلیق انجم 1989ء، ص 561 (**155**) خلیق انجم 1989ء، ص 661 (**156**) خلیق انجم 1995ء، ص 1463 (**157**) خلیق انجم 2008ء، ص 346-347 (**158**) خلیق انجم 1995ء، ص 1595 (**159**) خلیق انجم 2008ء، ص 348-349

❍❍❍

ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا، ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا، تین رسالے نثر کے، یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے ہیں۔ اَب اَور کیا کہوں گا؟ مدح کا صلہ نہ ملا، غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔ سچ تو یوں ہے کہ قوتِ ناطقہ پر وہ تصرف اور قلم میں وہ زور نہ رہا؛ طبیعت میں وہ مزہ، سر میں وہ شور نہ رہا۔ پچاس پچپن برس کی مشق کا ملکہ کچھ باقی رہ گیا، اس سبب سے فنِ کلام میں گفتگو کر لیتا ہوں۔ حواس کا بھی بقیہ اسی قدر ہے کہ معرضِ گفتار میں مطابق سوال، جواب دیتا ہوں۔[160]

❍❍❍

میرا طریق اس فنِ خاص [یعنی اصلاحِ سخن] میں یہ ہے کہ جو شعر بے عیب ہوتا ہے، اُس کو بدستور رہنے دیتا ہوں اور جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں، اُس کی وجہ خاطر نشان کر دیتا ہوں، تاکہ آئندہ صاحبِ کلام اُس قسم کے کلام میں اپنے کلام کا مصلح رہے۔[161]

❑❑❑

---

(160) خلیق انجم 1995ء، ص1463-1464 **(161)** خلیق انجم 1989ء، ص835

(10)

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے

(1865ء-1869ء)

مَیں نے اپنے صرفِ زر سے **لطائفِ غیبی** کی جلدیں نہیں چھپوائیں، مالکِ مطبع نے اپنی بکری کے لیے چھاپیں۔ بیس مَیں نے مول لیں، تیس [سیاح] کو دِلوادیں، بیس بھائی ضیاء الدین خاں نے لیں، دس [نواب] مصطفی خاں [شیفتہ] نے لیں، باقی کا حال مجھے نہیں معلوم۔[1]

○○○

کیا کہوں کہ کیا حال ہے، پیش ازیں اپنا یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

بس ، ہجومِ نااُمیدی! خاک میں مل جائے گی
یہ جو اِک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

اب اس زمزمے کا بھی محل نہ رہا، یعنی سعیِ بے حاصل کی لذت خاک میں مل گئی، انا للہ و انا الیہ راجعون۔[2] خدا کی قسم کہ مَیں اَب بہت ناتواں ہو گیا ہوں۔[3]

○○○

کیسے ریٹی گن صاحب، کہاں ریٹی گن صاحب! 19/ جنوری [1865ء] کو وہ [ملتان یا پشاور کے ضلع میں کہیں حاکم ہو کر] پنجاب کو گئے۔ مَیں اپنی ناتوانی کے سبب ملاقاتِ تودیع کو نہیں گیا۔[4]

○○○

اگرچہ یک فنہ ہُوں، مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم! مَیں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے

---

(1) خلیق انجم 1989ء، ص562 (2) خلیق انجم 1989ء، ص543 (3) خلیق انجم 1995ء، ص1540 (4) خلیق انجم 2008ء، ص349

مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدرِ ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سُوت کے رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں؛ کبھی شیراز جانکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں؛ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے، نہ سہی؛ جس شہر میں رہوں، اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آؤں۔ وہ، جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے، وہ مَیں ہوں۔[5]

OOO

نواب لفٹننٹ گورنر جدید آئے، دربار کیا۔ میری تعظیم اور عنایت میری تمنا سے زیادہ کی۔[6]

OOO

[21/ اپریل 1865ء کے دِن نواب سید محمد یوسُف علی خاں انتقال کر گئے اور نواب کلب علی خاں نواب رامپور قرار پائے۔[7]]

رامپور سے اپریل کا روپیہ اور تعزیت و تہنیت کے خط کا جواب آگیا، آئندہ جو خدا چاہے۔[8]

OOO

بڑے دریبے کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا، کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی، سڑک کی وسعت دوچند ہو گئی۔ اللہ اللہ، گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں، ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم پھرّاتے ہیں۔ ایک شیر زورآور اور پیل تن بندر [crane] پیدا ہُوا ہے، مکانات جابجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ واہ رے بندر! یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر۔[9]

OOO

حضرت فردوس مکان آستاں [نواب سید محمد یوسُف علی خاں] کا معمول تھا کہ محرم سے دو تین مہینے پہلے سلام پانچ سات لکھتے تھے اور فرداً فرداً میرے پاس بھیجا کرتے تھے۔ جب وہ فراہم ہو چکتے تو محرم سے دو چار دِن پہلے مَیں اصلاح کر بھیج دیا کرتا تھا۔ اَب کے برس ایک ہی سلام بھیجنے پائے۔ بس، آج وہ سلام اس مراد سے حضور [نواب کلب علی خاں کی خدمت] میں بھیجتا ہوں کہ [ان] کے حکم سے [ان کے والد مرحوم] کے دیوان میں شامل ہو جائے۔[10] حضرت فردوس مکان کا دستور تھا کہ جب مَیں قصیدہ بھیجتا، اُس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا بھیجا جاتا۔ دو سو پچاس کی

(5) خلیق انجم 2008ء، ص 417 (6) خلیق انجم 1989ء، ص 633 (7) بحوالہ غالب 1996ء، ص 94 (8) خلیق انجم 2008ء، ص 352 (9) خلیق انجم 1989ء، ص 685 (10) خلیق انجم 1990ء، ص 1206

ہنڈوی اُس خط میں ملفوف عطا ہُوا کرتی تھی۔ دو قصیدے مدحیہ میرے دیوانِ فارسی میں مرقوم اور وہ دیوانِ حضرت [ناظم] کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ یہ رسم بُری نہیں ہے، اگر [نواب کلب علی خاں کی سرکاری سے بھی] جاری رہے تو بہتر ہے۔[11]

حضرت [نواب کلب علی خاں] کی خدمت میں نہ [جاؤں] گا تو اَور کہاں جاؤں گا۔ [ابھی تو] وہ آگ برستی ہے کہ طیور کے پَر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے، پانی برسے گا۔ سفر، خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔[12] خلق کو مینہ درکار ہے اور ہَوا شرارہ بار ہے۔ پانی جگر گداز، ہَوا جانستاں، امراضِ مختلفہ کا ہجوم جہاں تہاں۔ جُز اعضائے انسان کے کہ وہ پسینے میں تر ہیں، طراوت ور طوبت کا کہیں پتا نہیں۔ یا لُو چلتی ہے یا مطلق ہَوا نہیں۔[13]

○○○

تین برس عوارضِ احتراقِ خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی۔ اَب مَیں اپنے زبان سے یہ کیونکر کہوں کہ اچھا ہوں، مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں۔ بوڑھا، بہرہ، اپاہج، بد حواس، ناتواں، فلک زدہ آدمی ہوں۔[14]

○○○

وکیلِ حاضر باشِ دربارِ اسد اللّٰہی، یعنی [نواب علاء الدین احمد خاں] علائی مولائی نے اپنے موَکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو کی غزل لکھوائی۔ اگر [ان] کو پسند آ جائے تو [خواہش ہے کہ] مطرب کو سکھائی جائے۔ جھنجوٹی کے اونچے سُروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا تو جاڑوں میں [لوہارو] میں آکر مَیں بھی سُن لوں گا [مطلع و مقطع]:

مَیں ہوں مشتاقِ جفا ، مجھ پہ جفا اَور سہی
تم ہو بیداد سے خوش ، اس سے سوا اَور سہی

مجھ سے ، غالب! یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اَور سہی[15]

○○○

---

(11) خلیق انجم 1990ء، ص1207 (12) خلیق انجم 1990ء، ص1208 (13) خلیق انجم 1990ء، ص1209
(14) خلیق انجم 1990ء، ص1030-1031 (15) خلیق انجم 1989ء، ص687-688

میرے پاس روپیہ کہاں، جو **قاطع برہان** کو دوبارہ چھپواؤں۔ پہلے بھی نواب [سید محمد یوسُف علی خاں] مغفور نے دو سو روپے بھیج دیے تھے، تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اَب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہِ مقرری کے ساتھ دو سو پہنچیں گے، وہ آخر اپریل 1865ء میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیسِ حال سے مَیں نے پایا۔ مصرفِ کتاب کا روپیہ نہ آیا، یاد دِلاؤں گا؛ مگر اُس مرحوم کا وعدہ سر رشتۂ دفتر سے نہ تھا، جو ازرُوے دفتر اس کی تصدیق ہو۔ بہر حال، فکر میں ہوں، اگر اسباب نے مساعدت کی، فہوالمراد، ورنہ، آنچہ مادر کار داریم اکثرے در کار نیست۔[16]

OOO

نہ مجھ کو مناظرے کا دِماغ ہے، نہ ہجومِ امراضِ جسمانی و آلامِ رُوحانی سے فراغ؛ آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقعِ مدد گاری تھی تو اپنا یہ شعر اردو میرے وردِ زبان اور اس ہنجار سے مَیں زمزمہ سنجِ فغاں رہتا تھا:

رات دِن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ ، گھبرائیں کیا

اب جو اصلاحِ حال و حصولِ مطالب سے دِل مایوس ہے تو طبیعت اسی غزل کے اس بیت کے ترنم سے مانوس ہے:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ مر گئے پر ، دیکھیے ، دِکھلائیں کیا

کوئی یہ نہ سمجھے کہ بڑا رونا رِزق کا ہے، جب معاش مقرر ہو تو پھر غم کیا ہے؟ یہ باتیں جانوروں کی ہیں کہ کچھ کھا لیا، پانی پی لیا اور چین سے سو رہے۔ آدمی عموماً اور صاحبانِ ننگ و ناموس خصوصاً، باوجودِ فراغِ معاش ایسی جاں گداز بلاؤں میں مبتلا ہیں کہ کوئی کیا کہے۔ یہ حال تو یا صاحبِ واقعہ جانے یا خدا جانے، دوسرے سے یہ کار اُفتادہ کیوں کہے اور بغیر کہے دوسرا کیا جانے۔[17]

OOO

اگرچہ یہاں مینہ اسی قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمین دار حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھو لیں، مگر چونکہ بفرمانِ ازلی میرے رِزق کی برات [نواب کلب علی خاں] پر ہے اور [ان] کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابرِ رحمت کے شکریے میں ایک قطعہ:

---

(16) خلیق انجم 1989ء، ص 563-564 (17) خلیق انجم 1995ء، ص 1480

مقامِ شکر ہے ، اے ساکنانِ خطۂ خاک!
رہا ہے زور سے ، ابرِ ستارہ بار ، برس
کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟
بیار ، لامیِ گلنار گوں ، ببار ، برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پر ، اے ابر! بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو مَلک ، وہ کہے
امیر کلبِ علی خاں جئیں ہزار برس
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس ، بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو ، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس[18]

○○○

کل برخوردار نواب مرزا خاں داغ [دہلوی] کی تحریر سے معلوم ہُوا کہ حضرت [نواب کلب علی خاں] کا مزاجِ اقدس ناساز ہو گیا تھا، اَب خدا کے فضل سے افاقت ہے۔[19] مَیں طبیب نہیں، مگر تجربہ کار ہوں۔ سترّ برس کا آدمی ہوشیار ہوں۔ خدا جانے، اَور طبیب کیا سمجھے ہوں گے کہ کیا تھا، میرے نزدیک [انھیں] بہ اشتراکِ معدہ و قلب یہ مرض طاری ہُوا تھا۔ اَب [انھیں] حفظِ صحت کے واسطے گاہ گاہ نار جیلِ دریائی و جدوار کا استعمال ضرور ہے اور معجونِ طلائی عنبری تقویتِ قلب میں مجوزۂ حکیم ببر علی خاں مغفور ہے۔ ورق طلا، عنبر اشہب، عرقِ کیوڑہ، قند؛ کثرتِ اجزا اس

(18) خلیق انجم 1990ء، ص 1209-1210 (19) خلیق انجم 1990ء، ص 1211

ترکیبِ خاص میں ناپسند، کثیر الاجزا اَور معجونین ہیں۔ مفرحِ بو علی سینا، خمیرۂ مروارید، خمیرۂ گاؤزبان عنبری، ماءاللحم غیر مُنَشّی، جس میں طیور کے گوشت اور ادویۂ مفرّح و مقوّی حرارت وبرودت میں معتدل۔ گاہ گاہ سکنجبین وگلاب پی لیا[کریں]۔ غذا میں گوشت طیور اکثر، بیضہ نیم برشت اکثر، لیکن بیضۂ مرغ و لحمِ طیور ایک جلسہ میں تناول نہ[فرمائیں]۔ بکری کے گوشتِ کے ساتھ بیضۂ مرغ جائز اور لذیذ اور مرغوب۔ پودینے کا عرق، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دواخانے میں موجود رہے۔ عطریات کے استعمال میں مبالغہ، بعد غذا مباشرت سے پرہیز۔ شوربائے پاچۂ گوسفند مائدۂ خاص پر موجود رہے، بحسبِ طبیعت نوشِ جاں فرماتے[رہیں]۔[20]

○○○

چھوٹے صاحب[میر غلام باباخاں]نے بڑی جواں مردی اور بڑی ہمت کی۔ نہ مَیں نے اُن کو دیکھا، نہ انھوں نے مجھ کو دیکھا؛ نہ میرا کوئی حق اُن پر ثابت، نہ اُن کو کوئی خدمت سے مجھ لینی منظور؛ خیر، فقیر ہوں، جب تک جیوں گا، دعا دوں گا؛ تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔[21] [**قاطع برہان** کے دوسرے ایڈیشن کے لیے ایک سو روپے[22]بطور]عطیہ حضرت[نواب میر غلام باباخاں]بتوسط جناب سیف الحق پہنچا اور مَیں نے اس کو بے تکلف عطیۂ مرتضوی سمجھا۔ علی المرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا[ان]کا دادا اور میرا آقا۔ خدا کا احسان ہے کہ مَیں احسان مند بھی ہُوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا۔ آج سے[**قاطع برہان** کی]کاپی لکھی جانے لگی اور تصحیح کو میرے پاس آنے لگی۔ چھاپے کے واسطے برسات کا موسم اچھا ہے، بس اَب اس کے چھپ جانے میں دیر کیا ہے۔[23]

○○○

مَیں عازمِ رامپور تھا، اسباب مساعد ہو گئے۔[24] رامپور کی سرکار کا فقیر تکیہ دارِ روزینہ خوار ہوں۔ رئیسِ حال نے مسند نشینی کا جشن کیا، دعا گوے دولت کو درِ دولت پر جانا واجب ہُوا۔[25] تقریب وہاں کے جانے کی رئیس مرحوم کی تعزیت اور رئیسِ حال کی تہنیت۔[26] ہفتے کے دِن [7/اکتوبر1865ء]دو تین گھڑی دِن چڑھے راہی ہُوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں، وہاں قافلے

(**20**) خلیق انجم1990ء، ص1218 (**21**) خلیق انجم1989ء، ص564-565 (**22**) بحوالہ خلیق انجم1990ء، ص1355 (**23**) خلیق انجم1990ء، ص1007 (**24**) خلیق انجم2008ء، ص419 (**25**) خلیق انجم1990ء، ص1031 (**26**) خلیق انجم1989ء، ص836

کی گنجائش نہ پائی، ہاپوڑ کو روانہ ہُوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دِن رہے مَیں ہاپوڑ پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دِن رہے قافلہ آیا۔ مَیں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا، دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی، شراب پی لی، کباب کھائے۔ دِن کے واسطے سادہ سالن پکوایا، ترکاری نہ ڈلوائی۔ چار بجے پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابو گڑھ کی سرائے میں آپہنچا۔ چارپائی بچھائی، اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کو تل آ گئے، دونوں لڑکے رَتھ میں سوار آتے ہیں۔[27]

بدھ کا دِن، پہر بھر دِن چڑھا ہو گا کہ مَیں فقط پالکی پر مرادآباد پہنچا۔ بیس جمادی الاوّل کی اور گیارہ اکتوبر کی ہے۔ رات بخیر گزرے، بشرطِ حیات کل رامپور پہنچ جائیں گے۔[28]

12/ اکتوبر 1865ء کو رامپور پہنچا ہوں۔ قلعے میں زیرِ سایۂ کاخِ والی شہر اُترا ہوں۔[29] دلّی سے رامپور تک ذوقِ قدم بوس میں جوانانہ گیا۔ اختلافاتِ آب و ہَوا و تفرقہ اوقاتِ غذا کو ہرگز نہ مانا اور رنجِ راہ کو ہرگز خیال میں نہ لایا۔[30]

[رامپور میں] موسم اچھا تھا، گرمی گزر گئی تھی، جاڑا ابھی چمکا نہ تھا، عالم اعتدال آب و ہَوا، سایہ و سرچشمہ جابجا۔ نواب [کلب علی خاں] صاحب بہ مقتضائے اُلولَدُ سِرٌّ لِابیہ حسن اخلاق میں نواب فردوس آرام گاہ کے برابر، بلکہ بعض شیوہ وروِش میں اُن سے بہتر ہیں۔[31]

دِن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دِن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے، اچار۔ مَیں بھی خوش، لڑکے بھی خوش۔ کلّو اچھا ہو گیا ہے؛ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہیں۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔[32]

نواب صاحب کا اخلاص و التفات روزافزوں ہے۔ دسمبر کی پہلی سے جشن شروع ہو گا، ہفتے دو ہفتے کی مدت اس کی ہے، بعد جشن کے رخصت ہوں گا۔[33]

(**27**) خلیق انجم 1989ء، ص 697 (**28**) خلیق انجم 1989ء، ص 634 (**29**) خلیق انجم 1990ء، ص 1027 (**30**) خلیق انجم 1990ء، ص 1222 (**31**) خلیق انجم 1995ء، ص 1471 (**32**) خلیق انجم 1989ء، ص 634-635 (**33**) خلیق انجم 1989ء، ص 635

قاطع برہان [کے سلسلے میں] مَیں نے تیس روپے کی ہنڈوی، سو روپے کی باقی، حکیم جی کو بھیج دی ہے۔ سب جلدوں کے شیر ازے بندھ جائیں اور موٹا کاغذ دونوں طرف لگ جائے۔ کوئی نسخہ بے جلد نہ رہے۔ تین سو مجلّد کے تیار ہونے کی خبر اور بقیہ حساب، یا روپیہ فوراً بھیج دوں گا یا آ کر دوں گا۔[34]

نامۂ غالب صاحبِ مطبع نے اپنی بِکری کے واسطے نہیں چھاپی، مَیں نے آپ تین سو جلد چھپوائی، دوستوں کو دُور ونزدیک بانٹ دی۔[35]

[**ساطع برہان**] ایک، لڑکے پڑھانے والے ملاے مکتب دار [مرزا رحیم بیگ میرٹھی] کا خبط ہے۔[36] **نامۂ غالب** کا مکتوب الیہ،[37] رحیم بیگ کا وطن اصل سر دہنہ اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلمی اُس کا پیشہ ہے، نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے۔[38] مَیں کہتا ہوں کہ واے اُس ہیچ پوچ پر، جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔[39] آٹھ دس برس سے اندھا۔[40] کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے؛ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے؛ بلکہ اُس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا ہے، اَوروں سے مدد لیتا ہے۔[41] باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اُس کی تحریر مَیں نے دیکھی، ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اُس میں بیشتر وہ باتیں ہیں، جن کو **لطائفِ غیبی** میں ردّ کر چکے [ہیں]۔[42]

[قدر بلگرامی] میرے یار، میری خدمت گزار کے حقوق ہیں [ان] پر۔ مجھ کو مدد [دیں] اور اپنی قوتِ علمی صَرف [کریں]۔ **محرقِ قاطع برہان** میرے پاس موجود ہے، مجھ سے [منگوائیں]۔ مَیں ہر موقع پر خطا اور زلتِ مؤلف [سید سعادت علی] کا اشارہ کر دوں گا۔ [قدر بلگرامی کے] پاس دو نسخے، ایک **دافع ہذیان**، ایک **سوالاتِ عبدالکریم** مع استفتا د افتاے دستخطیِ علماے دہلی موجود ہیں اور اَب اُس کتاب کے ساتھ میرے اشارات سُود مند پہنچیں گے۔ [ان] کو معارضہ بہت آسان ہو گا۔ مدعی کا کلام دراصل لغو، پھر [قدر بلگرامی کے] پاس سرمایۂ علمی موجود اور یہ تین نسخے معقول

(**34**) خلیق انجم 1989ء، ص 787-788 (**35**) خلیق انجم 1989ء، ص 565 (**36**) ایضاً (**37**) خلیق انجم 1989ء، ص 838 (**38**) خلیق انجم 1989ء، ص 566 (**39**) خلیق انجم 1989ء، ص 838 (**40**) خلیق انجم 1989ء، ص566 (**41**) خلیق انجم 1989ء، ص838 (**42**) خلیق انجم 1989ء، ص565

اس پر مزید علیہ۔ **محرق** اور صاحب **محرق** کا خاکہ اڑ جائے گا۔[میری خواہش ہے کہ وہ] اردو زبان میں رسالہ لکھنا شروع [کریں] اور بعد اختتام مجھے اطلاع [دیں]۔ پھر مَیں جیسا لکھوں، ویسا عمل میں [لائیں]۔[43]

OOO

نمائش گاہِ بریلی کی سیر کہاں اور مَیں کہاں؟ اس نمائش گاہ کی سیر سے، جس کو دُنیا کہتے ہیں، دِل بھر گیا۔ اَب عالمِ بے رنگی کا مشتاق ہوں، لا الہ الا اللّٰہ لا موجود الا اللّٰہ لا مؤثر فی الوجود الا اللّٰہ۔[44]

مَیں [نواب کلب علی کی سرکار میں] نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت! نواب صاحب ازرُوے صورت رُوح مجسم اور بہ اعتبارِ اخلاق آیتِ رحمت ہیں، خزانۂ فیض کے تحویل دار ہیں۔ جو شخص دفترِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے، اس کے پٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپے سال غلّے کا محصول معاف کر دیا، ایک اہل کار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپے نقد دیا۔ منشی نول کشور کی عرضی پیش ہوئی، خلاصہ عرضی کا سُن لیا، واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بہ تقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے، مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔[45]

یہاں [رامپور] جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغاپور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دِن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر بہادُر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اُترتے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکارِ رامپور کے مہمان، کل 5/ دسمبر حضور پُرنُور [نواب کلب علی خاں] بڑے تجمل سے آغاپور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہُوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار روپے سے کم نہ نثار ہُوا ہو گا۔ آج صاحبانِ عالی شان کی دعوت ہے۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔[46]

---

(43) خلیق انجم 1995ء، ص1426 **(44)** خلیق انجم 1995ء، ص1517 **(45)** خلیق انجم 2008ء، ص354
(46) خلیق انجم 2008ء، ص419-420

تین صاحبوں [سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، مولوی الطاف حسین حالی اور نامعلوم] نے اطراف وجوانب سے [نواب کلب علی خاں کی مدح میں] تین قصیدے میرے پاس بھیجے ہیں۔ اگر [نواب صاحب کے] حضور میں نہ گزارنوں اور اُن [شعرا] کو لکھوں کہ مَیں نے گزران دیے تو جھوٹ بولنا ہوتا ہے اور مَیں جھوٹ سے بیزار ہوں۔ گزرانتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، ادب رخصت نہیں دیتا۔ ناچار وہ تینوں قصیدے [نواب صاحب کے منشی سیل چند کے] پاس بھیجتا ہوں۔ یہی اُن صاحبوں کو لکھوں گا کہ مَیں نے میر منشی کے حوالے کر دیے ہیں۔[47]

OOO

[دہلی سے] چلتے وقت [نواب ضیاء الدین خاں] نے غلیل کی فرمائش کی تھی، رامپور پہنچ کر وہ بے سعی و تلاش ہاتھ آ گئی، بنوا رکھی۔[48] ایک غلیل حضور نے دینی کی ہے، ایک علی اصغر خاں سے اینٹھی، دونوں کل آئیں گی۔[49] لڑکوں نے، ملازموں نے، سب سے مجھ سے سن لیا کہ یہ نواب ضیاء الدین خاں کے واسطے ہیں۔ اَب چلنے سے ایک ہفتے پہلے [علائی] نے غلیل مانگی، کتنی [ہی] جستجو کی، کہیں بہم نہ پہنچی۔ دس روپے تک مول کو نہ ملی۔ نواب صاحب سے مانگی، توشہ خانے میں بھی نہ تھی۔ ایک امیر کے ہاں پتا لگا، دوڑا ہُوا گیا، چھچی موجود پائی، لیکن کیا چھچی! جیسے نجف خاں کے عہد کے تورانیوں میں ہماری تمھاری ہڈی۔ بنوانے کی فرصت کہاں! آج لی، کل چل دیا۔[50]

OOO

[روانگی کے وقت نواب کلب علی خاں نے مجھ سے کہا، 'خدا کے سپرد'۔ مَیں نے عرض کیا،] 'حضرت! خدا نے مجھے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر اُلٹا مجھے خدا کے سپرد کرتے ہیں'۔[51]

موت بس اُن کی ہے ، جو مر کے وہیں دفن ہوئے
زیست اُن کی ہے ، جو اُس کوچے سے گھائل آئے

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا ، غالب!
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے[52]

---

(47) خلیق انجم 1995ء، ص 1540 **(48)** خلیق انجم 2008ء، ص 423-424 **(49)** خلیق انجم 2008ء، ص 423 **(50)** خلیق انجم 2008ء، ص 42451 **(51)** بحوالہ حالی 1897ء، ص 42۔ حالی لکھتے ہیں کہ جب نواب ⇦

○○○

قاطعِ برہان میں اَور مطالب بڑھائے اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا ہے اور **درفشِ کاویانی** اُس کا نام رکھا اور اس کو[دسمبر 1865ء میں اکمل المطابع دلّی سے] چھپوایا۔[53]

○○○

مراد آباد پہنچنا، بعد پالکی کے اُتر آنے کے پُل کا ٹوٹ جانا۔ گاڑیِ اسباب، یہاں تک رختِ خواب کا مع آدمیوں کے اُسی زمہریر کے میدان میں رہنا، بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا۔ خیر، جو اُن پر گزری، وہ جانیں۔ مَیں مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا، بھوکا پیاسا، کمبل اوڑھ کر پڑ رہا، شعر اپنا پڑھ کر صبح کی:

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے — تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اُٹھا۔ صاحب زادہ ممتاز علی خاں بہادُر کے بھیجے ہوئے دو فرشتے آئے، اُٹھا کر سعید الدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے۔ صاحب زادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور سعید الدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ، مولوی محمد حسن خاں بہادُر صدر الصدور آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے، پانچ دِن وہاں رہا۔[54] انھوں نے بیمار داری اور غم خواری بہت کی۔[55] بھائی نواب مصطفی خاں بہادُر وہیں مجھ سے آ کر ملے۔ دوسرے دِن وہ رہ گرائے دارالسرور رامپور اور مَیں جادہ نوردِ ستم آبادِ دہلی ہُوا۔[56]

[رامپور سے] دلّی تک میر ازندہ پہنچنا محال تھا۔ جاڑا، مینہ، قبض و انقباض، فقدانِ جوع، فاقہ ہاے متواتر، منزل ہاے نامانوس، ہاپوڑ تک آفتاب کا نظر نہ آنا۔[57] غازی آباد شہر سے سات کوس ہے، شب کو وہاں مقام تھا۔ وہیں سے طبیعت اصلاح پر آنے لگی، قبض و انقباض رفع ہو گیا؛[58]

⇦ یوسُف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور مرزا تعزیت کے لیے رامپور گئے۔ چند روز بعد نواب کلب علی خاں کا نواب لفٹنٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہُوا۔ اُن کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے، چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا، خدا کے سپرد۔ مرزا نے کہا، حضرت! خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر اُلٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ حوالہ مذکور **(52)** غالب 1996ء، ص 360 **(53)** خلیق انجم 1989ء، ص 841 **(54)** خلیق انجم 1990ء، ص 1221 **(55)** خلیق انجم 2008ء، ص 355 **(56)** خلیق انجم 1990ء، ص 1221 **(57)** خلیق انجم 1990ء، ص 1222 **(58)** خلیق انجم 1989ء، ص 810

[غرض] بھیگتا بھاگتا، بھوکا، جاڑا کھاتا [8/ جنوری 1866ء کو] گیارہ بجے دِن کو اپنے گھر پہنچا۔ اقرباواحبا کو زندہ و صحیح و سالم پایا۔ اس سفر میں سراسر خستہ و رنجور رہا، اتمامِ سفر اختتامِ رنج تھا گویا۔[59] ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔[60] صبح دَم ہَوا بند ہے، دھوپ تیز ہے، پشت بآفتاب تکیے کے سہارے سے بیٹھاہوں۔[61] میر اخاص تراش آگیا، مہینا بھر سے حجامت ہیں۔[62]

 OOO

چھ پارسل چھتیس **درفش کاویانی** کے نواب میر غلام بابا خاں صاحب کی خدمت میں ارسال کیے۔[63] غرض [اس کتاب سے] شہرت ہے۔ اِس قلمرو میں مَیں نے جلدیں تقسیم کی ہیں، اُس ملک میں [وہ] بانٹ دیں۔[64]

OOO

[جولائی 1850ء میں] جب بادشاہِ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاریِ سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو مَیں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی:

دائم پڑا ہُوا ترے در پر نہیں ہوں مَیں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتّھر نہیں ہوں مَیں

غالب! وظیفہ خوار ہو ، دو شاہ کو دعا
وہ دِن گئے کہ کہتے تھے ، 'نوکر نہیں ہوں مَیں'

اب مقطع کی صورت بدل کر حضور [نواب کلب علی خاں] کی نذر کرتا ہوں:

در پر امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم
شائستہ گدائیِ ہر در نہیں ہوں مَیں

بوڑھا ہُوا ہوں ، قابلِ خدمت نہیں اسد!
خیرات خوارِ محض ہوں ، نوکر نہیں ہوں مَیں[65]

---

(59) خلیق انجم 1989ء ص 810 **(60)** خلیق انجم 1990ء ص 1222 **(61)** خلیق انجم 1989ء ص 839 **(62)** خلیق انجم 1989ء ص 668 **(63)** خلیق انجم 1989ء ص 567 **(64)** خلیق انجم 1990ء ص 1007 **(65)** خلیق انجم 1990ء ص 1226-1228

فلک نہیں چاہتا کہ میرا کلام مقبولِ طبائع اہلِ کمال ہو۔ حضرت [نواب کلب علی خاں] کو خالق اکبر نے وہ قوت اور طاقت عطا کی ہے کہ [وہ] علی الرغم فلک کام کر سکتے ہیں:

ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے — قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں

فلک نے مجھ پر بڑے بڑے الجھاؤ غم و فکر کے ڈالے، مگر میری طبیعت نہ بدل سکا؛ نہ مَیں نے بجنابِ باری بہت تضرع وزاری کی، مگر اپنی قسمت بدل نہ سکا۔[66]

OOO

اَوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔[67] جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔[68] کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بسبب کبر سن کے، خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی؛ مَیں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمتِ اصلاحِ اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوطِ شوقیہ کا جواب، جس صورت سے ہو سکے گا، لکھ دیا کروں گا۔[69] آگے ناتواں تھا، اَب نیم جاں ہوں۔ اَب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دِنوں کی ہے۔[70]

OOO

جناب کیمس صاحب بہادُر افسر مدارس غرب و شمال کا، باوجود عدمِ تعارُف، خط مجھ کو آیا۔ کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا، اس کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اردو طلب کی تھی، مجموعہ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں یہ لکھا کہ مطبع الٰہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے، بعد انطباع و حصولِ اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔[71]

OOO

سر آغازِ فصل میں ایسے ثمرہائے پیش رس کا پہنچنا نویدِ ہزار گونہ میمنت و شادمانی ہے۔ یہ ثمر رب النوع اثمار ہے۔ 8/ جون [1866ء] کو دو پہر کے وقت کہار پہنچا اور [قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کی طرف سے] آم کے دوٹو کر دے کر روانہ ہو گیا۔[72]

OOO

(**66**) خلیق انجم 1990ء، ص 1228-1229 (**67**) خلیق انجم 1990ء، ص 1032 (**68**) خلیق انجم 1995ء، ص 1529 (**69**) خلیق انجم 1990ء، ص 1032 (**70**) خلیق انجم 1990ء، ص 1032 (**71**) خلیق انجم 1989ء، ص 669 (**72**) خلیق انجم 1995ء، ص 1518

انگریزی تنخواہ گھر میں اور جو کچھ قرض کی قسط میں جاتی ہے، حضور [نواب کلب علی خاں] کے عطیے پر میرا اور شاگرد پیشے کا اور حسین علی کا گزارا ہے۔ عالم الغیب جانتا ہے، جس طرح گزرتی ہے۔ چار سو ساڑھے چار سو کا قرض باقی ہے، اَب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔[73] رامپور کے سفر میں تاب و طاقت، حسنِ فکر، لطفِ طبیعت، یہ سب اسباب لٹ گیا۔ جب تک زندہ ہوں، غمزدہ و افسردہ، ناتواں و نیم جاں ہوں۔[74] غم نے بشمول بڑھاپے کے پست و مضمحل کر دیا ہے۔ برسوں سے مکروہات میں مبتلا رہتے رہتے اَب طاقت تحمل کی نہیں رہی۔ خدا جانے، کیا ہوتا ہے، کیا سمجھتا ہوں؛ کیا کرنا چاہیے، کیا کرتا ہوں۔[75] غذا ایک قلم مفقود، آٹھ پہر میں ایک بار آبِ گوشت پی لیتا ہوں؛ نہ روٹی نہ بوٹی، نہ پلاؤ، نہ خشکا،[76] [چنانچہ] مَیں [نواب کلب علی] سے صرف راحت مانگتا ہوں اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ رہے۔[77]

○○○

برسوں سے خطوط فارسی میں لکھنے چھوڑ دیے۔ اَب شاہزادہ بشیر الدین بہادُر [متخلص بہ توفیق، متوفی 1885ء] نبیرۂ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق اُن کے حکم کے ہے اور وہ مطاع ہیں اور مَیں مطیع۔[78]

○○○

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم [نواب احمد بخش خاں] صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں [نواب امین الدین احمد خاں] کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں: اظہارِ غم، تلقین صبر، دعاے مغفرت۔ سو اظہارِ غم تکلفِ محض ہے؛ جو غم [انھیں] ہُوا ہے، ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہُوا ہو۔ تلقین صبر بے دردی ہے، یہ سانحہ عظیم ایسا ہے، جس نے غمِ رحلتِ نوابِ مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعاے مغفرت، مَیں کیا اور میری دعا کیا! مگر چونکہ وہ میری مربّیہ و محسنہ تھیں، دِل سے دعا نکلتی ہے۔[79]

○○○

---

(73) خلیق انجم 1990ء، ص 1229 (74) خلیق انجم 1989ء، ص 788 (75) خلیق انجم 1990ء، ص 1230 (76) خلیق انجم 1990ء، ص 1035 (77) خلیق انجم 1990ء، ص 1234 (78) خلیق انجم 1995ء، ص 1454-1455 (79) خلیق انجم 1989ء، ص 688

مَیں بہرا ہوں، گانا کیا سنوں گا؟ بوڑھا ہوں، ناچ کیا دیکھوں؟ غـذا چھے ماشے آٹا، کھانا کیا کھاؤں؟ بمبئی، سورت میں انگریزی شرابیں اچھی ہوتی ہیں، اگر وہاں آتا اور شریکِ محفل ہوتا تو پی لیتا۔[80] [اب تو] پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ، ان ضعفوں پر ضعفِ طالع۔ کیونکر قصدِ سفر کروں؟ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں؟ گھنٹا بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں۔ آنا میرا سورت تک، کسی صورت حیزِ امکان میں نہیں۔[81]

اس مہینے رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہتّرواں برس شروع ہُوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی، قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب، چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شرابِ خانہ ساز اور اسی قدر عرقِ شیر۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اُٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بن کر اُٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے، اُٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسبابِ حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا۔ بعد اراقہ بول بے توقف نیند آجاتی ہے۔ ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے کی آمد، تین سو کا خرچ۔ ہر مہینے میں ایک سو چالیس کا گھاٹا۔ مردن ناگوار بدیہی ہے، مرنا کیونکر گوارا ہو گا۔[82] قولنج آگے دَوری تھا، اَب دائمی ہو گیا ہے۔ مہینا بھر میں پانچ سات بار فضول مجتمعہ دفع ہو جاتے ہیں اور یہی منشاے حیات ہے۔ پھر گرمی نے مار ڈالا۔ ایک حرارتِ غریبہ جگر میں پاتا ہوں، جس کی شدت سے بُھنّا جاتا ہوں۔ اگرچہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں، مگر صبح سے سوتے وقت تک، نہیں جانتا کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں۔[83]

ایک شعر مَیں نے بہت دِنوں سے کہہ رکھا ہے، اس خیال سے کہ میرے بعد کوئی میرا دوست میرا مرثیہ لکھے اور اس شعر کو بند قرار دے کر ترکیب بند رقم کرے۔ وہ شعر یہ ہے:

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد　　　اسد اللہ خـاں غالب مرد

(**80**) خلیق انجم 1989ء، ص 568 (**81**) خلیق انجم 1990ء، ص 1008-1009 (**82**) خلیق انجم 1995ء، ص 1530 (**83**) خلیق انجم 1989ء، ص 669

دو صاحبوں کو اس کام کے واسطے اپنے ذہن میں ٹھہرایا؛ ایک تو نواب مصطفیٰ خاں، سو انھوں نے شعر کہنے سے توبہ کی؛ دوسرے نواب ضیاء الدین خاں، وہ اکثر بیمار رہتے ہیں اور شعر کم کہتے ہیں؛ پس اَب اپنے پیر و مرشد صاحبِ عالم [مارہروی] صاحب سے اس عنایت کا امیدوار ہوں کہ [وہ] یہ کاغذ اپنے پاس رہنے دیں اور وقت پر ترکیب بند لکھیں۔ اللہ، اللہ، اللہ۔[84]

OOO

نواب لفٹننٹ گورنر بہادُر پنجاب [ڈانل میکلوڈ] کا کل بارہ پر چار بجے دربار تھا۔ حکم سب درباروں کو پہنچ گیا تھا۔ مَیں نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا، دو گھنٹے میں دربار میں گیا۔ خیال یہی کہ ملاقات ہو گی، ایک رباعی کاغذِ مذہب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا، کلماتِ عنایت سن کر چلا آوں گا۔ نہ مجھے کچھ احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادُر شہر کو علم۔ بارے، بروقت ملاقاتِ تعظیم معمولی اور مصافحہ کر کے لارڈ صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ، سر پیچ میری ٹوپی پر باندھا اور فرمایا کہ 'یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا'۔ مالاے مروارید منشی نے گلے میں ڈال دی۔ یہ پارچے سات مرحمت ہوئے: دو شالہ ایک، کم خواب کا تھان ایک، بنارسی تھان سنہری بونٹے ایک، بنارسی سیلا ایک، الوان کی چادر کنارہ کلابتون ایک، کناویز کا تھان ایک، الوان کی چادر بے کنارہ ایک۔[85]

OOO

ایک دوست نے مجھے اطلاع دی کہ 'مولوی احمد علی مدرسِ مدرسۂ کلکتہ نے [**قاطع برہان** کے جواب میں 1866ء میں] ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا **مؤید البرہان** ہے۔ اس رسالے میں دفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض، جو تُو نے دکنی پر کیے ہیں اور تیری تحریر پر کچھ اعتراضات وارِد کیے ہیں اور اہلِ مدرسہ اور شعراے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں'۔[86]

میری خاطرِ ناشاد میں یہ بات آئی کہ پچاس سالہ نگارشات کے مسودوں کو فراہم کیا جائے، [باوجود] عدم استطاعت کے، ان کے مصارفِ طباعت کو برداشت کیا اور ان تحریروں نے مطبوع کی صورت پائی۔[87]

(**84**) خلیق انجم 1990ء، ص1022 (**85**) خلیق انجم 1990ء، ص1239 (**86**) خلیق انجم 1995ء، ص1530

(**87**) تنویر احمد علوی 2016ء، ص320۔ فارسی متن: پرتو روہیلہ 2015ء، ص735

حضرت [نواب کلب علی خاں] کے تصدق سے قرض ادا ہو گیا۔ تنخواہ نے قسط سے اور مَیں نے رنج سے رہائی پائی۔ آدھا قرض عطیۂ سابق میں اور آدھا قرض عطیۂ حال میں ادا ہو گیا۔ کہہ نہیں سکتا اور بن کہے بنتی نہیں، اگر [ان کی سرکار سے] دونوں لڑکوں [مرزا باقر علی خاں اور مرزا حسین علی خاں] کا پچاس روپے مہینا جنوری 1867ء سے جاری ہو جائے اور ماہ بہ ماہ فقیر کے روز ینے کے ساتھ پہنچا کرے تو [ان] کا نمک خوار پھر کبھی قرض دار نہ ہو گا۔[88]

OOO

ایامِ شباب میں کہ بحرِ طبع روانی پر تھا، جی میں آیا کہ غزواتِ صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا۔ داستان طرازی کی توفیق نہ پائی۔ ناچار، آٹھ نو سو شعر کو چھپوا لیا۔[89]

مؤید برہان میرے پاس آ گئی ہے اور مَیں اس کی خرافات [واعتراضات] کا حال بقیدِ شمار صفحہ وسطر لکھ رہا ہوں۔[90] بعد اتمامِ نگارش [محمد حبیب اللہ ذکا کے] پاس اس مراد سے بھیجوں گا کہ [وہ] ازراہِ عنایت **مؤید** کا جواب [لکھیں]۔[91]

مَیں نے **سبد چیں** کی ایک جلد مع عرضی اقبال نشاں مرزا تفضل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی، سو حضور پُرنور مہاراو راجا بہادُر [شیو دان سنگھ] کا خط انھی کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے ازراہِ بندہ پروری و قدر افزائی، القاب بہت بڑا مجھے لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت اور التفات کے بھرے ہوئے درج کیے۔[92]

OOO

حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں، سامعہ باطل بہت دِن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی مانند معدوم ہو گیا۔ اَب مہینا بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں، رسمی پُرسشِ مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے، وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔[93] امراضِ قدیم بڑھ گئے۔ برسوں کی بات نہیں رہی، ہفتوں کی یا مہینوں کی زندگی رہ گئی ہے۔[94]

---

(88) خلیق انجم 1990ء، ص 1240-1241 **(89)** خلیق انجم 1995ء، ص 1442-1443 **(90)** خلیق انجم 1995ء، ص 1534 **(91)** خلیق انجم 1995ء، ص 1535 **(92)** خلیق انجم 1989ء، ص 757-758 **(93)** خلیق انجم 1995ء، ص 1532 **(94)** خلیق انجم 1990ء، ص 1243

[نواب امین الدین احمد خاں نے ایسے] وقت میں مجھ سے غزل مانگی کہ میرے واسطے نکرین کے جواب دینے کا زمانہ قریب آگیا۔ میرا حال اَب جس کو دریافت کرنا ہو، وہ اہلِ محلہ سے دریافت کر لے۔ [ان کی] خاطر عزیز ہے، فکر کی؛ بارے، نفسِ ناطقہ نے بُری بھلی طرح مدد دی، نو شعر پہنچتے ہیں؛ لیکن نہ شاعرانہ، نہ عارفانہ:

ممکن نہیں کہ بھول کے آرمیدہ ہوں — مَیں دشتِ غم میں آہُوے صیّاد دیدہ ہوں

ہوں درد مند ، جبر ہو یا اختیار ہو — گہ نالۂ کشیدہ ، گہِ اشک چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہُوا دہن — از بس کہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نہ سُبحہ سے علاقہ ، نہ ساغر سے رابطہ — مَیں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ — نہ دانۂ فتادہ ہُوں ، نہ دامِ چیدہ ہوں

جو چاہیے، نہیں وہ مری قدر و منزلت — مَیں یوسُفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دِل میں نہیں ہے مِری جگہ — ہوں مَیں کلامِ نغز ، ولے ناشنیدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقے میں ہرچند ہوں ذلیل — پر عاصیوں کے فرقے میں مَیں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح، اسد! — ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں[95]

ساٹھ ساٹھ برس سے ہمارے [اور نواب امین الدین احمد خاں کے] بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں۔ بے اس کے کہ چاہت [ان کی] طرف سے بھی ہو، چالیس برس سے محبت کا ظہور طرفین سے ہُوا۔ مَیں [انھیں] چاہتا رہا، [وہ] مجھے چاہتے رہے۔ وہ امر عام اور یہ امر خاص کیا مقتضی اس کا نہیں کہ مجھ میں [ان] میں حقیقی بھائیوں کا سا اخلاص پیدا ہو جائے؟ وہ قرابت اور یہ موَدت کیا پیوندِ خون سے کم ہے؟ [ان کا] یہ حال سنوں اور بے تاب نہ ہو جاؤں اور وہاں نہ آؤں؛ مگر کیا کروں، مَیں ایک قالبِ بے رُوح ہوں، یکے مردہ شخص بمردی رواں۔ اضمحلال رُوح کا روزافزوں ہے۔ صبح کو تبرید، قریب دوپہر کے روٹی، شام کو شراب۔ اس میں سے جس دِن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملی، مَیں مر لیا۔ واللہ، نہیں آسکتا؛ باللہ، نہیں آسکتا۔ دِل کی جگہ میرے پہلو میں

(95) خلیق انجم 1989ء، ص689-690

پتّھر بھی تو نہیں؛ دوست نہ سہی، دشمن بھی تو نہ ہوں گا؛ محبت نہ سہی، عداوت بھی تو نہ ہو گی۔ آج [وہ] دونوں بھائی [نواب ضیاء الدین احمد خاں اور نواب امین الدین احمد خاں] اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ [نواب احمد بخش خاں] کی جگہ [ہیں]۔ مَیں 'لم یلد ولم یولد' ہوں۔ میری زوجہ [نواب احمد بخش کی بھتیجی اور نواب امین الدین احمد خاں کی چچازاد] بہن، میرے بچے [یعنی نواب الٰہی بخش خاں کے داماد نواب غلام حسین مسرور کے پوتے اور زین العابدین عارف] کے بچے۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی [یعنی مرزا یوسُف کی بیٹی، جو نواب الٰہی بخش کے پوتے اور نواب نبی بخش کے بیٹے غلام فخر الدین خاں کی اہلیہ] ہے، اس کی اَولاد بھی [ان کی] ہی اَولاد ہے۔ نہ [نواب امین الدین احمد خاں کے] واسطے، بلکہ ان بے کسوں کے واسطے [ان کا] دعا گو ہوں اور [ان کی] سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور اِن شاء اللّٰہ تعالیٰ ایسا ہی ہو گا کہ [وہ] جیتے [رہیں] اور [مَیں ان] دونوں [بھائیوں] کے سامنے مر جاؤں، تا کہ اس قافلے کو اگر روٹی نہ [دیں] گے تو چنے تو [دیں] گے اور اگر چنے بھی نہ [دیں] گے اور بات نہ [پوچھیں] گے تو میری بلا سے۔ مَیں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔[96]

○○○

پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے آئے ہوئے بکس میں دھرے ہیں۔[97] آگے مَیں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا، اَب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ دوست آشنا کوئی آ جاتا ہے تو اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔[98] جب حال یہ ہے کہ تو اشعار کی اصلاح کیونکر دوں؟ صبح کو دو آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری، اس میں ڈال دیتے ہیں، تمام دِن گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستور لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔[99] صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہنا اور پھر دَم بہ دَم پیشاب کو اُٹھنا۔[100] اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے، دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ یہ گرمی خیر سے گزر گئی تو سب غزلوں کو دیکھوں گا،[101] [ورنہ] مجھ میں اَب دَم نہیں ہے، نہ طاقت باقی ہے، نہ حواس درست ہیں۔ لکھا کچھ چاہتا ہوں، لکھ

---

(96) خلیق انجم 1989ء ص690-691 **(97)** خلیق انجم 1989ء، ص572 **(98)** خلیق انجم 1989ء، ص574
(99) خلیق انجم 1989ء، ص573 **(100)** خلیق انجم 1990ء، ص1011 **(101)** خلیق انجم 1989ء، ص573

کچھ جیتا ہوں۔ بس اَب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آج بچا، کل مرا؛ کل بچا، پرسوں مرا۔[102] اگر کچھ زندگی اَور ہے تو حق تعالیٰ تھوڑی سی صحت اور طاقت عنایت کرے۔[103] **اکمل الاخبار** اور **اشرف الاخبار** میں مَیں نے اپنا حال مفصل چھپوا دیا ہے اور اس میں مَیں نے عذر چاہا خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے۔ اُس پر کسی نے عمل نہ کیا، اَب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں۔[104] دو سطریں لکھیں، بدن تھرّایا، حرف سوجھنے سے رہا۔[105] ہجومِ غم سے فراغ نہیں، عبارت آرائی کا دِماغ نہیں۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی، امراض بھی بڑھتے گئے۔ نسیاں حد سے گزر گیا۔ میر تقی مرحوم کا مطلع وردِ زبان ہے:

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم　　　القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

خط بکس میں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں۔ مَیں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا، [مگر] اَب بقولِ خواجہ درد، 'مَیں وفا کرتا ہوں، لیکن دِل وفا کرتا نہیں'۔[106]

OOO

مصور صاحب، میرے دوست، میرے چہرے کی تصویر اتار کرلے گئے۔ اس کو تین تین مہینے ہوئے، آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ مَیں نے گوارا کیا آئینے پر نقشہ اترا وانا بھی، ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں۔ عید کے دِن وہ آئے تھے، مَیں نے اُن سے کہا کہ بھائی! میری شبیہ کھینچ دو۔ وعدہ کیا تھا کہ کل تو نہیں، پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، صفر، یہ پانچواں مہینا ہے، آج تک نہیں آئے۔[107]

تصویر کھینچنے والا ہندوستانی دوست شہر سے چلا گیا۔ ایک انگریز ہے، وہ کھینچتا ہے۔ مجھ میں اتنا دَم کہاں کہ کوٹھے پر سے اُتروں، پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹے دو گھنٹے کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں۔[108]

(**102**) خلیق انجم 1995ء، ص 1541 (**103**) خلیق انجم 1990ء، ص 1036 (**104**) خلیق انجم 1989ء، ص 574 (**105**) خلیق انجم 1995ء، ص 1442 (**106**) خلیق انجم 1990ء، ص 1023-1024 (**107**) خلیق انجم 1989ء، ص 573 (**108**) خلیق انجم 1989ء، ص 574-575

OOO

حسین علی خاں کی منگنی ہو گئی نواب احمد بخش خاں مرحوم کے حقیقی بھائی کی پوتی [حسن جہاں بیگم] سے اور [شادی کے لیے] رجب کا مہینا قرار پایا۔ اَب میرے بڑھاپے اور میری مفلسی کی شرم [نواب کلب علی خاں] کے ہاتھ ہے:

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں   مدعاے ضروریُ الاظہار
تم سلامت رہو ہزار برس   ہر برس کے دِن پچاس ہزار[109]

میرے پاس نقد، جنس، اسباب، املاک اور میرے گھر میں زیورِ زرینہ و سیمینہ کا نام و نشان نہیں؛ ہت [ہتھ] ادھار قرض کوئی دیتا نہیں۔ [نواب کلب علی] روپیہ عنایت فرمائیں، یہ کام سر انجام پائے اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جائے۔ زرِ مصرفِ شادی کی مقدار اور تنخواہ کی مقدار، جو خداوند [نواب کلب علی] کی ہمت اور اس کنگال اپاہج کی قسمت۔[110] [بڑے بیٹے] باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین کے ہاں ہوئی، انھوں نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپے دیے اور میری زوجہ نے پانسو روپے کا زیور لگا کر پچیس سو روپے صَرف کیے۔ اَب یہ کیونکر عرض کروں، یہ رسم نہیں کہ سائل مقدارِ سوال عرض کرے۔ دو اڑھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی، لیکن میرا حقِ خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں۔[111] رجب کا مہینا چلا۔ حسین علی خاں کے سسرال سے شادی کا تقاضا ہے، اِدھر سے جُز سکوت، جواب نہیں۔[112] ماہِ صیام میں سلاطین و اُمرا خیرات کرتے ہیں، اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی صیغے میں ہو جائے اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے اور شوال میں رسمِ نکاح عمل میں آئے۔[113]

OOO

سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔[114]

OOO

---

(109) خلیق انجم 1990ء، ص 1248 **(110)** خلیق انجم 1990ء، ص 1249 **(111)** خلیق انجم 1990ء، ص 1250 **(112)** خلیق انجم 1990ء ص 1252 **(113)** خلیق انجم 1990ء ص 1253 **(114)** خلیق انجم 1989ء، ص 575

اَب سوائے سفرِ آخرت، اَور کسی سفر کی نہ مجھ میں طاقت ہے، نہ جرأت:

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے　　　عزیزو! اَب اللہ ہی اللہ ہے

سچ تو یہ ہے کہ قوتِ ناطقہ پر وہ تصرف اور قلم میں وہ زور نہ رہا۔ طبیعت میں وہ مزہ، سر میں وہ سودا کہاں؟ پچاس پچپن برس کی مشق کا کچھ ملکہ باقی رہ گیا ہے، اس سبب سے فنِ کلام میں گفتگو کر لیتا ہوں۔ حوادثِ زمانہ و عوارضِ جسمانی سے نیم جاں ہوں، اس سرائے فانی میں اَور کچھ دِنوں کا مہمان ہوں۔ جب تک جیتا ہوں، نامہ و پیام سے شاد۔[115]

زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہیں۔ دُنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام جیے تو کیا! کچھ وجہِ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے، مگر مَیں بھی اسی پایے پر ہُوں، شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہِ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالمِ بے رنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں مَیں ہوں، وہاں تمام عالم، بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے، اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں، لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے؛ ہستی نہیں ہے، پندار ہے۔[116]

❍❍❍

پارسی مکتوبوں و رسالوں و نسخوں و کتابوں کے مجموعے شیرازہ بستہ و چھاپا ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرے، جاں کنی کے خیالات نے مجھ کو اُن کی تحریر و تعلق و بار سے دستبردار و آزاد و سبکدوش کر دیا۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیے، نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اُس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔[117]

❍❍❍

مشہور ہے کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دِلاتا ہے، موتےٰ کی رُوح کو اس کی بُو پہنچتی ہے۔ ایسے ہی مَیں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار تولوں پر منحصر تھی، اَب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی

(115) خلیق انجم 1989ء، ص828 **(116)** خلیق انجم 2008ء، ص357 **(117)** خلیق انجم 1989ء، ص842

توقع آگے مہینوں پر تھی، اَب دِنوں پر ہے۔[118] امراضِ جسمانی کا بیان اور ہجومِ غم ہائے نہانی کا ذکر، جیسا ابرِ سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دَل آتا ہے، بس اللہ ہی اللہ ہے۔[119]

OOO

فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے، اصلاح دینے سے توبہ کی ہے۔ شعر سننا تو ممکن ہی نہیں، بہرا ہوں۔ شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتّر برس کی عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں، ساٹھ سال بکا، نہ مدح کا صلہ ملا، نہ غزل کی داد۔[120]

OOO

[نواب کلب علی کی سرکار سے] تنخواہِ فروری 1868ء کا شکر بجالاتا ہوں۔ سبحان اللہ، کیا برکت ہے، اس سو روپے میں کہ سو آدمی روٹی کھاتے ہیں اور فقیر کے بھی سو کام نکل جاتے ہیں، [لیکن جیسا کہ] مرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی، [نواب صاحب کے] عطیہ کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج ذیقعد کی پندرہ ہے، پندرہ دِن یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذیقعد کے مہینے میں [نواب صاحب] کچھ عطا فرمائیں تو آخرِ ذی الحجہ تک نکاح ہو جائے گا۔ خدا کرے، [ان] کے ضمیر میں یہ بھی گزرے کہ غالب جب بہو بیاہ لائے گا تو اس کو روٹی کہاں سے کھلائے گا؟ [کاش!] حسین علی خاں کی [پچیس روپے] تنخواہ جاری ہو جائے۔[121]

OOO

اَب جو چار کم اسّی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا، بلکہ مہینوں کی نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے، جس کو ایک برس کہتے ہیں، اَور جیوں؛ ورنہ دو چار مہینے، پانچ سات ہفتے، دس بیس دِن کی بات رہ گئی ہے۔[122]

OOO

آج حضرت امیر المسلمین [نواب کلب علی خاں] نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رامپور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہے گا۔ مَیں ہزار بارہ سو کا قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں

(**118**) خلیق انجم 1995ء، ص 1536 (**119**) خلیق انجم 1990ء، ص 1011 (**120**) خلیق انجم 1995ء، ص 1436 (**121**) خلیق انجم 1990ء، ص 1255 (**122**) خلیق انجم 2008ء، ص 426

ادا ہو جائے؛ دوسری [خواہش] یہ کہ حسین علی خاں کی شادی [ان] کی بخششِ خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپے مہینا، جو مجھے ملتا ہے، اُس کے نام پر اس کی حینِ حیات قرار پائے۔ [کاش! نواب صاحب کی ذات سے میری] یہ دو خواہشیں، خواہ میری زندگی میں، خواہ میرے بعد اجرا پائیں۔[123]

OOO

[حکیم مودودی] نے اپنی اور نواب صاحب کی غزلوں کی اصلاح کے واسطے لکھا ہے [تو] مجھے اس حکم کی تعمیل بہ دِل منظور ہے؛ جس مہینے تک زندہ ہوں، اُس مہینے تک خدمت بجالاؤں گا۔[124]

[نواب میر ابراہیم] کے گھر مولود مسعود پیدا ہُوا۔ ایک عبارتِ رنگین مرتب کر کے **اکمل الاخبار** میں مَیں نے چھپوادی اور ایک [فارسی] رباعی اور ایک [فارسی] قطعہ بھی چھپوادیا ہے۔

OOO

برخوردار نواب مرزا داغ نے مجھ کو مبارک باد لکھی کہ 'حضور [نواب کلب علی خاں] نے تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے اور مقدارِ قرض پوچھی ہے'، سو مَیں نے اُن کو لکھ بھیجا تھا کہ آٹھ سو روپے میں میرا قرض تمام ادا ہو جائے گا۔[126] [بعد ازاں نواب صاحب کی جناب سے اپنی] اُن خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ اِن شاءاللہ، حسبِ ارشاد حضور اِسی برس 68ء میں نومبر دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا، حسین علی خاں کی شاد بھی ہو جائے گی اور اس کے واسطے اُس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جائے گی۔[127]

OOO

کئی ہفتے پہلے ایک خط لکھنؤ سے بسبیلِ ڈاک انگریزی بصیغۂ بیرنگ میرے نام آیا۔ محصول دے کر مَیں نے خط لیا اور پڑھا تو اس میں لکھا تھا، 'تُو نماز کیوں نہیں پڑھتا۔ خبر دار! نماز پڑھا کر اور نماز نہ پڑھے گا تو بعد مرنے کے بھوت بن جائے گا'۔ کل ایک اَور خط بیرنگ آیا، مضمون بعینہٖ یہی کہ 'نماز پڑھا کر، ورنہ بعد مرنے کے بھوت ہو جاؤ گے'۔ بس، اَب مَیں قہرِ درویش بر جانِ درویش پر عمل کر کے چپ ہو رہتا ہوں۔[128]

(**123**) خلیق انجم 1990ء، ص 1257 (**124**) خلیق انجم 1990ء، ص 1036 (**125**) خلیق انجم 1990ء، ص 1015 (**126**) خلیق انجم 1990ء، ص 1260 (**127**) خلیق انجم 1990ء، ص 1258 (**128**) خلیق انجم 1995ء، ص 1566، 1567

[انھی دِنوں میرے شاگرد حالی نے بھی مجھ سے یہی درخواست کی تو مَیں نے عرض کیا،]'ساری عمر فسق وفجور میں گزری؛نہ کبھی نماز پڑھی،نہ روزہ رکھا،نہ کوئی نیک کام کیا؛زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں،اَب اگر چند روز بیٹھ کر یا ایماواشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکے گی؟مَیں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں،میرے عزیز اور دوست میرا مُنھ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جاکر کتّوں اور چِیلوں اور کوّوں کے کھانے کو(اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں)چھوڑ آئیں۔اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے،لیکن اس میں شک نہیں کہ مَیں موّحد ہوں۔ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں:لا الٰہ الا اللّٰہ،لا موجود الا اللّٰہ،لا مؤثر فی الوجود الا اللّٰہ۔[129]

[اسی دَوران ڈاک کا ہرکارہ ایک خط دے گیا۔سارا خط فحش و دُشنام سے بھرا پڑا تھا،یہاں تک کہ ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی۔مَیں ہنس دیا،]اس اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔یہ قرم ساق،جو تہتّر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے،اس سے زیادہ کون بے وقوف ہو گا۔[130]

(**129**)بحوالہ حالی1897ء،ص53۔حالی کا کہنا ہے کہ جس قدر کسی سے محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا ہے،اُسی قدر اس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اس کا خاتمہ ایسی حالت پر ہو،جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لیے ناگزیر ہے۔ چونکہ مرزا کی ذات کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجۂ غایت تھا،اس لیے ہمیشہ اُن کی حالت پر افسوس ہوتا تھا؛گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضواں میں ہمارا اُن کا ساتھ چھوٹ جائے گا اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ ایک روز مرزا کی بزرگی،اُستادی اور کبر سنی کے ادب اور تعظیم کو بالاے طاق رکھ کر خشک مغز واعظوں کی طرح اُن کو نصیحت کرنی شروع کی۔چونکہ اُن کا ثقلِ سماعت انتہا کے درجے کو پہنچ گیا تھا اور اُن سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعے سے کی جاتی تھی،نمازِ پنجگانہ کی فرضیّت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لیکچر لکھ کر اُن کے سامنے رکھ دیا،جس میں اُن سے درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے،غرض جس طرح ہو سکے،نمازِ پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمّم ہی سہی،مگر نماز ترک نہ ہو۔مرزا کو یہ تحریر سخت ناگوار گزری اور ناگوار گزرنے کی بات ہی تھی،خصوصاً اِس وجہ سے کہ اُنھی دِنوں میں لوگ گمنام خطوں میں اُن کے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے اور بازاریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں لکھتے تھے۔حوالۂ مذکور،ص 52-53

(**130**)بحوالہ حالی1897ء،ص54۔حالی کا بیان ہے کہ مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے،چٹھی رساں ⇦

خدا حضرت [نواب کلب علی خاں] کو سلامت رکھے، مجھ سے اپاہج نکمّے کو بے عوضِ خدمت [ماہ بہ ماہ ایک سو روپے] تنخواہ دیتے ہیں۔[131] [اس کے باوجود] حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اَب یہ نوبت پہنچی کہ اَب کی تنخواہ [ایک سو روپے] میں سے چوّن روپے بچے۔ ترسیٹھ روپے کا چھٹا ماہوار کا سُود، سہ ماہہ دینا۔ مجملاً آٹھ سو روپے ہوں تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار، حسین علی کی شادی اور اس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی۔ اَب اس باب میں [نواب صاحب کی خدمت میں] کبھی نہ کہوں گا۔ شادی کیسی! [اب تو] میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے۔[132] [اگرچہ نواب صاحب کی سرکار سے] تنخواہِ دسمبر 1868ء پہنچی، [لیکن] قرض خواہوں نے بہت عاجز کر رکھا ہے۔[133]

OOO

اعضا فرسودہ اور بودے ہو گئے۔ رُوح اُن میں دَوڑتی نہیں پھرتی، مگر ابھی مفارقت نہیں کر گئی۔ خدا جانے، کس مکمن میں ہے؟ اعضا نکمّے ہو گئے۔ اَب وہ کام، جو اُن سے متعلق تھے، بند ہو گئے۔[134]

OOO

[علائی] میرا حال پوچھتے [ہیں]، ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا [ہو گا]۔[135]

❑❑❑

⇦ نے ایک لفافہ آ کر دیا۔ لفافہ کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیّت سے اُن کو یقین ہو گیا کہ یہ کسی مخالف کا ویسا ہی گمنام خط ہے، جیسے پہلے آ چکے ہیں۔ لفافہ مجھ کو دیا کہ اس کو کھول کر پڑھو۔ مَیں جو دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش و دُشنام سے بھرا ہُوا تھا۔ پوچھا، کس کا خط ہے اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اُس کے اظہار میں تامّل ہُوا، فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگردِ معنوی کا لکھا ہُوا ہے۔ پھر اوّل سے آخر تک خود پڑھا۔ حوالہ مذکور، ص53-54 (**131**) خلیق انجم 1990ء، ص1259 (**132**) خلیق انجم 1990ء، ص1259-1260 (**133**) خلیق انجم 1990ء، ص1260-1261 (**134**) خلیق انجم 1989ء، ص754 (**135**) بحوالہ حالی 1897ء، ص99۔ حالی لکھتے ہیں کہ مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے لیے چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا، پھر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہُوا، اُس سے شاید ایک دِن پہلے مَیں اُن کی عیادت کو گیا تھا۔ اُس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہُوا تھا اور نواب علاء الدین احمد خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ اُنھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اُس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر، جو غالباً سعدی کا تھا، لکھوایا تھا۔ شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا، دوسرا مصرع یہ تھا: نکرد ہجر مدارا ایمن سر تو سلامت۔ (حوالۂ مذکورہ، ص99-100)

فرہنگ

آب گزاری: شراب نوشی

آفرینش: تخلیق، آغاز

ابرام: طے کرنا، زور دینا

ابری: کتاب کی جلد پر چسپاں کیا جانے والا رنگین کاغذ

احتراز: پرہیز، اجتناب

احتراق: حدت، گرمی

اِراقہ بول: پیشاب کا جاری ہونا

ارتجالاً: فی البدیہ، بغیر کسی تیاری کے

ارزِش: قیمت، معاوضہ

اَرک: قلعہ

اساوری: ایک ریشمی کپڑا، جس کی بناوٹ میں سنہری یا روپہلی تار کا چار خانہ شامل ہوتا ہے

استماع: سننا

استمراری: مستقل، دوامی

اصحاب الیمین: دائیں جانب والے لوگ

افتادگی: تھکاوٹ

افشردہ: رَس

اَقویا: مضبوط

الوان: پوستین، پشمینہ

امراضِ دموی: وہ امراض، جو خون کی زیادتی سے پیدا ہوتے ہیں

اورام: ورم کی جمع،

اوبھ: اکتا جانا، بے زار ہونا، جی اُچاٹ ہونا

اوجاع: تکالیف

بثور: پھنسی کا دانہ

بحت: جس میں کسی اَور چیز کی آمیزش نہ ہو

بداہتہً: فوری

بدایت: شروع، آغاز

برودت: خنکی، ٹھنڈک

بِساطی: گھریلو استعمال کی اشیا بیچنے والا

بہنگی: بانس کی موٹی لکڑی، جس کے دونوں طرف رسی سے تھیلے یا ٹوکریاں باندھ کر بوجھ اٹھاتے ہیں

بھوگ: ایک راگنی، بے عزتی

بے آرزم: بے حیا

بیرنگ: bearing، بغیر ٹکٹ لگائے بھیجا جانے والا خط، محصول طلب خط

بیمِ ہلاک: موت کا خدشہ

پاڑ: لکڑیوں کا تختہ، لکڑیوں کی بیٹھک، جو معمار کام کرنے کے لیے باندھتے ہیں

پٹّو: اصلی اُون کے رنگ کا دبیز اونی کپڑا

پرگنہ: متعدد گاؤں پر مشتمل انتظامی حلقہ

پلاس: کمبل

تاحینِ حیات: زندگی بھر

تاہل: عیال داری

تبرید: وہ ٹھنڈی دوائیں، جو جلاب کے بعد جسم کو تقویت پہنچانے کے لیے دی جاتی ہیں

تخرجہ: مادۂ تاریخ نکالنا

تضرع: گریہ وزاری

تفحص: دریافتِ حال، غور و فکر

تَفَقُّد: پُرسشِ احوال، مجازاً مہربانی و دِلجوئی

تلافیِ مافات: ماضی کی تلافی، ہو چکی غلطی کی تلافی

تنعم: ناز و نعمت، خوشحالی

تنقیہ: پاک صاف کرنا، کھوٹ اور آلائش دُور کرنا

تودیع: رخصت کرنا، وِداع کرنا

توسن: گھوڑا

توشک: بستر کی چادر کے نیچے بچھانے والا پتلا گدّا

توقیع: مہر شدہ شاہی فرمان

تہدید: تنبیہ، فہمائش، دھمکی

جُرعہ: گھونٹ

جڑاول: سردیوں کے کپڑے، لحاف وغیرہ

جوزا: ایرانی شمسی سال کا تیسرا مہینا

جوع: بھوک، اشتہا

جیغہ: دستار کے اوپر ٹانکی جانے والی جڑاؤ پٹی، کلغی

حارّہ: گرم

حُقنہ: enema

حیز: احاطہ، حد؛ امکان کے ساتھ ترکیب بناتے ہیں، حیزِ امکان

خانہ داماد: گھر داماد

خرگاہ: بڑا خیمہ

خسوف: جب سورج اور چاند کے درمیان زمین آجاتی ہے

خوانِ یغما: مالِ غنیمت

درنگ: تاخیر

دریبہ: پنواڑی، یہاں دہلی کا دریبہ بازار مراد ہے

دریوزہ گری: بھیک مانگنا، گداگری

دَمدَمہ: خاک یا ریت بھرے تھیلوں کی دیواروں سے بناہُوا مورچہ

دواعی: منشاء، مقصد، خواہش

ذوذنابہ: دُم دار ستارہ

رُعاف: نکسیر

رعایتِ مرعی: خاص رعایت

رم خوردہ: بھاگا ہوا، وحشت زدہ

ریزشِ آبرو: آبرو کا خاتمہ

زرینہ وسیمینہ: سونا چاندی

زمہریر: جہنم کا وہ طبقہ، جہاں سردی سے عذاب دیا جائے گا۔ مراد سخت سردی

زُہرہ: ایک سیارہ، اس ستارے کو حُسن کی دیوی اور مطربہ ور قاصۂ فلک سے بھی تعبیر کیا گیا ہے

سبھی: سسرالی

سرپیچ: دستار میں ٹانکا جانے والے زیور

سرزمینِ موعُود: وہ سرزمین، (دفن کے لیے) جس کا وعدہ کیا گیا ہو

سقر مقر: دوزخ مسکن

سوداویّت: وہ سیاہی مائل مادہ، جو پِتّے میں جمع ہوتا ہے اور اس کی زیادتی سے ذہنی ہیجان پیدا کرتی ہے

سہام: تپش

سیلا: چھوٹے عرض کی ریشمی چادر یا بڑا رومال، جو کمر پر باندھا یا سر پر لپیٹا جائے۔

شاہترہ: ایک قسم کا ساگ

شطرنجی: زمین پر بچھانے کے لیے ایک قسم کا دبیز سوتی کپڑا

صبیہ: کم سن لڑکی

صداع: سر درد

صلابت: سختی

طعم: ذائقہ

عشوہ طنّاز: شوخیِ ادا

عصارۂ ریوند: ایک پودے ریوند کا نچوڑا ہوا عرق یا تیل

غوامض: مشکل سے سمجھ میں آنے والا، عسیر الفہم

فرحت فرجام: فرحت پہنچانے والا

فرطِ بردوت: خنکی کی زیادتی، بڑھی ہوئی ٹھنڈک

فرقدان: دو رَوشن ستارے، جو دُبِ اصغر میں واقع ہیں

فصد کھلوانا: رَگ سے خون نکلوانا

فہوالمراد: یہی مقصود ہے

فینس: اصل لفظ پینس ہے، پالکی

قران السعدین: دو اچھے ستاروں کا ایک برج میں اکٹھا ہو جانا

قرن: دَور، عہد، عموماً تیس سال سے ایک صدی تک کا وقت

قولنج: پیٹ کا شدید درد

کسوف: جب زمین اور سورج کے درمیان چاند آ جاتا ہے

کُفُو: ہم نسب، ہم قبیلہ، ہم رُتبہ

کلابتون: سنہری / روپہلی بٹا ہُوا تار، جو چوب کاری میں ڈنڈیاں بنانے اور ستارے جمانے کے کام آتا ہے

کُلبۂ تاریک: درد و غم کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا گھر

کناویز: ایک قسم کا ریشمی کپڑا

کُنجڑا: سبزی فروش

کوار: ہندوستانی تقویم کا ساتواں مہینا، کاتک

کھپچی: بانس کا چیرا ہوا ٹکڑا، بانس کی پتلی قمچی

کھپریل: ٹھیکروں کو الٹا کر کے بنائی ہوئی چھتیں

گدائے مبرم: نہ ٹلنے والا بھکاری

گراب: توپ کا گولا، جس میں بہت سی گولیاں بھری ہوتی ہیں

گیاہ: گھاس

لاجَرَم: بے شک، بلاشبہ، یقیناً

لاولد: بے اَولاد

مبدأ فیض: نہایت فیض رَساں، یعنی ذاتِ الٰہی

متصدی: کاتب

متُعذِر: دُشوار، مشکل

متفرع: نئی شاخ کا ظاہر ہونا، اضافہ ہونا

متوحش: وحشت زدہ، حیران

مجرائی: منہائی، کٹوتی

مجہول الاحوال: جس کے احوال معلوم نہ ہوں

مجموع: م ح ج م و ع۔ عربی لفظ بمعنی کُل

محسوب: حساب میں شامل کر لیا جانا

مُخرِّب: خراب کرنے والا، بگاڑنے والا

مخنوق: جس کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو

مذہّب: سونا چڑھی ہوئی چیز

مراجعت: واپسی

مُرافعہ: اپیل، فیصلے کے خلاف بڑی عدالت سے رجوع کرنا

مُرزبان: رئیس، جاگیر دار

مروارید: موتی، گوہر

مسموع: سنا گیا

مسہل: دست آور دوا، جلاب

مَشعَر: اطلاع دینے والا

مصححہ: تصحیح شدہ، نظر ثانی شدہ، مدوّنہ

مصحح: حروف خواں، نظر ثانی کرنے والا

مطرود: دھتکارا ہُوا

معاودت: واپسی

معمولی: حسبِ معمول

معوج الذہن: کم فہم

مغشوش: بے ترتیب، نا قابلِ فہم

مقسوم: قسمت، مقدر

مکمن: گھات

مکنونِ ضمیر: دل کی بات

ممر: گزر گاہ، طور طریقہ، مجازاً سبب

مُنضج: جلاب سے پہلے پلائی جانے والی دوا

مُنغّض: مکدّر، ناخوش

مہاوٹ: سردیوں کی بارش

مہر گیا: ایک بوٹی، جس کی جڑ دو آپس میں لپٹے ہوئے آدمیوں کی سی ہوتی ہے۔

مہورت: کسی کام کے لیے ستاروں کی چال کا اندازہ

موتیٰ: میت کی رُوح

نالش: استغاثہ، فریاد

نژاد: نسل، جیسے تُرک نژاد

نظارت: نگرانی، معائنہ

نیائش: گریہ وزاری

نِیب: نیم کا درخت

نَیچہ بند: حُقّے کی نَے وغیرہ بنانے والا

وَجع: ٹیس، درد

وردی: مجازاً روایت، رواج

ہاویہ زاویہ: دوزخ کے سب سے نیچے ٹھکانا

ہدر اور ہجل: جائز، مباح

❑❑❑

کتابیات

- باری علیگ (2001ء)، **کمپنی کی تاریخ**، لاہور: طیب پبلشرز
- بدر شکیب (1952ء)، **اردو صحافت**، کراچی: کاروانِ ادب
- پرتوروہیلہ (2015ء)، **کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالب**، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن
- تنویر احمد علوی، ڈاکٹر (2016ء)، **غالب کے فارسی خطوط**، جہلم: بک کارنر
- تنویر احمد علوی، ڈاکٹر (2006ء)، **غالب کی سوانح عمری**، نئی دہلی: غالب اکیڈمی
- حالی، خواجہ الطاف حسین (1897ء)، **یادگارِ غالب**، کانپور: نامی پریس
- حفیظ عباسی (1968ء)، **کہانی میری زبانی میری**، دہلی: مجلس اشاعتِ ادب
- خلیق انجم، ڈاکٹر (2005ء)، **غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ**، نئی دہلی: غالب انسٹیٹیوٹ
- خلیق انجم، ڈاکٹر (2008ء)، **غالب کے خطوط** (جلد اوّل)، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان
- خلیق انجم، ڈاکٹر (1989ء)، **غالب کے خطوط** (جلد دوم)، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان
- خلیق انجم، ڈاکٹر (1990ء)، **غالب کے خطوط** (جلد سوم)، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان
- خلیق انجم، ڈاکٹر (1995ء)، **غالب کے خطوط** (چہارم)، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان
- خلیق انجم، ڈاکٹر (2000ء)، **غالب کے خطوط** (جلد پنجم)، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان
- شانتی رنجن بھٹاچاریہ (1976ء)، **بنگال میں اردو زبان و ادب**، لکھنؤ: نصرت پبلشرز
- شاہد ماہلی (2010ء)، **غالب اور کلکتہ**، نئی دہلی: غالب انسٹیٹیوٹ
- شکیل پتافی، ڈاکٹر (2014ء)، **پاکستان میں غالب شناسی**، لاہور: بیکن بکس
- غالب، مرزا (1969ء)، **دستنبو**، نئی دہلی: صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی

- غالب، مرزا(2000ء)، **دستنبو** مترجمہ خواجہ احمد فاروقی، نئی دہلی: ترقیِ اردو بیورو
- غالب، مرزا(1862ء)، **دیوانِ غالب**، کانپور: مطبع نظامی
- غالب، مرزا(1996)، **دیوانِ غالب کامل**، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان
- غالب، مرزا(1938ء)، **سبد چین**، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ
- غالب، مرزا(1967ء)، **کلیاتِ غالب فارسی** (جلد اوّل)، لاہور: مجلس ترقیِ ادب
- غالب، مرزا(1967ء)، **کلیاتِ غالب فارسی** (جلد دوم)، لاہور: مجلس ترقیِ ادب
- غالب، مرزا(1967ء)، **کلیاتِ غالب فارسی** (جلد سوم)، لاہور: مجلس ترقیِ ادب
- غالب، مرزا(1969ءب)، **مہر نیم روز** مترجمہ پروفیسر سید عبدالرشید فاضل، کراچی: انجمن ترقی اردو
- غلام رسول مہر(1946ء)، **غالب**، لاہور: شیخ مبارک علی
- غلام رسول مہر(2015ء)، **غالبیاتِ مہر** مرتبہ محمد عالم مختارِ حق، لاہور: مجلس ترقی ادب
- قاسم علی(2011ء)، **تاریخ اودھ** مترجمہ شیخ عبدالسلام، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
- کاظم علی خاں(1999ء)، **توقیتِ غالب**، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند
- گوہر نوشاہی، ڈاکٹر(1997ء)، **غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور**، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان
- مالک رام(1975ء)، **ذکرِ غالب**، دہلی: مکتبہ جامعہ ملیہ لمیٹڈ، پنجم
- محمد اکرام، شیخ(1936ء)، **حیاتِ غالب**، لاہور: فیروز سنز
- محمد عتیق صدیقی(1957ء)، **ہندوستانی اخبار نویسی**: علی گڑھ: انجمن ترقی اردو
- محمد یار گوندل، ڈاکٹر(2015ء)، **غالب پر سوانحی ادب**، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
- نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر(2006ء)، **غالب کی آپ بیتی**، دہلی: غالب اکیڈمی

تصانیف و تالیفات

تحقیق و تنقید:

- **میر سے فیض تک** (1999ء)، لاہور: تخلیقات
  میر سے فیض تک (2003ء)، دہلی: دارالاشاعت مصطفائی
  میر سے فیض تک **جہانِ تلمیحات** (2016ء)، لاہور: نشریات
- **اختر حسین رائے پوری: حیات و خدمات** (2009ء)، لاہور: مجلس ترقی ادب
- **شبلی شکنی کی روایت** اور دوسرے مضامین (2017ء)، لاہور: نشریات
- **عہدِ حاضر کا فکری بحران اور اقبال** (2018ء)، لاہور: نشریات
- **ارمغانِ علمی کی روایت** اور دوسرے مضامین (متوقع 2020ء)

تحقیق و ترتیب:

- **شبلی کی آپ بیتی** (2014ء)، لاہور: نشریات
  شبلی کی آپ بیتی (2014ء)، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
  شبلی کی آپ بیتی (2017ء)، دہلی: اریب پبلی کیشنز
- **آپ بیتی علامہ اقبال** (2015ء)، لاہور: نشریات
  آپ بیتی علامہ اقبال (2015ء)، کلکتہ: مغربی بنگال اردو اکیڈمی
  آپ بیتی علامہ اقبال (2018ء)، دہلی: فرید بک ڈپو
  آپ بیتی علامہ اقبال (2018ء)، لاہور: نشریات
- **آپ بیتی مرزا غالب** (2019ء)، لاہور: نشریات

ترجمہ:

- **ایسے ہوتے ہیں وہ نامے**(2004ء)،لاہور:ہم سفر
- **حضورؐ بحیثیت سپہ سالار**(2006ء)،لاہور:بیت الحکمت
  حضورؐ بحیثیت سپہ سالار(2008ء)،لاہور:بیت الحکمت
  حضورؐ بحیثیت سپہ سالار(2013ء)،دہلی:اریب پبلی کیشنز
- **مہاکوی علامہ اقبال کی اردو کویتا سے چناو**،ہندی(2008ء)،لاہور:اقبال اکادمی پاکستان
  महा कवि अललामा इक़बाल की उर्दू कविता से चनाव
- **مہاکوی علامہ اقبال کی اردو کویتا سے چناو**،اردوہندی(2008ء)،لاہور:اقبال اکادمی پاکستان
  महा कवि अललामा इक़बाल की उर्दू कविता से चनाव
- **اردو ترجمہ مکاتیبِ شبلی**(2015ء)،اعظم گڑھ:دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
- **اردو ترجمہ مکاتیبِ اقبال** مع حواشی و تعلیقات(زیرِ طبع)

ترتیب:

- **انتخابِ ولی دکنی**(2002ء)،لاہور:تخلیقات
- **جھوٹا سب سنسار**،کلام مظفر حسین شمیم(2005ء)،لاہور:بیت الحکمت
- **شگفتہ افسانے**(2006ء)،لاہور:بیت الحکمت
- **مکاتیبِ ڈاکٹر ابنِ فرید**(2010ء)،لاہور:ادبیات
- **رقعاتِ مشفق خواجہ**(2012ء)،لاہور:القمر انٹرپرائزز
- **اقبالیاتی مکاتیب**(2012ء)،راولپنڈی:الفتح پبلی کیشنز
- **ارمغانِ رفیع الدین ہاشمی**(2013ء)،راولپنڈی:الفتح پبلی کیشنز
- **نگارشاتِ مظفر حسین شمیم**(2014ء)،کراچی:ادارہ یادگارِ غالب

حرفِ آخر

ڈاکٹر خالد ندیم جب نوجوان تھے (کیونکہ جوان تو اب بھی ہیں) تو یہ عاجز ان کا شمار اردو کے ان نوجوان محققین میں کیا کرتا تھا، جن سے بڑی امیدیں تھیں۔ راقم نے ڈاکٹر صاحب موصوف کا ذکر اپنی ایک دو تحریروں میں ان نوجوان محققین کے باب میں بھی کیا تھا، جو اردو تحقیق کے ابھرتے ہوئے ستارے تھے۔ ان میں سے کچھ ستارے ابھرتے ابھرتے کہیں افق کی پنہائیوں میں گم ہو گئے یا کم از کم اب ہمیں جھلملاتے ہوئے نظر نہیں آتے، کچھ ستارے کسی کے گھر آنگن میں اجالا کرنے لگے، کچھ چمک چمک کر تھک گئے یا دنیاوی ترقی کی منازل تیزی سے طے کرنے کے بعد انھوں نے تحقیقی کاموں کو تہہ کر کے ادب سے طاق پر رکھ دیا اور کمپیوٹر پر (اور اب گشتی فون پر بھی) پری وشانِ ہوش رُبا کے جنتِ نگاہ نظاروں سے دیدہ و دل روشن کرتے ہیں (اگرچہ اس سے قلب و رُوح تاریک ہو جاتے ہیں)، لیکن ہمارے خالد ندیم صاحب قبیلۂ تحقیق کے ان جوانوں میں شامل ہیں، جو اپنی ضوفشانیوں سے علم کی راہوں کو روشن کرتے رہے اور بقولِ اقبال چونکہ ان کا شباب بے داغ ہے اور ضربِ کاری رکھتے ہیں، چنانچہ قبیلے کی آنکھ کا تارا ہیں۔ بلاشبہ وہ مستقبل میں اردو تحقیق کے اس قافلے کا ایک سالار بننے کی صلاحیتوں سے مالامال ہیں، جو دھیرے دھیرے بہت طویل فاصلہ طے کر آیا ہے۔ اس کی وجہ ان کی مسلسل لگن اور نامساعد علمی حالات میں بھی باریک بینی اور جاں فشانی سے کھوج پرکھ میں مصروف رہنا ہے۔ کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی جس پھول کا رس چُراتی ہے، بارآور بھی اسی کو کرتی ہے۔ جو لوگ اپنی راتیں کتابوں کو دیتے ہیں، صبح دم گجر بھی انھی کے نام کا بجتا ہے اور ان کے کاموں پر استادی کا نشان بھی کسی اَور ہی طرح سے ثبت ہوتا ہے۔ اب، جب کہ اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے، ایسے ستاروں کی روشنی کی ضرورت کہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

خالد ندیم کے علمی کاموں کو دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ کارِ استاد رانشاں دِگر است۔ ان کے یادگار اور باقی رہ جانے والے کاموں میں اب ان کی تازہ کتاب **آپ بیتی مرزا غالب** بھی شامل ہو گئی ہے۔ نہایت ذمے داری سے عرض کرتا ہوں کہ مستند ترین مآخذ کی مدد سے مرتب کی گئی یہ غالب کی مستند ترین سوانح ہے:

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ڈاکٹر رؤف پاریکھ